اُردو نثر کا آغاز اور ارتقاء

(۱۹ ویں صدی کے اوائل تک)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ام-اے، پی ایچ ڈی (عثمانیہ)

ریڈر اردو، جامعہ عثمانیہ

Hanif Razvi

اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء

(۱۹ ویں صدی کے اوائل تک)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ام۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (عثمانیہ)

ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ

Hanif Razvi

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

پہلا ایڈیشن | قیمت
پانچ سو | پانچ روپیے

ناشر

مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد

مطبوعہ

سیاست پریس نظام شاہی روڈ
حیدرآباد (اے پی)

Hanif Razvi

فہرست ابواب

دیباچہ

پہلا باب
کلمۂ آغاز

دوسرا باب
نثر پاروں کا آغاز

تیسرا باب
مربوط نثر کی شروعات

چوتھا باب
خواجہ بندہ نواز اور ان کے معاصرین

پانچواں باب
شاہ میراں جی کی نثری تصانیف

چھٹا باب
شاہ برہان اور شاہ امین کے نثری کارنامے

Hanif Razvi

ساتواں باب

شاہ برہان اور شاہ امین کے خلفا و تلامذہ

آٹھواں باب

قدیم نثر کا شاہکار "سب رس"

نواں باب

قدیم زبانوں کے ترجمے

دسواں باب

دہلی کے شعرا اور اردو نثر

گیارھواں باب

نثر کی توسیع

کتابیات

Hanif Razvi

دیباچہ

فورٹ ولیم کالج کا قیام اُردو نثر کے ارتقا کی تاریخ میں ایک عہد آفریں واقعہ کی حیثیت سے تقریباً سارے محققین کے پاس مسلم سا ہو گیا ہے۔ اُردو ادب کی جتنی تاریخیں اب تک لکھی گئی ہیں تقریباً ان سب میں فورٹ ولیم کالج سے پہلے کے نثری کارناموں کا تذکرہ بہت ہی مختصر سا ہے چنانچہ: اُردوئے قدیم: میں حکیم شمس اللہ قادری نے ایسی گیارہ کتابوں کے نام گنائے ہیں۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ ادب اُردو میں ایسے (۹) نثری کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ تیسری اہم تاریخ ڈاکٹر اعجاز حسین کی: مختصر تاریخ ادب اُردو: ہے۔ اس میں ایسے کارناموں کی تعداد (۸) ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن نے بھی ایک مختصر تاریخ ادب اُردو شایع کی ہے جس میں فورٹ ولیم سے پہلے کے صرف (۱۵) نثری کارناموں کا حال درج ہے۔

مذکورہ بالا عام تواریخ ادب کے علاوہ کچھ اہم تاریخیں خاص نثر کی بھی شایع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے پروفیسر احسن مارہروی مرحوم کی تاریخ نثر اُردو میں فورٹ ولیم سے پہلے کی (۱۰) نثری کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرحوم پروفیسر احسن مارہروی کی دسترس میں اس سے زیادہ مواد نہیں آسکا تاہم جو مواد انھیں دستیاب ہوا اس کے پیش کرنے کا طریقہ ان کا اپنا ہے انھوں نے ان کارناموں کو زمانی ترتیب میں جوڑا ہے لیکن جدولوں کی صورت میں اور تنقید و تفحص کا زیادہ خیال نہیں رکھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی: اُردو کے اسالیب بیان، گو اُردو نثر کی تاریخ نہیں بلکہ ابتدا سے لیکر کتاب کی تالیف کے زمانے تک اُردو میں مختلف اسالیب کا جو نشو و نما ہوا اس کا کسی حد تک تنقیدی جائزہ ہے۔ تاہم اسالیب کا تعلق نثر سے تھا اس لیئے اس کتاب میں بھی فورٹ ولیم کالج سے پہلے کے (۵) نثری کارناموں کا حال ملتا ہے۔

Hanif Razvi

پروفیسر حامد حسن قادری کی "داستان تاریخ اردو" غالباً اردو نثر کی تاریخ پر سب سے زیادہ حاوی کتاب ہے۔ گو یہ قابلِ قدر تصنیف حالیہ دور کے نثری کارناموں تک نہیں پہنچتی۔ پھر بھی فورٹ ولیم سے پہلے کے کارناموں میں سے اس کتاب میں تقریباً (۲۵) کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد کے نثری کارناموں پر مشتمل ادب کی وسعت اور اس کے تنوع کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی کتابوں کی تعداد "قدرِ قلیل" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس لیے تعجب کی بات نہیں اگر اردو کے بعض محققین اور نقادوں نے اردو نثر کی حقیقی تاریخ فورٹ ولیم کالج کے بعد ہی سمجھی ہو۔

فورٹ ولیم کالج سے پہلے کے نثری کارناموں کے حالات کی بھی کمیابی تھی جس کے باعث اس مقالے کے نگران پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے میرے مقالے کے لیے "اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے پہلے" کا عنوان تجویز فرمایا۔ کام کا خاکہ بھی تیار ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود ابتداء میں کئی مہینوں تک کوئی ایسے نثری آثار نہ مل سکے جس سے ہمت افزائی ہو سکتی۔ مقالے کے موضوع سے متعلق مواد بہت منتشر اور ہندوستان کے طول و عرض کے مختلف کتب خانوں میں زیادہ تر مخطوطات کی صورت میں محفوظ تھا جن میں سے چند کتب خانوں سے میں نے خود مواد لیا۔ کتب خانہ رامپور، کتب خانہ انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، کتب خانہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے مواد پروفیسر سروری کی بیاض سے ملا۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ذاتی کتب خانہ سے بھی بہت کچھ قابلِ قدر مواد دستیاب ہوا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ جناب حکیم شمس اللہ قادری مرحوم، جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی، پروفیسر حامد حسن قادری وغیرہ نے بھی اپنے مشوروں سے میری بڑی مدد فرمائی جس کا شکریہ میں کماحقہٗ ادا نہیں کر سکتی۔

میری انتہائی کوششوں کے باوجود کچھ رسالے ایسے بھی رہ گئے ہیں جن کے مصنفین کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ کچھ ہمارے مصنفین کے گمنام رہنے کا جذبہ ہے اور کچھ عام قارئین کے نظم کی دلکشیوں میں بھول کر نثری کارناموں کو حالاتِ زمانہ پر چھوڑ دینے کی ذہنیت کا بھی اثر ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر اردو کی نشو و نما کے ابتدائی ادوار میں مذہب نثری کارناموں کا سہارا نہ بنتا

Hanif Raza

تھا تنے کارنامے بھی جن کا جائزہ اگلے اوراق میں لیا جا سکا ہمارے لیے محفوظ نہ رہ جاتے ۔ نظم کے کارنامے نثری کارناموں کے مقابلے میں زیادہ جتن سے رکھے ہوئے ملے ۔ تذکرہ نگاروں نے بھی شاعروں کے نام اور ان کے حالات ادھورے ہی سہی کچھ تو سپردِ قلم کیے ۔ نثر کے کارناموں کے اکثر مصنفین کا حال قوم کے "گمنام سپاہیوں" کا سا ہے ۔

ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے نگران پروفیسر عبدالقادر سروری کی اس گراں قدر امداد کا شکریہ نہ ادا کروں جو مجھے اس مقالے کی تدوین کے سلسلے میں ملی ۔

میں مندرجہ ذیل اصحاب کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے مفید مشوروں اور کتابوں کی فراہمی سے میری مدد فرمائی ۔

۱۔ جناب مولوی ڈاکٹر عبدالحق

۲۔ جناب حکیم شمس اللہ قادری مرحوم

۳۔ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۴۔ جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی

۵۔ جناب ڈاکٹر عبداللہ صاحب صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی

۶۔ جناب عندلیب شادانی صدر شعبۂ اردو فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی

۷۔ جناب نجیب اشرف ندوی پروفیسر جوگیشوری کالج بمبئی

۸۔ جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی ریڈر دہلی یونیورسٹی

۹۔ جناب حامد حسن صاحب قادری سابق پروفیسر اردو سینٹ جانسن کالج آگرہ

۱۰۔ جناب آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج

۱۱۔ جناب گیان چند جین لکچرار اردو حمیدیہ کالج بھوپال

۱۲۔ جناب غلام السیدین شریک معتمد تعلیمات حکومت ہند

۱۳۔ جناب نواب عنایت جنگ بہادر

۱۴۔ جناب حسن نظامی صاحب سجادہ درگاہ نظام الدین اولیاءؒ

Hanif Razvi

۱۵- کتب خانہ دار آزاد لائبریری حیدر آباد ہاؤس

۱۶- جناب مصطفےٰ الحسینی صاحب سجادہ درگاہ ہاشم حسینی العلوی بیجاپور

۱۷- جناب امین الدین صاحب سجادہ درگاہ شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپور

۱۸- جناب نذر علی صاحب دؔرد کاکوروی

۱۹- جناب خلیق احمد صاحب نظامی

۲۰- جناب سیّد محمد صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ

۲۱- جناب مولوی محمد صدیق صاحب مددگار ناظم اطلاعات

۲۲- جناب عبدالرشید صاحب کتب خانہ دار روضتین گلبرگہ شریف

۲۳- جناب عباس علی صاحب مہتمم کتب خانہ سالار جنگ

۲۴- جناب راحت اللہ خان صاحب مہتمم کتب خانہ آصفیہ

۲۵- جناب محمد غوث صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ شعبہ مخطوطات

۲۶- جناب عزیز الدین صاحب بانگی کسٹوڈین گول گنبد بیجاپور

۲۷- جناب محمد حسن ہنڈی کار بیجاپور

۲۸- جناب عزیزی سکندر توفیق (ام-اے، عثمانیہ) لکچرار انگریزی کابل یونیورسٹی

رفیعہ سلطانہ

"رفعت کدہ"

برکت پورہ - حیدر آباد (اے - پی)

Hanif Razvi

فہرست مشمولات

دیباچہ

پہلا باب: کلمۂ آغاز

تاریخی پس منظر۔ جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش اور اردو ہندوستان کی لسانی تاریخ میں گیارھویں اور بارھویں صدی کا انقلاب۔ عرب اور ایرانی سیاحوں کے بیانات۔ نئی مخلوط زبان کی نمو۔ مسعود سعد سلمان کا اردو دیوان۔ مسعود کے زمانے کے لگ بھگ ماقبل اردو کے نمونے۔ "چوراسی ویشنوؤں کی وارتا" "سدھ ہیم چندر انوشاسن"۔ "کمار پال پرتی بودھ"۔ پربندھ چنتامنی۔ ہمیر راسو۔ پرتھی راج راسو۔ عہد غزنوی میں ہندوستانی زبان کا استعمال۔ دیوان مسعود سعد سلمان۔ نئی بولی کی لسانی خصوصیات کا اندازہ لگانے کے ماخذ ۱۔ فارسی شعرا کا کلام ۲۔ لغات ۳۔ سفر نامے۔

دوسرا باب: نثر پاروں کا آغاز

زبان کی نشو نما کا دوسرا مرحلہ۔ نثر پارے (جملے)۔ نثر پاروں کی اہمیت۔ بزرگوں کے مقولے۔ معین الدین اجمیری۔ قطب الدین بختیار کاکی۔ فرید الدین گنجشکر۔ نظام الدین محبوب الٰہی۔ نصیر الدین چراغ دہلوی۔ بو علی قلندر پانی پتی۔ شرف الدین یحییٰ منیری۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی۔ زین الدین خلد آبادی۔ مخدوم جہانیان جہاں گشت۔ قطب عالم۔ شاہ عالم۔ اس زبان کی ہر دلعزیزی کا ایک اور ثبوت۔ قدیم دور کے ایک بزرگ سید محمد اجہری کی رائے۔ منقول از: لمناقب محمدی؛ سوانح سید محمد اجہری۔

Hanif Razvi

تیسرا باب : مربوط نثر کی شروعات

زبان کے ارتقا میں تاریخی جبریت۔ اُردو نثر کی ابتدا کے متعلق مختلف آرا۔ آزاد کی رائے۔ محمد یحییٰ تنہا کی رائے (فضلی کی "کربل کتھا")۔ ڈاکٹر عبدالحق اور احسن مارہروی کے نظریے (بندہ نواز کی : معراج العاشقین :)۔ حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر زور کی رائے (گنج العلم کے رسالے)۔ حامد حسن قادری کی تحقیق۔ رسالہ تصوف مصنفہ اشرف جہانگیر سمنانی۔ اُردو نثر کا آغاز جدید مواد کی روشنی میں۔ "رسالہ جنونیہ" : جنونیہ : اور : ہفت اسرار : : رسالہ تصوف : مصنفہ راجو قتال۔ راجو قتال اول۔ راجو قتال ثانی۔ راجو قتال اول کی دیگر تصنیفات۔ : سہاگن نامہ : اور دیوان راجو قتال کی تصنیف کے متعلق مزید شہادتیں۔

چوتھا باب : خواجہ بندہ نواز اور ان کے معاصرین کے نثری کارنامے

دور تغلق میں ثقافتی ترقی۔ بہمنیوں کا عروج۔ خواجہ صاحب کی دکن میں آمد۔ حالات زندگی۔ خواجہ صاحب کی عظمت کے معترف ان کے معاصرین۔ تصانیف۔ تصانیف کی تعداد میں اختلاف، ایک متنازع فیہ مسئلہ۔ خواجہ صاحب نے اُردو میں تصنیف و تالیف کی یا نہیں۔ اُردو تصانیف کے بارے میں شواہد۔ اردو تصانیف۔ اُردو تصانیف کی نوعیت۔ معاصر تصانیف اور متاخر تصانیف۔ : معراج العاشقین :۔ : سہ بارہ :۔ : ہدایت نامہ :۔ : ہشت مسائل : ہفت اسرار :۔ : خلاصۃ التوحید :۔ : تشکار نامہ :۔ : تمثیل نامہ :۔ : دُرالاسرار :۔ : تلاوت المعراج :۔ : تلاوت الوجود :۔ : وصیت الہادی :۔ : رسالہ وجودیہ : تصانیف کے نمونے اور ان پر تبصرہ۔ خواجہ صاحب کا اسلوب و زبان۔ معاصرین۔ اکبر حسینی۔ عبداللہ حسینی۔ شاہ داول۔ سید محمد جونپوری۔ بہاءالدین باجن۔ کمال الدین سامانہ۔ شاہ قلندر۔ بدرالدین محمد مصنف : آداب الفضلا :۔ قوام فاروقی مصنف : شرف نامہ :۔

Hanif Razvi

پانچواں باب: شاہ میراں جی کی نثری تصانیف

میراں جی کا عہد۔ سلاطین بیجاپور کی علم دوستی۔ میراں جی کی عظمت۔ حالاتِ زندگی۔ سنہ وفات و پیدائش اور جائے پیدائش کے بارے میں اختلافات۔ تصانیف (نظم)، گنج عرفان: شہادت التحقیق: خوش نامہ، خوش نغز۔ تصانیف (نثر)، گلباس:۔ جل ترنگ:۔ شرح مرغوب القلوب: سب رس: کا اصل نام: تاج الحقایق:۔ تاج الحقایق: کے مصنف وجیہہ الدین علوی۔ وجیہہ الدین علوی کے حالات زندگی۔ تصانیف۔ دیگر معاصرین۔ میراں جی کے فن کی خصوصیات۔

چھٹا باب: شاہ برہان اور شاہ امین کے نثری کارنامے

نویں صدی میں اُردو نظم و نثر کی تصانیف کی کثرت۔ سلاطین بیجاپور کی سرپرستی۔ شاہ برہان کی پیدائش و وفات۔ منظوم تصانیف۔ ارشاد نامہ۔ منفعت الایمان۔ سک سہیلا۔ حجۃ البقاء۔ تقسیم الکلام۔ رموز الواصلین۔ بشارت الذکر۔ وصیت الہادی۔ نکتہ واحد۔ پنج گنج۔ کفر نامہ۔ نثری تصانیف۔ حکمۃ الحقایق۔ مقصود ابتدائی۔ ذکر جلی۔ کلمۃ الاسرار۔ معرفت القلوب۔ ہشت مسایل۔ رسالہ تصوف۔ تصانیف نثر پر تبصرہ۔ شاہ برہان کے طرز بیان کی خصوصیات۔ شاہ امین کے حالات زندگی۔ منظوم تصانیف۔ رموز السالکین۔ محبت نامہ۔ مفتاح التوحید۔ قربیہ۔ وجودیہ۔ مدح شاہ برہان۔ کشف انوار۔ رسالہ نظم و نثر۔ رسالہ منظوم۔ کری نامہ۔ نثری تصانیف گنج مخفی۔ گفتار شاہ امین۔ رسالہ نظم و نثر۔ عشق نامہ۔ شرح کلمہ طیب۔ ذکر نامہ۔ ارشاد نامہ۔ وجودیہ۔

ساتواں باب: شاہ برہان اور شاہ امین کے خلفا اور تلامذہ

نثر کی ترقی۔ مذہبی تحریروں کی طرف رجحان۔ اس دور کے مشہور مصنفین۔ مولانا عبداللہ مصنف: احکام الصلوٰۃ: میراں جی خدانما۔: شرح تمہید:۔: رسالہ وجودیہ:۔: چکی نامہ:

Hanif Razvi

: شرح تمہید کے مختلف ترجمے۔ شاہ میراں جی حسینی :۔ خلاصۃ الرویا :۔ میراں یعقوب :۔ شمایل الاتقیا :۔ شاہ برہان الدین قادری راز الٰہی :۔ وجودیہ :۔ شاہ نور محمد قادری : رسالہ نور دریا :۔ نوبطون : عابد شاہ :۔ گلزار السالکین :۔ کنز المومنین :۔ عبد الصمد :۔ تفسیر وہابی :۔ محمد شریف :۔ گنج مخفی :۔ حبیب اللہ قادری : تحفۃ المرسلہ :۔ ولی اللہ قادری : معرفت السلوک :۔ شاہ میر : اسرار توحید :۔ انتباہ الطالبین :۔ نوبطون :۔ رسایل قادریہ :۔ عوارف المعارف : اور چند اور کارنامے جن کے مصنفین کا پتہ نہ چل سکا۔ مذہبی نثر پر تبصرہ۔

آٹھواں باب :۔ قدیم نثر کا شاہکار (سب رس)

ادب کے ارتقا کے لیے سازگار فضا۔ نثری قصص کی ابتداء۔ پہلا نثری قصہ : سب رس : وجہی کے حالات زندگی۔ تصانیف :۔ قطب مشتری : اور اس کا ادبی پایہ :۔ سب رس : ایک ادبی کارنامہ۔ زمانہ :۔ سب رس : نام کے مضمرات :۔ سب رس : کے ماخذ اور مماثلات۔ مقامات تصوف تمثیلوں سے مقابلہ :۔ سب رس : عشق حقیقی کی نقش :۔ سب رس : عشق مجازی کی تمثیل۔ کردار حسن دل۔ معاشرت پر تنقید۔ اسلوب۔ مقفی مسجع طرز۔ عربی، فارسی الفاظ کہاوتوں کا استعمال۔ ادبی خوبیاں۔

نواں باب : قدیم زبانوں کے ترجمے

مشرق میں قصہ گوئی قصوں کی ماخذ سنسکرت زبان : طوطی نامہ : (شکا شپ تتی) : طوطی نامہ : کے فارسی خلاصے۔ نخشبی ابو الفضل علامی۔ سید محمد قادری مختلف اردو ترجمے۔ طوطی نامہ ابو الفضل کے مترجم کے بارے میں غلط فہمیاں۔ ابن نشاطی کا ترجمہ۔ ملا سید محمد قادری کا طوطی نامہ۔ عبارت کے نمونے۔ طوطی نامہ اور اسکی تکنک :۔ سنگھاسن بتیسی :۔ ملکہ زمان و کام کندلا :۔ کام روپ کام لتا :۔ قصہ جنگ امیر حمزہ : طلسم ہوشربا :۔ گل ہرمز انار رانی :۔ نو طرز مرصع :۔ نو طرز مرصع کا اسلوب :۔ بہار دانش اور مفرح القلوب :۔ دلبر و مہر افروز :۔ چار چمن :۔ گلستان :

دسواں باب: دہلی کے شعرا اور اردو نثر

مغلوں کا دکن پر تسلط ۔ ریختہ کا رواج ۔ میر جعفر زٹلی کا نثری کارنامہ ۔ محمد حسین کلیم ۔ فضلی کی دہ مجلس ؛ دہ مجلس کے نسخے ۔ سراج الدین علی خان آرزو کی تصانیف ۔ عبدالولی عزلت ۔ مرزا رفیع سودا ۔ تعیلی ۔ سعادت یار خان رنگین ۔ انشاء اللہ خان انشا ۔ مرزا جان طپش ۔ اس دور کی نثر پر تبصرہ ۔

گیارھواں باب: نثر کی توسیع

بارھویں صدی میں نثر کی وسعت ۔ مذہبی کتابوں کی نوعیت ۔ (۱) تراجم قرآن شاہ رفیع الدین کا ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن ۔ (۲) فقہ: سراج الایمان: تقسیم میراث ۔ احوال میت ۔ ترجمہ کیدانی (۳) حدیث ۔ انوار محمدی ۔ ترجمہ زواجر مجموعہ المسایل ۔ تصوف ۔ مجمع العطایا ۔ کتابوں کی جنگ ۔ رسالہ بدرالدجیٰ ۔ قواعد زبان کے سلسلے میں یورپین مصنفین کے کارنامے ۔ یورپ اور ہند کے تعلقات ۔ پہلا یورپی مصنف جان جوشوا کیٹلر ۔ چیمبرلین ۔ ڈیوڈ مل ۔ شلز ۔ جوہان فریڈرش فرٹز کیسانویل گٹی ۔ فرگوسن ایوارس ایبل ۔ ہندوستانی حروف تہجی مصنف نامعلوم ۔ لے بے ڈف ۔ ہیڈلے ۔ جان کرسٹوف ریڈی لنگ ۔ رسالہ قواعد ہندی مصنف ۔ ریختہ ہندی کی صرف و نحو ۔ انشا کا آغاز ۔ انشا کی تعریف ۔ انشا کے بارے میں سلمان ندوی، گارسان دی تاسی کی آرا ۔ دستور النثر : ۔ : دستور الہدایت : ۔ : دان انشا : ۔

تاریخ : ۔ ترجمہ تاریخ فیروز شاہی ۔ تاریخ ہندوستان ۔ بہادر نامہ ۔ سیر ۔ اس دور کی مشہور ہستی باقر آگاہ ۔ حالات زندگی ۔ تصانیف ۔ منظوم تصانیف کے نثری دیباچے ۔ دیباچہ مراۃ الجنان ۔ دیباچہ دیوان ۔ دیباچہ ہشت بہشت ۔ دیباچہ فرائد در فوائد ۔ دیباچہ گلزار عشق ۔ دیباچہ تحفہ احباب ۔ آگاہ کی مکمل تصنیف نثر ۔ ریاض السیر ۔ بدرالدولہ کی تصنیف نثر الجواہر ۔ بدرالدولہ کے حالات زندگی ۔ تصانیف قصص ملکہ روم وقہقہیہ ۔ قصہ دلالہ مختالہ ۔ اس دور کا خاتمہ ۔

۱

کلمۂ آغاز

تاریخی پس منظر۔ جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش اور اُردو۔ ہندُستان کی لسانی تاریخ میں گیارھویں اور بارھویں صدی کا انقلاب۔ عرب اور ایرانی سیاحوں کے بیانات۔ نئی مخلوط زبان کی نیو۔ مسعود سعد سلمان کا اُردو دیوان۔ مسعود کے زمانے کے لگ بھگ ماقبل اُردو کے نمونے۔ : چوراسی دیشنوؤں کی وارتا : : سدھ ہیم چندر انوشاسن :۔ : کمار پال پرتی بودھ :۔ : پربندھ چنتامنی :۔ : ہمیر راسو :۔ : پرتھی راج راسو :۔ عہد غزنوی میں ہندوستانی زبان کا استعمال۔ دیوان مسعود سعد سلمان۔ نئی بولی کی لسانی خصوصیات : نئی بولی کی حالت کا کچھ اندازہ لگانے کے تین ماخذ۔ فارسی شعرا کا کلام۔ لغات۔ سفرنامے۔ منفرد اجزائے کلام کے ابتدائی آثار۔ : پرتھی راج راسو : کے پرستاد کے خاتمے کی نثری عبارتیں۔

Hanif Razvi

کلمۂ آغاز

زبانیں اپنے ارتقاء کے ابتدائی مرحلے میں عموماً اپنے ہی لسانی ذخیرے اور فکری سرمایہ سے کام لے کر اپنی تعمیر کے مراحل میں قدم آگے بڑھاتی ہیں۔ لیکن بعض زبانوں کی صورت میں ایسا بھی پیش آیا ہے کہ ایسے مرحلے میں انھیں نہ صرف اپنے ہی لسانی اور قومی فکری سرمایے سے مدد ملی، بلکہ اپنے اطراف کی کچھ ترقی یافتہ زبانوں اور اپنے ہی قومی فکری سرمایے کے علاوہ دوسری قوموں کے فکری سرمایہ سے بھی کافی امداد حاصل ہوئی۔ زبانوں کے اس دوسرے گروہ میں اُردو بھی شامل ہے۔ اُردو کو اپنے نشو و نما کے ابتدائی مرحلوں میں ایک طرف تو ہندوستانِ قدیم اور قرونِ وسطیٰ کے ادبی سرمایے سے مدد ملی تو دوسری طرف وہ فارسی ادب کے نمونوں سے بھی فائدہ اٹھا سکی۔

جدید ہند آریائی کے آغاز کا زمانہ، ہند آریائی ماہرینِ لسانیات نے ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ مقرر کیا ہے۔ اور اس کے قریب کے زمانے میں اُردو کا بھی آغاز تصور کیا جاتا ہے۔

یہ زمانہ دراصل ہندوستان کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش ہی کا زمانہ ہے، بلکہ اس زمانے میں ہندوستان کی سیاست، معاشرت، معیشت، سب ہی میں ایک نیا اور دور رس انقلاب آیا۔ بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ انقلاب جو ۱۰۰۰ء میں آیا اس کے لیے دو تین سو سال پیشتر (سنہ ۶۸۲ء اور سنہ ۷۱۲ء) ہی سے یعنی مسلمانوں کے پہلے حملۂ سندھ سنہ ۱۵ ہجری ہی سے راہیں ہموار ہو رہی تھیں۔ سنہ ۱۵ ہجری (۶۸۲ء) میں عثمان بن عاص کی سرکردگی میں عربوں کا ہندوستان پر پہلا حملہ ہوا اور اسلامی جہاز تھانہ (بمبئی کے قریب ایک مقام) پر لنگر انداز ہوئے۔ اس کے بعد دیبل (دیول) پر حملہ ہوا۔ لیکن یہ حملے

سیاسی اعتبار سے ناکام رہے۔ اس حملے کے نتیجہ کے طور پر سماجی حیثیت سے کئی اہم تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔

بالآخر سنہ ۷۱۲ء (سنہ ۹۹ھ) میں محمد بن قاسم نے یادگار حملہ کیا جس نے سندھ میں مسلمانوں کی چھوٹی سی نوآبادی قائم کردی۔ اس کے بعد سے مسلمانوں کے اثر سے ہندوستانی زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ اسلامی عقائد اور طرزِ فکر کی تبلیغ اس وقت سے شروع ہوئی۔ (اگر انگریز مورخ) لین پول کی روایت کے مطابق ہر سال (۵۰) ہزار اہلِ ہند اسلام قبول کرتے تھے۔[۱]

ان نومسلموں اور بیرونی مسلمانوں کی آپس کی بول چال کا ذریعہ عربی فارسی آمیز مقامی زبان ہوا کرتی ہوگی جس کو انھوں نے ایک عام نام "ہندی" یعنی اہلِ ہند کی زبان سے موسوم کیا تھا۔ نووارد مسلمان بھی جن کی مادری زبان عربی یا فارسی تھی، جب اہلِ ہند سے معاملہ کرتے تو ان ہی کی زبان اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ اس کا ثبوت اس زمانے کے بعض عرب اور ایرانی سیّاحوں کے بیانات سے ملتا ہے۔ جو سنہ ۱۰۰ھ سے لیکر سنہ ۴۰۰ھ تک ہندوستان آئے۔ ان میں شہریار بن بزرگ۔ ابن حوقل بشاری۔ اصطخری اور مورخ مسعودی قابلِ ذکر ہیں۔

شہریار بن بزرگ سنہ ۱۰۱۳ء (۳۰۰ھ) میں ہندوستان آیا تھا۔ وہ اپنی تصنیف "عجائب الہند" میں لکھتا ہے:

"ایک عرب نے الورا کے راجہ مہارک (؟) کی شان میں ہندی میں قصیدہ لکھا تھا اس سے راجہ اتنا خوش ہوا کہ اسے دربار میں طلب کر کے انعام و اکرام دیا نیز یہ کہ بادشاہ کی فرمائش پر اس نے قرآن کا ترجمہ بھی ہندی میں کیا۔"[۲]

۱۔ لین پول "میڈیول انڈیا"۔ مقدمہ صفحہ (۴۱)

۲۔ عجائب الہند" مطبوعہ لیڈن صفحہ (۳)

Hanif Raza

ابن حوقل جس نے ۳۵۰ھ میں سندھ اور ملتان کا سفر کیا تھا لکھتا ہے :

"منصورہ ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے" [۱]

اس کی تائید اصطخری کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے" [۲]

یہ عربی آمیز سندھی وہی زبان تھی جس کے متعلق مسعودی نے ۳۰۴ھ میں اپنی مشہور کتاب مروج الذہب میں لکھا ہے :-

"فهذا جمل من اخبار ملوک السند والهند ولغة السند خلاف لغة الهند." [۳]

یعنی "یہ جملے سندھ اور ہند کی تاریخ کے متعلق ہیں اور سندھ کی زبان بقیہ ہند کی زبان سے مختلف ہے"

بشاری اپنی کتاب "احسن التقاسیم" میں لکھتا ہے :

"عرب، سندھ میں ہندوؤں سے ملے ہوئے تھے اور انھوں نے ہندوستانی رسم و رواج اختیار کر لیا تھا۔ ہندوستانی عورتوں سے شادی بیاہ کرتے تھے نیز انھیں اہلِ ہند کی زبانوں سے بھی دلچسپی تھی۔ اس لیے انھوں نے ہندوستانی نام و خطاب قبول کیے" [۴]

ان بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستانی رسم و رواج اور زبان سے متاثر ہو رہے تھے اور ایک مخلوط زبان کی نیو پڑ رہی تھی۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ

---

[۱] سفرنامہ ابن حوقل طبع لیڈن صفحہ ۲۳۲

[۲] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۶۔ سفرنامہ اصطخری صفحہ ۱۷۷۔ طبع لیڈن

[۳] "مروج الذہب" باب (۱۶) صفحہ (۳۸۱) طبع لیڈن

[۴] احسن التقاسیم صفحہ ۱۹۲ طبع لیڈن

اس نئی بولی کی مزید نشو و نما، عہدِ غزنوی میں محمود کے حملے کے بعد سے ہونے لگی تھی۔ یوں تو محمود کے باپ سبکتگین نے ۳۶۶ھ ہی میں وادیٔ عمان میں دو لڑائیاں لڑیں اور وادی نیلاب تک کا کچھ علاقہ فتح کرلیا تھا لیکن ہندوستان کی اصلی فتوحات محمود سے شروع ہوئیں اس نے ہندوستان پر (۱۷) حملے کیے۔ مشرق میں کالنجر اور مغرب میں سومنات یعنی گجرات تک بڑھا چلا گیا۔ پھر ۴۰۹ھ میں قنوج اور متھرا کو فتح کرلیا۔ تواریخ میں مذکور ہے کہ جس وقت محمود کو تھانسر کی تسخیر کا خیال ہوا تو اس نے لاہور کے راجہ انندپال سے صلح کرلی۔ معاہدہ کے بموجب راجہ نے محمود کے لشکر کو بہت سی آسانیاں بہم پہونچائیں۔ اس کے عوض محمود نے بھی اس علاقے کو نقصان نہیں پہونچایا۔ راجہ نے اپنے بھائی کے ہمراہ ۵۰۰ چاکر (غلام) اور ۳۰۰ تاجر روانہ کیے تھے جو اسلامی لشکر کی ضروریات کو پورا کرتے تھے ان سوداگروں اور اسلامی لشکریوں کے تبادلہ خیال کا ذریعہ یہی نوخیز زبان تھی۔ محمود کا انتقال ۴۱۸ھ میں ہوا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی البیرونی کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

"محمود ہندوستانیوں سے ان کی زبان کے ذریعے قریب ہونا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے نقردی سکّے درہم پر ہجری سنہ میں ایسی عبارت کندہ کرائی تھی جو مخلوط تھی۔ سنسکرت لفظوں کے ساتھ عربی فارسی الفاظ بھی تھے۔ الفاظ یہ ہیں:

" ایا کتم ایکم محمد اوتار نرپتی محمود ایام ٹنکو محمود
پور گھٹے ہٹو جنیا نا سمپت " [۱]

جس کے معنی ہیں "ناقابلِ تعریف ایک ذات ہے۔ محمدؐ اس کے اوتار رسول ہیں۔ محمود اس کے بندوں کا رکھوالا راجہ ہے۔ یہ سکہ محمود پور میں سنہ ہجرت نبوی "
یہ بھی مشہور ہے کہ کالنجر کے راجہ نے زبان "ہندی" میں سلطان کی مدح لکھ کر بھیجی تھی

---

[۱] "انڈو آرین اینڈ ہندی" صفحہ ۱۶۹

سلطان نے اپنے دربار کے شعرا کو یہ شعر سنائے۔ ان کی تعریف پر سلطان نے کالنجر کے راجہ کو پندرہ تعلقوں کی حکومت کا پٹہ لکھ کر دے دیا۔ [1]

اس واقعہ کا ذکر فرشتہ اپنی تاریخ میں اس طرح کرتا ہے:

"انندا بہ زبانِ ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد سلطان آن را بہ فضلائے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ، ہمگی تحسین و آفرین کردند" [2]

گو محمود کی وفات کے بعد اس کی اولاد کے قبضے سے بہت سا مفتوحہ علاقہ نکل گیا۔ تاہم غزنہ اور پنجاب پر ان کا تسلط عرصہ دراز تک رہا۔ شہاب الدین محمد غوری کے محمود کی اولاد کو غزنہ سے بے دخل کر دینے کے بعد جب سلطان مسعود اور ابراہیم نے پنجاب میں پناہ لی تو لاہور گویا چھوٹا سا غزنہ بن گیا۔ جس میں کئی شعراء، علماء اور ادیب، ایران سے آ کر بس گئے تھے۔ ان شعراء میں عنصری۔ فرخی۔ اسدی وغیرہ مشہور ہیں۔ مسلسل روایتوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ محمود کے جانشین مسعود کے درباری شاعر مسعود سعد سلمان نے تو ایک ہندی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ [3]

---

[1] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۵۸ "ورنشین انڈر مغل" صفحہ ۱۲

[2] "تاریخ فرشتہ" مطبع نول کشور جلد اول صفحہ ۳۱

[3] مسعود سعد سلمان (۵۱۵ ہجری تا ۵۲۵ ہجری) کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے ہندی میں اپنی یادگار ایک دیوان چھوڑا۔ دراصل اس کے آبا و اجداد ایران کے تھے۔ لیکن وہ خود لاہور میں پیدا ہوا۔ گو عوفی نے اپنے تذکرے "لباب الالباب" میں اسے بھی ایرانی نژاد بتایا ہے۔ لیکن خود اس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا مولد ہندوستان تھا۔ ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے اس زبان میں شاعری کی ہو گی۔ چنانچہ محمد عوفی اپنے تذکرے لباب الالباب میں لکھتا ہے:

"او را سہ دیوان است یکے بہ تازی و یکے بہ پارسی و یکے بہ ہندوی" اس قول کی مزید تقویت امیر خسرو کے بیان سے ہوتی ہے جو وہ اپنی مثنوی غرۃ الکمال کے دیباچے میں کہتے ہیں:

"پیش ازیں از شاہانِ سخن کسے را سہ دیوان نہ بود مگر مرا کہ خسرو ملک کلام مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آن سہ دیوان در عبارت عربی، فارسی و ہندی است و در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نہ کردہ بجز من" — دیباچہ غرۃ الکمال صفحہ (۶۶)۔

Hanif Raza

اس دیوان کی روایت کو جو مختلف ذریعوں سے برابر چلی آرہی ہے، تسلیم کر لیا جائے تو گیارھویں صدی عیسوی میں یعنی پانچویں صدی ہجری میں اُردو کا آغاز نزاعی بات نہیں رہتی۔

یہ صحیح ہے کہ مسعود سعد سلمان کا دیوان اب ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ اس لیے اس دیوان کی زبان کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ہندی کے چند علما کی تحقیقات سے اس زمانے کے لگ بھگ کی زبان کے کچھ نمونے اس وقت فراہم ہو گئے ہیں۔

"ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا اتہاس" کے مصنف رام چندر شکل نے تو "چوراسی ویشنوں کی وارتا" کو کھڑی بولی کی پہلی تصنیف مانا ہے۔ یہ جوگیوں اور سِدھوں کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو آٹھویں صدی عیسوی کے قریب کی تصنیف ہے۔ لیکن ایک دوسرے محقق شیام سندر داس نے اس خیال کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ شیام سندر داس کے خیال کے مطابق گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی سے کھڑی بولی کا آغاز ہوتا ہے۔ "چوراسی ویشنووں کی وارتا" کے جو نمونے رام چندر شکل نے اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں ان میں چند لفظ ایسے ملتے ہیں، جو آگے چل کر اُردو کا ہیولیٰ ثابت ہوتے۔ مثلاً "سرہ" ویشنو کا ایک دوہا ہے:

"گھور اندھارے چندمنی جمی اجو کرئی
پرم مہا سو دیکھ کے درئی اپنش ہری"[1]

گھور۔ اندھارا۔ چَندَ (قدیم اُردو) دیکھ وغیرہ وہ لفظ ہیں جو اُردو کے ارتقا تک اسی حالت میں باقی رہے۔

مشہور جینی عالم ہیم چندر نے "سدھ ہیم چندر انو شاسن" میں ایک خاص اپ بھرنش کے جو نمونے دیئے ہیں ان کو ڈاکٹر چیٹرجی نے کھڑی بولی کا ابتدائی روپ مانا ہے۔ چند نمونے حسب ذیل ہیں:-[2]

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتی ہاس از: رام چندر شکل صفحہ (۱۱)۔ [2] ہیم چندر (۱۰۸۸ء۔ ۱۱۷۰ء) گجرات کے سولنکی راجہ جے سنگھ اور انکے پوتے کماپال کے دربار سے وابستہ تھے۔ وہ اپنے عہد کے مشہور عالم آچاریہ تھے جنکی دو کتابوں کا پتہ چلتا ہے ان میں سے ایک "شدھ ہیم چندر انو شاسن" جس میں اپ بھرنش پراکرت اور سنسکرت گرامر کے اصول لکھے ہیں۔ دوسری "کماپال چرت" جو پراکرت نظم میں ہے۔

Hanif Razvi

(۱) "بھلا ہوا جو مارِیا بھینی ہمارا کنتو ؎

لجّے جتو تو دیم بیا سے ہو جی بھگّا گھر وائے نتو"

یعنی "اے بہن بھلا ہوا جو میرا شوہر مارا گیا، مجھے لجا آتی اگر وہ گھر بھاگ آتا"

(۲) "جیو کسو نہ بھی دھن پنو کا سو نہ اِٹھو

دونی دی ادسری نی وادی تن سواں گنائی وِٹھو"

"جیو" (زندگی، جیون)، کس کو بھلی نہیں معلوم ہوتی، دھن کس کا من نہیں چاہتا؟

دونوں ہی ادسر (وقت، موقع) مل جائیں تب وِشِشٹھ (شریف آدمی) ان دونوں کو تنکا سا گنتے ہیں؛

(۳) جئی نا سواوے دوئی گھرو کا اہو مون تجھو

ونو جو کھنڈے تو ہیسے سو ہو ہوئے نہ تجھو

"اے قاصد اگر وہ گھر آئے تو تجھے اور مجھے کیوں منہ لٹکانا چاہیئے (اداس ہونا چاہیئے) مگر وہ تلوار توڑ دے سو میرا پیھیو (پیا) نہیں ہو سکتا۔

(۴) لمھے عقو ریو ریو ہو دا کا دا ایوا

مدھی - نہالی - گن آلو - کئی جانا جو نہا کرانتی

دیے بودھی کی عورت بے عقل، (کیا تو نہیں دیکھتی) (آسمان پیا (کتنے آدمی) ذکر آتے ہیں درشنی)

"پُت جائے کون گنو اوگن کون موے نا

جا باپ کی بھومی دی کپ جائے اورنے"

یعنی اگر بیٹا جنا تو کونسا گن (اچھائی ہے اور موئے نا (مرنے میں تو) کون اوگن (برائی) جب باپ کی زمین (وطن) کانپ رہی ہے اوروں کے قدموں تلے۔

اس طرح کی ایک اور کتاب "سوم پر بھسوری" کی کمارپال پرتی بودھ" ہے۔ اس کی زبان کے بارے میں سارے علما کا خیال یہ ہے کہ یہ ایک طرح کی مخلوط بولی میں لکھی گئی ہے۔

؎ انڈو آرین اور ہندی صفحہ ۱۶۵

جس کا نشو و نما بعد کو کھڑی بولی کی صورت میں ہوا۔ اس کا ایک نمونہ درج ذیل ہے :

گنگا جل پکھالیا دیچ بستی کیے ہوئے پوتر ؎۱

گنگا جل میں دھوئی ہو کیا کیسے پاک ہو سکتی ہے۔

پکھالنا سے پکھال اب بھی پانی سے دھونے اور پانی کے پیمانے کے معنی میں اردو میں رائج ہے۔ "پربند چنتامنی" نامی ایک اور کتاب سنہ ۱۱۷۰ء کے لگ بھگ کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف میرو تنگ۔ ہیم چندر ہی کے زمانے کے ایک عالم تھے۔ انھوں نے "پربند چنتامنی" میں راجاؤں کے قصے لکھے ہیں ؎۲

راجہ منج اور مرنال وتی کے بیان میں منج سے منسوب ایک دوھا نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے :

" جا متی پچھی سنپجے ساتی پہلی ہوئی ؎۳

" منج" بھنتی منالیوئی دکھن نہ بیڑھی کوئی "

جا (جو) مت (عقل) پچھو (پیچھے) کے معنوں میں اب بھی مستعمل ہے۔ سنپڑنا (پکڑنا) دکھنی میں پکڑنے اور حاصل ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "پہلی" کا روپ بالکل اردو کا ہے۔ یعنی کسی کام کے پیچھے جو عقل پیدا ہوتی ہے وہ اگر پہلے ہوئے تو منج کہتا ہے، اے مرنال وتی اسے کوئی تکلیف (پیڑا) نہ ستا وے۔"

اس زمانے کے قریب کے لکھے ہوئے چند راسوؤں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یوں تو کئی "راسو" لکھے گیے پران میں دو بہت مشہور ہیں۔ ایک "ہیمبر راسو" دوسرا پرتھی راج راسو"

ہیمبر راسو

اس کے مصنف شارنگ دھر بہت بڑے عالم تھے۔ رنتھمبور کے مشہور راجہ ہیمبر دیو کے دربار میں ایک سردار راگھو دیو تھے جن کے تین بیٹے گوپال

؎۱ ہندی ساہتیہ کا اتی ہاس مصنفہ برج رتن داس صفحہ ۱۵

؎۲ " " " " " " " ۱۶

؎۳ " " " " " " " ۱۶

Hanif Razvi

دامودھر اور دیو داس تھے۔ دوسرے بیٹے دامودھر سے تین بیٹے شارنگ دھر، لکشمی دھر اور کرشن تھے شارنگ دھر نے ایور وید میں ایک بلند پایہ تصنیف اپنی یادگار چھوڑی اس کے علاوہ سنسکرت کی قواعد کے مطابق بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس زمانے کی کھڑی بولی کے بھی کچھ نمونے ملتے ہیں۔ "ہمیر و راسو" نامی ایک طویل نظم بھی ان سے منسوب کی جاتی ہے۔ [1] اس کی زبان کو بھی بعض علماء نے ابتدائی کھڑی بولی کا نمونہ سمجھا ہے۔ اس راسو کا ایک شعر درج ذیل ہے۔

"ڈھولا ماریا دھلی ماہنہ مچھیو ملیچھ سریر"

یعنی "دھلی میں ڈھول بجایا گیا اور مسلمانوں کے جسم بے ہوش ہو گئے"

اس سلسلے کی تصانیف میں چند بردائی کی "پرتھوی راج راسو" جدید ہند آریائی کی پہلی مستند تصنیف بھی سمجھی جاتی ہے۔ چند بردائی، پرتھوی راج کا درباری شاعر تھا۔ اس نے پرتھوی راج کی سلطان شہاب الدین محمد غوری پر فتح کی یادگار میں یہ نظم لکھی تھی۔ یہ نظم تقریباً دو سو برس تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی۔ اور پندرھویں صدی عیسوی میں ضبطِ تحریر میں لائی گئی۔ اس لیے علماء کے مابین اس کی زبان کے اصلی ہونے کے بارے میں اختلافات ہیں [2]

تاہم اکثر علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کے بعض حصے تو یقیناً اصلی ہیں۔ چنانچہ ایک شعر ذیل میں دیا جاتا ہے:

پنچ بیس پنچ دن کریں نواج
حق حق جن نہیں کلج [3]

ترکیبیں بھی آدھی ہندی اور آدھی فارسی ہیں مثلاً پلنگ پوش۔ جم جور (موت کا زور)

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتی ہاس مصنفہ برج رتن داس صفحہ (۱۶)

[2] ڈاکٹر گریرسن اس کو اصلی سمجھتے ہیں لیکن ڈاکٹر بولر اور مراری دھن نے اس کے خلاف مضامین لکھے۔ پروفیسر محمود شیرانی بھی اندرونی شواہد کی بنا پر اس کو مشتبہ قرار دیتے ہیں۔

[3] "پرتھوی راج راسو" مطبوعہ ناگری پرچارنی سبھا۔ چھند ۲۴ صفحہ (۵۲۱) جدید۔ تیرھویں داستان

Hanif Razvi

بعض محاورے ایسے ہیں جو اب بھی رائج ہیں مثلاً پانی ملتان بہہ گیا۔ ایک ضرب المثل ہے، استاد ذوق کا شعر ہے۔

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تاب حسن
اے ذوق پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا

پرتھی راج راسو میں یہ ضرب المثل یوں آتی ہے:

"اترے سا ہاب گییو ملتانہ پانی"

مسعود سعد سلمان کے قریبی زمانے کی زبان کے ان نمونوں کے ہماری دسترس میں آجانے کے بعد مسعود کا ہندی میں ایک دیوان مرتب کرنے کا خیال شاید محض ایک روایت باقی نہیں رہتا۔

اصل میں جیسا کہ پیشتر بتایا جا چکا ہے ۱۰۰۰ء میں ہندوستان ایک لسانی بحران سے گزر رہا تھا جس کی مثال ہندوستان کی زبانوں کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آتی تھی۔ ۱۰۰۰ء کے قبل کے زمانے تک آمد و رفت کے وسائل کی کمی کے سبب زبانوں کا نشو و نما مقامی ہوتا تھا اور ایک مقام کی بولی بولنے والوں کی اتنی تعداد دوسری بولی کے خطوں میں نہیں پہونچ سکتی تھی کہ بولیوں کا خلط ملط عمل میں آسکے۔ لیکن مسلمانوں کے ہندوستان میں آمد کے کچھ عرصے کے اندر اندر ہی سارے شمالی ہند میں اور علاؤالدین خلجی کے زمانے سے دکن میں بھی ہند آریائی بولیوں کا میل ملاپ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اور ایک بولی جو مسلمانوں نے اختیار کر لی تھی اس کے آثار مختلف بولیوں کے علاقوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ملنے لگتے ہیں۔ اس بولی کی خصوصیات کے سلسلے میں ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے حسب ذیل باتیں بتائی ہیں:

(۱) اس میں اسماء افعال اور صفات "آ" پر ختم ہوتے ہیں

(۲) اس میں حروف جار اور ضمائر کی شکلیں۔

'کا'۔ 'میں'۔ 'پر'۔ 'سے'۔ اس۔ اُس۔ جس۔ کس۔ میں وغیرہ ہیں۔ یہ خصوصیات کم و بیش اس نئی بولی میں ملتے ہیں۔

مذکورہ بالا شواہد کی موجودگی میں اس بات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نئی

Hanif Razvi

زبان جو نشو و نما پانے لگی تھی، اس کی ابتدائی حالت کیا تھی۔

اس جدید بولی کے اولین نثری آثار تو باضابطہ اور مسلسل صورت میں بہت بعد میں دستیاب ہوتے ہیں لیکن اس کے تحریری نثری آثار کے وجود سے پہلے اس کا فطرتاً عرصہ تک بول چال کی زبان کے طور پر ہندوستان کے ایسے سارے علاقوں میں رائج رہنا قرین قیاس ہے جو مسلمانوں کے زیر اثر آچکے تھے۔ مسعود سعد سلمان کا دیوان جو اب تک کی تحقیقات سے اردو کے اولین تحریری آثار کا نقطہ آغاز مانا گیا ہے۔ اگر وہ کسی زمانے میں غلط بھی ثابت ہو جائے تو پھر بھی مذکورہ نمونوں سے اس زمانے کی زبان کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے وہ لفظ جو مسعود سعد سلمان اور اس زمانے کی بعض فارسی تحریروں یعنی لغتوں، سفرناموں وغیرہ میں ملتے ہیں۔ وہ بھی دراصل اس زمانے کی بول چال کے ادھورے اور منفرد تحریری آثار ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں۔

ان آثار کی اہمیت اردو نثر کے آغاز کی چھان بین کے سلسلے میں اس لیے گھٹائی نہیں جا سکتی کہ وہ کافی اور مربوط مواد کی عدم موجودگی میں اس زمانے کی بول چال کی زبان کے نمونوں کے باقیات ہیں یہ اور بات ہے کہ نثر کی اصطلاحی تعریف ان پر صادق نہیں آتی تاہم ان کے پیچھے جو خیال کام کر رہا ہے وہ اہم چیز ہے۔ یہ الفاظ جو فارسی تحریروں کے بیچ بیچ میں آگئے ہیں۔ ایک مربوط خیال کے اجزا ہیں کیونکہ یہ بات تصور میں نہیں آسکتی کہ قوموں کے ذہنی نشو و نما کے کسی مرحلے میں بھی وہ صرف منفرد لفظوں میں خیالات کو ظاہر کرتی رہی ہوں گی۔ یہ خیال سارے علمی نفسیاتی اور لسانی اصولوں کے لحاظ سے غلط ہوگا۔ کیونکہ یہ لسانیات کا مسلمہ اصول ہے کہ زبان کی اکائی لفظ [1] نہیں جملہ ہے۔ یعنی انسان نے جب بھی بولنا شروع کیا وہ جملوں میں بولنے لگا نہ کہ الفاظ میں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جملے کبھی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "ایلیمنٹ آف دی سائنس آف لنگویج" دوسرا ایڈیشن۔ تاراپور والا صفحہ ۹۔

لفظی جملے (SENTENCE-WORDS) رہے ہوں۔

اس اصول کی روشنی میں ان منفرد لفظی آثار کا بھی مطالعہ کرنا ہوگا۔ جو اس زمانے کے اظہارِ خیال کا ذریعہ ہیں اور جنھیں فارسی دانوں نے ہندوستانی عوام کو اپنا مافی الضمیر سمجھانے کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ یہی دراصل ان قلمبند شدہ اردو لفظوں کی اہمیت ہے جو ہم کو فارسی کی تحریروں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ بول چال کی زبان کے لفظ ہیں جن کے جملے کے دوسرے اجزاء فارسی میں ہیں۔

چونکہ اس زمانے میں اردو یا ماقبل اردو کی نثری تصانیف دستیاب نہیں ہوتیں۔ نہ ہی منظوم تصانیف ملتی ہیں۔ اس لیے اس زمانے کی بول چال کی زبان کا اندازہ کرنے کے لیے ہم کو جو مواد مل سکتا ہے اس کے ماخذ تین ہیں۔

(ا) اس زمانے کے فارسی شعرا کا کلام

(ب) فارسی لغات

(ج) ایرانی عرب سیاحوں کے سفرنامے

(ا) فارسی شعرا کا کلام

فارسی شعرا میں یوں تو سب سے پہلے مسعود سعد سلمان قابلِ ذکر ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلے منوچہری نے اپنے کلام میں ہندوستانی کے لفظ برتے تھے۔

ا۔ فارسی شعرا کا کلام: منوچہری ۱۰۹۰ء

منوچہری کا وہ شعر جس میں اس نے ہندوستانی کے لفظ استعمال کیے ہیں، یہ ہے:۔

الا تا مومناں دارند روزہ
الا تا ہندواں گیرند لنگھن [1]

---

[1] لنگھن الانگھنا سے نکلا جس کے معنے روزہ کے ہیں۔

مسعود سعد سلمان

۴۵۱ھ تا ۴۹۲ھ
۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۸ء

مسعود سعد سلمان سے جو دیوان منسوب کیا گیا ہے وہ توفی الوقت ہماری دسترس میں نہیں۔ تاہم اس کے فارسی دیوان میں جو ہندوستانی لفظ ملتے ہیں وہ بھی حقیقت میں اس زمانے کی بول چال کی زبان کے نمونے ہیں۔ چنانچہ ذیل کا شعر اس سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ ؎

(۱) چو رعد زابر بغرید کوس محمودی ✤ برآمد از پس دیوار حسن مارا مار [۱]

پروفیسر عبدالغنی [۲] اور پروفیسر محمود شیرانی نے مسعود کا ذیل کا شعر بھی اسی سلسلے میں نقل کیا ہے جس میں "برشگال" کا لفظ آتا ہے۔ شعر یہ ہے :۔

برشگال اے بہار ہندوستاں ✤ ای نجات از بلائے تابستاں

یہ سمجھنا کہ برشگال سنسکرت "ورش کال" سے لیا گیا ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ فارسی اور سنسکرت متحد الاصل زبانیں ہیں اور یہ دونوں لفظ ایک ہی ماخذ کے دو الگ الگ ترقی پائے ہوئے روپ ہیں۔ فارسی شعرا ان لفظوں کے باندھنے پر ظاہر ہے اس لیے مجبور ہوئے کہ وہ بول چال کی زبان کے لفظ تھے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں بھی ہندوستانی لفظ باندھے گیے ہیں :۔

اے پرستار رنگ وسکھ درپن ✤ دی گرفتار عشق شمع ولگن [۳]

یا

دل نمی ارزد کہ اندیشش کنی ✤ وار ہاندیا بہ بیوہاری دعا [۴]

اس کے علاوہ بقول پروفیسر شیرانی

"خواجہ کے دیوان فارسی میں بعض باتیں ایسی موجود ہیں جن کو ہندوستان کا پرتو مانا جا سکتا ہے"[۵]

---

[۱] قلمی دیوان مملوکہ اے۔ کے فانی، بحوالہ "پرشین انڈر مغل" و "پنجاب میں اردو" صفحہ ۶۳
[۲] "ہسٹری آف پرشین لنگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ" صفحہ ۱۸
[۳] " " " " " " " " صفحہ ۳۳
[۴] " " " " " " " " صفحہ
[۵] پنجاب میں اردو صفحہ ۶۰

Hanif Razvi

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

" فارسی زبان میں بارہ ماسہ کی صنف کی نظموں کا رواج نہیں ہے اور نہ سنسکرت میں ایسی نظمیں موجود ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ خواجہ نے دوازدہ ماہیہ لکھنے میں جسے غزلیات مشہور یہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پنجابی کی تقلید کی ہے" [1]

ان شواہد کی موجودگی میں مسعود کا ہندی میں دیوان مرتب کرنا بھی بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ہند اور ایران کے تعلقات کے سبب نہ صرف پنجاب آئے ہوئے ایرانی شاعر ہندوستانی کے لفظ اپنے فارسی کلام میں استعمال کرتے تھے۔ بلکہ ہندوستان سے ایرانیوں کے گہرے تعلقات کی بدولت کئی ہندوستانی لفظ سفر کر کے ایران پہونچ رہے تھے۔ محمود غزنوی کے درباری شعرا میں کئی ایسے شاعر گزرے ہیں جن کے کلام میں ہندوستانی لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں فرخی منوچہری اور سنائی قابل ذکر ہیں۔

فرخی [2] کے ایک شعر میں مندرجہ ذیل ہندوستانی لفظ ملتا ہے :-

بگونہ شل انغانیاں دوپرہ ویکسر ٭ چو دستہ دستہ بہم تیرہائے بے سوفار [3]

شاہنامہ فردوسی میں فردوسی نے بھی کئی ہندوستانی لفظ' جیسے کوتوال۔ بودھ (بت) وغیرہ استعمال کیے ہیں۔ کوتوال دراصل کوٹ والا یعنی مالک قلعہ تھا۔ فردوسی کا شعر ہے ؎

چو آگاہ شد کوتوال حصار ٭ بر او بخت یار رستم نامدار [4]

کوتوال کی تشریح شرف نامہ کے مصنف اس طرح کرتے ہیں :

" واز شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بہ خراساں و فارس مشہور شدہ۔"

---

[1] پنجاب میں اُردو صفحہ (۶۱)

[2] " " " ۵۱

[3] " " " ۵۰ [4] پنجاب میں اُردو

Hanif Razvi

سنائی
۵۲۵ھ یا ۵۴۵ھ

فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ محمود کے زمانے میں پنجاب آئے تھے۔ انھوں نے اپنے قصیدے میں کچھ ہندوستانی لفظ استعمال کیے ہیں۔ قصیدے کے شعر حسب ذیل ہیں:

تو پے مرگ ہرگز بجائے نہ یابی ∴ ز رشک لغت ہائے اپنی دانی
اسامی در این عالم است ار نہ جائے ∴ چہ آب و چہ میدہ و چہ نام و چہ پانی

سنائی کا ایک اور شعر ہے:

نہ درآں معدہ خدرہ میدہ ∴ نہ درآں دیدہ قطرہ پانی [1]

اور

ننگہنت گر کند تما فربہ ∴ سیر خوردن تراز ننگہن بہ

عثمان مختاری
۵۴۴ھ

یہ غزنہ کے باشندے اور فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے والیِ ہند کی مدح میں قصاید لکھے تھے ان میں سے ایک قصیدہ کے ایک شعر میں کچھ ہندی الفاظ یوں باندھے ہیں:

زمن بدیدے بادے بجستہ گفتے چول ∴ مگن بدیدے برمن نشستہ گفتا "مار" [2]

(ب) لغات

فارسی کے شعرا کے کلام کے علاوہ جن میں ہندوستانی کے لفظ دستیاب ہوئے ہیں کچھ فارسی لغات بھی ملتی ہیں جن میں ہندوستان کی اس عام بول چال کی زبان کو فارسی کے ذریعہ ایرانیوں کو سکھلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان لغات میں بعض تو سادہ نہج پر لکھی گئیں اور کچھ منظوم اور خالق باری کی طرح کی منظوم لغات ہیں۔ ان منظوم لغات سے اس زبان کے عام طور پر بول چال میں مروج ہونے کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ جس کو ذہن نشین کرنے کے لیے نظم کا آسان پیرایہ اختیار کیا جاتا تھا۔ جو روپ لفظوں کے ان لغات میں ملتے ہیں ان سے اس زمانے کی زبان اور اس کی لسانی ہیئت کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس سلسلے کی کتابوں میں مندرجہ ذیل لغات کا تذکرہ ضروری ہے۔ جن کی تفصیل پروفیسر محمود شیرانی [3] اور حکیم

---

[1] پنجاب میں اُردو۔ صفحہ ۱ ، [2] پنجاب میں اُردو صفحہ ۹۵ [3] ملاحظہ ہو پنجاب میں اُردو صفحہ ۲۷۲

Hanif Razvi

شمس اللہ قادری [1] نے دی ہے۔

ہندی فرہنگ نگاروں میں پروفیسر شیرانی تقدم مولانا فخر الدین مبارک غزنوی کی لغت "فرہنگ نامہ" کو دیتے ہیں۔

"فرہنگ نامہ" ۱۵۱۷ء

فخر الدین (۶۹۵ھ ۱۵۱۷ء) عہد علاء الدین خلجی کے مشہور شاعر تھے۔ جن کا ذکر ضیاء الدین برنی اور فرشتہ دونوں نے کیا ہے۔ اس میں انھوں نے فارسی الفاظ کی تشریح بعض موقعوں پر ہندی میں کی ہے۔ اس کے نمونے یہ ہیں۔

"ابر نیساں" کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"اہل ہند آں را باراں سواتی نامند و آں ابتدائے زمستاں و انتہائے برشگال است" [2]

دیگر نمونے حسب ذیل ہیں :

پرستو۔ مرغیکہ ہندش بھکراج گویند

تاک ۔ ہندش چھیکا نامند

قاقلہ ۔ سایہ پرورکہ ہندش تیری گویند

دستور الافاضل ۷۴۳ھ

اس کے مصنف مولانا رفیع معروف بہ حاجب خیرات تھے۔ جس کے بارے میں پروفیسر شیرانی نے بتایا ہے کہ اس میں کچھ اُردو کے لفظ بھی موجود ہیں۔

بحر الفضائل فی منافع الافاضل ۷۹۵ھ

یہ بھی ساتویں صدی ہجری ہی کی تصنیف ہے یہ سات جلدوں پر مشتمل تھی۔ حکیم شمس اللہ قادری نے "اُردوئے قدیم" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی اب صرف دو جلدیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ابتدائی جلدوں میں فارسی الفاظ کے ساتھ ساتھ اکثر ہندوستانی مترادفات بھی درج کیے گیے ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو "اُردوئے قدیم" صفحہ ۳۲ طبع ثانی۔ [2] پنجاب میں اُردو صفحہ ۲۷۲

Hanif Razvi

حکیم شمس اللہ قادری کے خیال کے مطابق اُردو زبان کی تاریخ میں یہ الفاظ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان سے اس زمانے کی زبان کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

چونکہ یہ آٹھویں نویں صدی ہجری کی تصانیف ہیں اس لیے ان کا ذکر اس زمانے کے کارنامو ں میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف برسبیلِ تذکرہ ان کا ذکر کر دیا گیا جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بول چال کی یہ زبان عام طور پر مروج تھی۔ جیسا کہ پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ

"یہ فرہنگ نگار جس چیز کو ہندی کہتے ہیں وہ نہ برجی ہے نہ پنجابی نہ راجستھانی نہ بنگالی و گجراتی۔ ہندی سے ان کی مراد یہی اُردو ہے جو اس عہد کے مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی۔"

لغات میں کچھ منظوم بھی ہیں۔

منظوم لغات میں اب تک ایک خالق باری کا ہم کو علم ہوا تھا لیکن حال کی تحقیقات کئی منظوم لغات کا پتہ چلا ہے۔ جو گجرات اور بمبئی کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک کا ذکر سید سلیمان ندوی نے "نقوشِ سلیمانی" میں کیا ہے۔ اس کی تصنیف کا سنہ اور مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ یہ لغت اس طرح کی دوسری لغات کی طرح اس زبان کو ایرانیوں اور عربوں سے روشناس کرنے کے لیے ابتدائی دور میں لکھی گئی تھی۔ "نقوش سلیمانی" میں اس کے حسب ذیل دو اشعار لیے گیے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں بیک وقت عربی، فارسی، ہندوستانی کے لفظ استعمال کیے گیے ہیں۔ شعر یہ ہیں:۔

اللہ، خدا، ہے کرتار ٭ الخالق، آفرید، سرجن ہار
الدنیا، گیتی، سنسار ٭ الاحمق، نادان، گنوار

ایک اور منظوم لغت پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے خانگی کتب خانے میں محفوظ ہے جس کو دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ اس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:۔

الالہ پرستیدہ پوجیا ٭ المعلوم دانستہ بوجھیا

Hanif Razvi

المجمد سوده لکھانیا ٭ المعروف شناخته پچھانیا

ان چند تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو کے نشوونما کے ابتدائی دور میں منظوم لغات کی تصنیف و تالیف کا ایک وسیع سلسلہ جاری تھا۔ منظوم لغات کی اہمیت اسلیے تھی کہ عام لغات کے مقابلے میں نظم میں باندھے ہوئے لفظ نو وارد زبان سیکھنے والوں کے ذہن میں آسانی سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

سفرنامے

ہندوستان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششوں میں ان عرب اور ایرانی سیاحوں کے کارناموں کو بھی بڑا دخل ہے جو دور دراز کا سفر اختیار کر کے ہندوستان آئے اور یہاں کے حالات اور رہنے بسنے کے طریقوں کا مطالعہ کیا اور ان کا تحریری مواد بھی چھوڑا جن میں اور چیزوں کے علاوہ ہمارے موضوع کے لحاظ سے وہ اشارے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جو ان سیاحوں نے ہندی زبان کے بارے میں چھوڑے ہیں۔

ابن بطوطہ ۷۲۵ھ

ان سفرناموں میں ابن بطوطہ کا "سفرنامہ" خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ابن بطوطہ افریقہ کے ایک شہر طنجہ کا رہنے والا تھا۔ وہ جس وقت ہندوستان آیا۔ دہلی کی سلطنت پر فیروز شاہ تغلق کی حکومت تھی۔ اس نے ہندوستان کی بہت سی چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے تقریباً (۴۰) لفظ دیے ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

کوتوال۔ سموسہ۔ انبہ (آم) کشری۔ گسائیں۔ منڈی۔ پیادہ۔ بارگہ
گلہ بان۔ بدخانہ۔ قطارہ (کنارہ) شادش۔ مرطبان (مرتبان)۔
ٹٹو۔ بورا۔ سین۔ ڈول۔ جوتری۔ دیوڑھی۔ کھار۔ چاکر

ان الفاظ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عام بول چال کی زبان موجودہ اُردو کے کس قدر قریب پہونچ گئی تھی۔ بعض لفظ مثلاً کوتوال۔ سموسہ۔ گسائیں۔ منڈی چاکر۔ ٹٹو۔ بورا۔ سین۔ ڈول وغیرہ ٹھیک وہی لفظ ہیں جو اب اُردو میں مروج اور مستعمل ہیں۔ انبہ۔ بدخانہ میں معمولی تبدیلیاں ہوگئیں۔ ان سفرناموں کے علاوہ اس زمانے کی تواریخ

میں بھی اُردو کے الفاظ ملتے ہیں۔ چنانچہ ضیاء الدین برنی کی تاریخ "فیروز شاہی" میں صفحہ ۲۴۱ پر ملک فخر الدین کھنڈا اور ملک رکن الدین انبہ کے نام نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں کچھ اسی قسم کے اور عرف ملتے ہیں مثلاً ایک امیر "ہرن مار" کہلاتا ہے۔ دوسرے امیر کا خطاب "تورا بانڈ" لکھا گیا ہے۔ فرشتہ نے قطب الدین کے زمانے کو کال قطب الدینی کہا۔ قطب الدین ایبک کو رعایا نے اس کی سخاوت پر "لک بخش ۲" کا خطاب دیا تھا۔ اس عہد کے سکوں پر لفظ "شری امیر" کندہ ہوتا تھا۔ ۳

قاضی سراج منہاج ۶۲۲ھ عہد التمش میں قاضی سراج منہاج سندھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان آئے تھے۔ اپنی تاریخ میں کوچ بہار اور اس کے قرب و نواح کے فتوحات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"وایں را زبان دیگر است ❊ میان لغت ہندوست" ۴

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "لغاتِ ہند" کے نام سے ایک ہندی زبان جو پنجاب سے لیکر بنگال تک وسیع تھی، پیدا ہو چکی تھی۔

خلیج فارس اور بحر ہند کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"آب سنگمتی گو نند چوں بہ دریائے ہندوستان در آید او را بہ لغتِ ہندی سمندر گویند"۔ ۵

اوپر کی تفصیلات سے اس کا تھوڑا سا خاکہ ذہن میں آجاتا ہے کہ باضابطہ تحریری نثر کے آثار دستیاب ہونے سے پہلے اُردو زبان اپنی سیال حالت میں عام طور پر بول چال میں مروج تھی۔ باہر سے آنے والے ایرانی اور عرب یہاں کے رہنے والوں اور خاص طور پر نو مسلموں سے تعلقات کے مدنظر اس زبان کو سیکھنے اور اختیار کرنے پر مجبور ہوتے جا رہے تھے۔

---

۱ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳ مطبوعہ نول کشور ۲ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳ مطبوعہ نول کشور
۳ ملاحظہ ہو "نقوشِ سلیمانی" صفحہ ۳۷ ۴ بہ حوالہ "نقوشِ سلیمانی" صفحہ ۳۷
۵ "طبقاتِ ناصری" سراج منہاج کلکتہ

Hanif Razvi

اس باب کے آخری حصے کی تصنیفات سے جو ایک طرف تو نوواردوں کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے لکھی گئیں۔ دوسری طرف ہندوستانیوں کو عربی اور فارسی سے واقف کرانے تصنیف کی گئیں تھیں۔

سماجی زندگی میں اس زبان کے مقام اور اس کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بول چال کی زبان ابھی تحریر کے طور پر مستعمل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کے مربوط نثری آثار اس زمانے میں دستیاب نہیں ہوئے۔ اُردو کے نشوونما کا یہ دور جبکہ وہ محض بول چال کی زبان کی حیثیت سے ترقی کرتی رہی۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے لیکر آخر چھٹی صدی ہجری کے وسیع عرصے پر حاوی ہے۔

ابتدائی دو تین سو سال کے زمانے میں ہم کو مربوط نثر کے تحریری آثار دستیاب نہیں ہو سکتے اور قیاس یہ ہے کہ شاید اس کو ضبط تحریر میں لانے کے مواقع بھی نہیں تھے۔ کیونکہ زبانوں کی نشوونما کے ابتدائی مراحل ہمیشہ تکلمی رہے ہیں۔ بولی کی صورت میں مستقل حیثیت اختیار کر لینے کے بعد ہی زبانوں کے تحریری آثار نشوونما پانے لگتے ہیں۔ اُردو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ کلام کے ان منفرد آثار یعنی کلموں کو اجزائے کلام کی اس اہمیت کے مدنظر اُردو نثر کا نقطۂ آغاز تصور کیا جا سکتا ہے۔

Hanif Razvi

۲

نثر پاروں کا آغاز

زبان کی نشو و نما کا دوسرا مرحلہ نثر پارے (جملے)   نثر پاروں کی اہمیت
بزرگوں کے مقولے ۔ معین الدین اجمیری قطب الدین بختیار کاکی ۔
فرید الدین گنجشکر ۔ نظام الدین محبوب الٰہی ۔ نصیر الدین چراغ دہلوی
بو علی قلندر پانی پتی ۔ شرف الدین یحییٰ منیری ۔ اشرف جہانگیر
زین الدین خلد آبادی ۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت ۔ قطب عالم
شاہِ عالم ۔ اس زبان کی ہر دل عزیزی کا ایک اور ثبوت قدیم دور
کے ایک بزرگ سید محمد امجہری کی رائے منقول از مناقب محمدی
سوانح سید محمد امجہری) ۔

Hanif Razvi

نثر پاروں کا آغاز

ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے اُردو کی تشکیل میں ایک قدم اور آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اُردو کے نثر پاروں یا ملفوظات کا دور ہے۔ جو ساتویں صدی ہجری کے اختتام تک جاری رہا۔ اس سو سال کے عرصے میں اُردو مستقل صورت اختیار کرتی گئی۔ اس کا اندازہ ان بزرگوں کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنے اطراف کے عوام کی بول چال کی زبان کی رعایت یا اس کے استعمال کرنے کی مجبوری کے مدنظر اپنی فارسی تصانیف میں ہندی عوام اور خواتین سے تخاطب کے موقعوں پر کچھ اُردو کے جملے بھی شامل کر لیے ہیں۔

یہ ابتدائی آثار گو مربوط نثر کی تعریف میں نہیں آسکتے تاہم نثر کی تعریف سے خارج بھی نہیں کیے جاسکتے۔ کیونکہ بزرگوں کے یہ ملفوظات نظم میں نہیں اور اُردو میں ہیں اس لیے استخراجی طور پر ہم انھیں نثر یا نثر پاروں میں شمار کرنے پر مجبور ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اُردو کی حد تک یہ گویا نثر کے ابتدائی نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں ساتویں صدی ہجری کا آغاز وہ زمانہ ہے جبکہ دہلی میں محمد غوری کی قائم کی ہوئی مملوک بادشاہت اپنی ابتدائی کش مکش کے دور سے گزر کر کسی حد تک استقلال کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ اگلے دور کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ امن و امان کا دور تھا۔ بڑے بڑے اہل قلم، صوفی، شاعر، تاجر اور صناع، ایران و عرب سے ہندوستان آرہے تھے اور نئی شائستگی اور نئی زبانیں رکھنے والی قوموں کے ربط سے جو لسانی نتائج فطرتاً پیدا ہونے چاہئیں تھے وہ نشوونما پا رہے تھے۔ اس زمانے میں ایرانی ادب پر تصوف کا بہت گہرا اثر تھا۔ اور نئی قوم اور نئے مذہب کے لوگوں سے ہندوستان میں ربط پیدا ہونے کے بعد ان علماء کو اس کی ضرورت سختی سے محسوس ہوئی کہ ہندوستانی عوام کو اپنے مذہب کے

Hanif Razvi

حقایق، تصوف یعنی ہمہ گیر محبت کی زبان میں سمجھائیں۔ اس زمانے میں جتنے علماء ہندوستان آئے انھوں نے تصوف ہی کی اصطلاحوں میں مذہب اسلام کو پیش کیا۔ تاکہ محبت اور پریم کی مفاہمت کے ذریعہ نئے تصورات رکھنے والے عوام کے درمیان زیادہ مستحکم تعلقات پیدا ہو سکیں۔ ان بزرگوں کے بہت سے سلسلے تھے۔ جیسے چشتی۔ قادری۔ نقشبندی۔ سہروردی وغیرہ ان میں سے کوئی عرب سے کوئی ایران سے اور کوئی افغانستان سے آئے تھے۔ ان کی اپنی زبانیں بھی مختلف تھیں۔ لیکن انھوں نے یہاں کے لوگوں کو ان کی زبان میں جس کو وہ ہند کی مناسبت سے "ہندی" کہتے تھے اسی میں مخاطب کیا تاکہ ان کا پیام گھر گھر پہونچ سکے۔ اس سے قبل بدھ مت کی تلقین کرنے والوں نے بھی اس "گر" کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی عوامی زبان یعنی "پالی" کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا تھا۔ گوتم بدھ کی اپنے چیلوں کو خاص ہدایت تھی کہ وہ عوامی بولی میں اپنے مذہب کی تلقین کریں۔ پنڈت ایودھیا سنگھ ہری اودھ اپنی تصنیف "ہندی بھاشا اور ساہتیہ کے وکاش"[1] میں ایک واقعہ لکھتے ہیں جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔

وہ کہتے ہیں "ایک دفعہ دو برہمن یمیل اور تکیل مہاتما بدھ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ اے بھگوان مختلف ذات پات کے لوگ آپ کے پاک بولوں کو ناپاک کر رہے ہیں اس لیے ہمیں حکم دیجیے کہ ان چھندوں کو ہم سنسکرت میں لکھیں۔ مہاتما نے کہا بدھ مت کی تبلیغ سوائے "پالی" کے کسی اور زبان میں کرنا میری توہین ہے۔ میری باتوں کو اپنی ہی بھاشا میں سمجھنے کی کوشش کرو"۔

ان صوفی بزرگوں کے ہندوستان میں آنے اور ارشاد و ہدایت کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی سے اس نوخیز زبان کا تسلط زیادہ وسیع ہوتا نظر آتا ہے۔ تحریری آثار کا یہ ارتقاء ایک حد تک منطقی بھی ہے یعنی اس سے پہلے کے دور کے منفرد الفاظ جن کے جملوں کے دوسرے اجزا

---

[1] صفحہ ۲۲۔ نیز ملاحظہ ہو ہندی بھاشا اور ساہتیہ شیام سندر داس صفحہ ۱۳

Hanif Razvi

فارسی کے نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ اب اردو میں مکمل طور پر بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ یہ تحریری آثار کا دوسرا مرحلہ ہے۔ جس میں کم سے کم ایک مربوط خیال کے اظہار کی حد تک فارسی کے سہارے چھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی کے نتیجے کے طور پر اکثر بزرگوں کی فارسی تحریروں کے درمیان اردو کے کچھ جملے بھی مل جاتے ہیں۔ ان جملوں کے مطالعے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ فارسی کے مصنفین اور بزرگانِ دین کو ایسے موقعوں پر اردو جملوں سے مدد لینی پڑتی تھی۔ جب وہ ہندی عوام سے گفتگو کرتے یا ان کے خیالات کو ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ نوخیز بولی اب ہندوستان کے لاکھوں عوام کی زبان بن چکی تھی۔ اور ان کے لیے فارسی میں افہام و تفہیم کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اسی لیے فارسی یا عربی بولنے اور لکھنے والے بزرگوں کو بھی اس زبان سے مدد لینی پڑتی تھی۔

ان فارسی علماء کا اردو ادب کی تاریخ پر بڑا احسان ہے کہ ان کے احساسِ حقیقت پسندی نے حسبِ ضرورت ہندوستانی زبان سے کچھ جملے اپنی اصلی صورت میں محفوظ کر دیئے ہیں۔

خواجہ معین الدین اجمیری
ولادت سنہ ۵۳۰ھ سنہ ۶۳۰ھ

اس سلسلے کے بزرگوں میں جن سے اردو کے مربوط جملے منسوب ہیں سب سے پہلے جن کا ذکر آتا ہے وہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری ہیں۔ اگر ملک محمد جائسی کی ہندی تصنیف "اکھراوٹ"[1] کے شرح نگار کے بیان کو صحیح مانا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین اجمیری اسی زبان میں گفت و شنید فرماتے تھے۔ وہ لکھتا ہے:-

"توہم نہ کنند کہ اولیا اللہ بغیر از عربی تکلم نہ کردہ زیرا کہ جملہ اولیا اللہ در ملک عرب مخصوص نہ بودہ بس بہ ہر ملک کہ بودہ زبان آں ملک را بکار بردہ اند و گمان نہ کنند کہ ہیچ اولیا اللہ بہ زبان ہندی تکلم نہ کردہ زیرا کہ اول از جمیع اولیا اللہ خواجہ بزرگ معین الحق والملت والدین بدین زبان سخن فرمودہ"[2]

[1] یہ کتاب تصوف سے متعلق ہے گو رسم الخط فارسی تھا لیکن زبان برج بھاشا یا راجستھانی ہے۔ اسکے کئی ترجمے اور شرحیں فارسی میں ہوئیں اردو میں عشرتی نے ۱۲۳۵ھ میں انکی دوسری تصنیف پدماوت کو نظم کیا تھا۔

[2] ملاحظہ ہو اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کلام صفحہ ۲۴

Hanif Raza

اس کی تائید خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات سے بھی ہوتی ہے۔ ان کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کا پیشہ طب تھا۔ یعنی ان کو رات دن عوام سے سابقہ رہتا تھا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ خواجہ صاحب ہندوستانی مریضوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے

خواجہ صاحب ۵۵۱ھ میں شہاب الدین محمد غوری کی فتح سے تقریباً تین چھتیس سال پہلے اجمیر آئے ان کا مولد اصفہان تھا۔ اجمیر میں تصوف کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ بھی کھولا تھا۔ وہ اپنے پیشے طب کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھے۔ اسی مقبولیت کے باعث ایک ہندو خاتون نے ان سے عقد کر لیا تھا[۱] خواجہ صاحب فارسی کے بڑے اچھے شاعر اور فارسی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پیشے کے علاوہ ان کا نجی مشغلہ ارشاد و ہدایت تھا۔ اس کی وجہ سے بھی ان کا ہندوستانی زبان اختیار کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خواجہ صاحب کے ملفوظات کسی تاریخ یا تذکرہ میں دستیاب نہیں ہوتے۔ البتہ ان کے خلیفہ قطب الدین بختیار کاکی کے کئی مقولے دستیاب ہوئے ہیں۔

قطب الدین بختیار کاکی اولیاء
۵۸۲ھ ۔ ۶۳۴ھ

قطب الدین بختیار کاکی حسینی سید اور معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے۔ ان کا تعلق ماوراء النہر کے ایک معزز خاندان سے تھا۔

ابھی وہ کم سن ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے ڈیڑھ سال ہی کی عمر میں تعلیم کے لیے ایک ہمسایہ کے حوالے کر دیا وہ انھیں شیخ ابو حفص کے پاس لے گیا جو اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ شیخ نے ان کی تعلیم و تربیت میں بہت دلچسپی لی۔ لیکن سن شعور کو پہونچنے کے بعد انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ خواجہ صاحب نے انھیں دھلی میں اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ ان دنوں دھلی میں شمس الدین التمش (۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء) کی حکومت تھی، وہ بڑا خدا ترس اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ وہ بھی آپ کے ارادت مندوں میں

---

[۱] ملاحظہ ہو مضمون رسالہ سیاست "ہندوستان قرون وسطیٰ میں" از آر۔ جنبت راو۔ و تذکرہ "خزینۃ الاصفیا"

داخل ہو گیا۔ دہلی میں بہت دن تک انھوں نے تبلیغ و اشاعت دین کا فرض انجام دیا۔ دہلی میں حضرت نظام الدین محبوب الٰہی اور بابا فرید شکر گنج ان کے مشہور خلفا ہیں۔ بختیار کاکی کا انتقال ۶۳۴ھ میں ہوا۔[۱]

بابا فرید گنجشکر کے ملفوظ "جواہرِ فریدی" میں بختیار کاکی سے ایک اور جملہ منسوب کیا گیا ہے۔ "جواہرِ فریدی" میں لکھا ہے: جب بختیار کاکی دہلی میں مقیم تھے۔ بابا فرید گنج شکرِ آشوبِ چشم کی وجہ سے آنکھ پر پٹی باندھے ہوئے پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت بختیار کاکی نے جب ان سے پٹی باندھنے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے یہ اُردو جملہ فرمایا کہ "آنکھ آئی ہے"۔ جس کے جواب میں بختیار کاکی نے ارشاد فرمایا:

"اگر آنکھ آئی ہے تو سو آئی ہے"۔[۲]

بابا فرید شکر گنج
۵۶۹ھ ۔ ۶۶۴ھ

شیخ کے والد جمال الدین سلمان، محمود غزنوی کے بھتیجے تھے۔ جو شہاب الدین غوری کے عہد میں کابل سے لاہور آئے اور کچھ دن یہاں قیام کرنے کے بعد بادشاہ کے حکم سے ملتان پہنچے۔ یہاں مُلّا وجیہہ الدین خجندی کی دختر مریم خاتون سے انھوں نے عقد کیا۔ مریم خاتون ہی کے بطن سے شیخ فرید الدین گنجشکر ۵۶۹ھ میں ملتان میں تولد ہوئے۔ شیخ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضؓ سے ملتا ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ملتان میں حاصل کی۔ ایک دن ملتان کی مسجد میں منہاج الدین سے فقہ میں "نافع" کا درس لے رہے تھے کہ خواجہ قطب الدین بختیار

۱۔ ان کے انتقال کے متعلق عجیب روایت ہے، مشہور ہے کہ سماع کے دوران قوال کے اس شعر پر ع
"کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ٭ ہر زماں از غیب جانِ دیگر است" آپ کو وجد آیا اور جاں بحق تسلیم ہوئے۔

۲۔ اس جملے کے متعلق تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری اپنی کتاب "اُردوئے قدیم" میں پیر کے ارشاد کے بارے میں دوسرا جملہ نقل کرتے ہیں یعنی "اگر آنکھ آئی ہے این را چرا بستہ دید"
محمد غوث قلندر پانی پتی کے ملفوظ تذکرہ غوثیہ میں مندرجہ بالا جملہ درج ہے۔ یہ روایت بھی عام ہے کہ شکر گنج کے خاندان والوں کی آنکھ ایک بڑی ایک چھوٹی ہوتی ہے۔ اس طرح سوائی آنکھ آپ کے خاندان کی خصوصیات سمجھی جاتی ہے۔

Hanif Razvi

کاکی کا اس طرف گزر ہوا۔ بختیار کاکی نے ان سے پوچھا "اے طفل چہ میخوانی"، جواب دیا "نافع" فرمایا نفع آور ہو۔ اس پہلی ملاقات میں وہ اپنے مرشد بختیار کاکی سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے ہمراہ دھلی جانے کے لیے تیار ہو گیے۔

حضرت نے فرمایا ابھی علوم ظاہری کی تکمیل کر و اور کہا "زاہد بے علم مسخرہ شیطان است" چنانچہ اس کے کچھ دن بعد وہ قندھار و ملتان گیے۔ وہاں اپنے پیر حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں دھلی پہونچے۔ یہاں سے خرقۂ خلافت لیکر پنجاب کے شہر اجودھن میں پہونچے، وہیں ۶۶۴ھ میں (۱) بابا صاحب کا انتقال ہوا۔

بابا فرید کے اکثر مقولے "سیر الاولیا" (ملفوظ شیخ نظام الدین) اور "جواہر فریدی" (ملفوظ بابا فرید شکر گنج) میں محفوظ ہیں۔ پہلا ان میں سب سے مشہور و معروف "پونوں کے چاند والا" فقرہ ہے۔ جو انھوں نے جمال الدین ہانسوی کے بیٹے برہان الدین ہانسوی کی نسبت ان کی والدہ "مادرِ مومناں" سے کہا تھا۔

یہاں ایک خاص امر کی طرف اشارہ ضروری ہے وہ یہ کہ ان بزرگوں نے جو اُردو جملے ارشاد فرمائے ہیں ان میں سے اکثر عورتوں سے مخاطبت کے دوران میں ملفوظ ہوئے ہیں، چنانچہ اکثر قدیم دینی کتابیں بھی خواتین کو مذہبی مسایل سمجھانے کے لیے ہی لکھی گئی ہیں۔ ان میں مختلف "چکی نامے" "سہاگن نامے" "لوریاں" "پہیلیاں" وغیرہ شامل ہیں۔

مادرِ مومناں، شیخ جمال الدین ہانسوی کی، جو بابا فرید کے محبوب خلیفہ تھے، کنیز تھیں شیخ کی خاطر بابا صاحب بارہ برس ہانسی میں مقیم رہے۔ بعد میں جمال الدین ہانسوی نے ان خاتون سے عقد کر لیا تھا۔ یہ کنیز، جمال الدین ہانسوی کے پیغام شیخ کی خدمت میں لایا کرتیں جب جمال الدین ہانسوی کا انتقال ہوا تو "مادرِ مومناں" جمال الدین کی قبا مصلے اور عصا لیکر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ بابا نے یہ تمام چیزیں حضرت کے کمسن صاحبزادے

---

(۱) ڈاکٹر عبدالحق اپنی کتاب "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کے کام" میں بابا کا سنہ ولادت ۵۹۹ھ اور سنہ وفات ۶۶۴ھ لکھتے ہیں۔ "خزینۃ الاصفیا" میں ۵۶۹ھ سن ولادت اور ۶۶۴ھ سن وفات درج ہے۔

Hanif Razvi

برہان الدین کو عنایت کردیں اور ان کا جانشین مقرر کردیا۔ اس موقع پر "مادرِ مومناں" نے برہان الدین کی کمسنی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا کہ "خوجا بالا ہے" اس پر شیخ نے فرمایا:

"پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"

"سیر الاولیاء"[1] کی اصلی عبارت درج ذیل ہے:

"مادرِ مومناں کہ خادمِ شیخ جمال الدین بود مصلے و عصا شیخ جمال الدین از شیخ الشیوخ العالم یافتہ بود مولانا برہان الدین صوفی پسر خورد شیخ جمال الدین کہ پدر شیخ قطب الدین منوّر بود در عالم حضر بود۔ بخدمت شیخ الشیوخ العالم بمد۔ شیخ الشیوخ العالم بہ مرحمت مولانا برہان الدین مذکور را تعظیم و تکریم نمود و بشرف ارادت و بیعت خود مشرف گردانید۔ و چندروز بر خود داشت۔ بوقت مراجعت خلافت نامہ و آں مصلے و عصا با نعمتے کہ مولانا شیخ جمال الدین رواں کردہ بود بہ مولانا برہان الدین صوفی بخشید۔ و فرمودانہ جہت ما مجازی بود تو ہم مجازی و ایں ہم فرمود باید کہ چند گہے در محبت مولانا نظام الدین باشی یعنی سلطان المشائخ در ایں محل مادرِ مومناں بخدمت شیخ الشیوخ العالم عرضداشت کرد "خوجہ بالا است" بہ زبان ہندی گفت "مادرِ مومناں پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے" یعنی ماہ شب چہار دہم در اول شب خورد باشد کہ بہ تدریج بہ کمال می رسد"

"سیر الاولیاء" ہی میں ایک اور مقولہ ملتا ہے جو بابا فرید نے شیخ علی احمد صابر سے اس وقت کہا تھا جب وہ اپنے خلفا کو ایک ایک سمت روانہ کر کے نصیحتیں کر رہے تھے۔ باباصاحب نے حضرت صابر کی طرف دیکھ کر فرمایا جس کو "سیر الاولیاء" کے جامع میر خورد[2] نے اس طرح نقل کیا ہے "اے صابر بر و برگ ہا خواہی کرد" یعنی ترا عیش خوش خواہد گزشت۔

---

[1] "سیر الاولیاء" ملفوظ شیخ نظام الدین مطبوعہ مطبع محب ہند باہتمام منشی چرنجی لال صفحہ ۱۸۲ اور ۱۸۳

[2]

"جواہر فریدی" میں ایک اور واقعہ مذکور ہے۔ کہتے ہیں سرسہ کے مقام پر بابا فرید ایک بزرگ کے مزار پر جایا کرتے تھے۔ ایک روز کچھ لوگ راستے میں چھپ کر بیٹھ گیے۔ جب بابا فرید کو معلوم ہوا تو ناخوش ہوے اور ہندی میں فرمایا:

"سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ"[1]

اس کے علاوہ "جواہر فریدی" ہی میں ان کا ایک "ذکر" بھی ہندی زبان میں منقول ہے؛ جو حسب ذیل ہے:-

"اینو ہہ تون انھونہ تون اہین تون"

(یہاں تو، وہاں تو، سب جگہ تو)

"جواہر فریدی" کے اس ہندی "ذکر" کی تصدیق دارالمصنفین کے کتب خانہ میں مخزونہ ایک رسالے "جواہر خمسہ"[2] (قلمی) سے ہوتی ہے۔ یہ رسالہ سنہ ۱۰۹۷ھ کا مرقومہ ہے۔ اس میں بابا شیخ فرید کے بارے میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے:-

"بندگی حضرت قطب الاقطاب حضرت شیخ فرید گنجشکر قدس اللہ سرہ ذکر بہ زبانِ ہندی وضع فرمودند در عمل آوردہ اند در باب ایں اند۔"

ایک اور مقولہ بھی اسی کتاب میں منقول ہے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک مرید نے بابا صاحب سے دریافت کیا جسم میں عقل کا مقام کونسا ہے؟ انھوں نے جواب دیا:

"بیچ سر کے"

بابا شیخ فرید کے خلیفہ خواجہ بدرالدین اسحاق کے ملفوظہ میں مذکور ہے کہ وہ اپنے ایک دوست کو "بھیا" کہا کرتے تھے[3]۔

ان مقولوں کے علاوہ "اردو کے نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" اور "تاریخ داستان

---

[1] جواہر فریدی مخطوط مخزونہ، کتب خانہ آصفیہ، نیز ملاحظہ ہو پنجاب میں اُردو، صفحہ

[2] نقوش سلیمانی صفحہ (۲۱)

[3] ملاحظہ ہو اردوئے قدیم، اڈیشن دوم ۱۹۲۷ء۔ صفحہ ۲۲۔

Hanif Razvi

اُردو "میں ان سے کچھ اشعار بھی منسوب کیے گیے ہیں لیکن مولانا سلیمان ندوی کو ان اشعار کی اصلیت کے بارے میں شبہ ہے۔ ایک شعر یہ ہے :

"وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے ٭ خیز دراں وقت کہ برکات ہے"

ڈاکٹر عبدالحق نے حضرت قطب عالم کے "جمعات شاہی" سے بابا فرید کا مندرجہ ذیل منظوم قول بھی درج کیا ہے :-

اسا کبری یہی سو ریت ٭ جاؤں نائے کہ جاؤں بیت

بابا صاحب سے ہندی اور پنجابی میں چند "کافیاں" بھی منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن بعض علماء ان کافیوں کو نانک کی لکھی ہوئی سمجھتے ہیں۔ لیکن پروفیسر محمود شیرانی اور ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، نیز ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کافیاں بابا فرید کی نہیں بلکہ نانک کے معاصر کسی اور فرید کی ہیں۔

نظام الدین محبوب الٰہی
۶۳۴ھ - ۷۲۵ھ

بابا فرید گنجشکر کے خلیفہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے ملفوظات ان کے دو شاگردوں نے جمع کیے ہیں۔ ان میں سے ایک "سیرت الاولیا" ہے جسے سید محمد مبارک علوی کرمانی المدعو میر خورد نے مرتب کیا۔ اور دوسری "فوائد الفوائد" امیر خسرو کے دوست میر حسن سنجری[۲] نے تالیف کی۔ گو ان ملفوظات میں ان کا فرمودہ کوئی قول نہیں ملتا لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس سلسلے کے سارے بزرگ ہندوستانی عوام کی ارشاد و ہدایت کے لیے ہمیشہ اُردو زبان استعمال کرتے رہے تو قیاس بھی چاہتا ہے کہ حضرت شیخ نظام الدین نے بھی ضرور اس زبان کو اظہارِ مطلب کا ذریعہ بنایا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے ملفوظات محفوظ نہ رہ سکے اور شاید اب ناپید ہیں۔ اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیری سے لیکر اس سلسلے کے کئی بزرگ اور پھر خود ان کے خلفاء خواجہ

---

[۱] ملاحظہ ہو اورنٹیل کالج میگزین

[۲] یہ امیر خسرو کے بڑے گہرے دوست تھے۔

بندہ نواز اور نصیر الدین چراغ دھلوی اس نوخیز زبان میں گفت و شنید اور تکلم و تفہیم فرماتے تھے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ان ملفوظات میں آپ سے منسوب کوئی جملہ نظر نہیں آتا۔ البتہ حضرت ہاشم حسینی العلوی کے ملفوظ "مقصود المراد" میں ایک جملہ ملتا ہے۔ حضرت ہاشم حسینی حضرت شیخ نظام الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اقوال دہراتے ہیں:

"چہ خوش گفتار شاہِ نظام است" "نظام کرتا آپ کرتار" [1]

اس قول کے بارے میں حکیم شمس اللہ صاحب قادری[2] کا خیال ہے کہ یہ ملفوظ حضرت نظام الدین کا نہیں بلکہ ہاشم حسینی العلوی کے کسی مرید نظام الدین نامی کا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ حضرت شیخ نظام الدین ہی کا ملفوظہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ جس ادب و احترام سے حضرت ہاشم حسینی نے ان کا تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرت ہاشم کے پیرِ طریقت ہی ہیں، نہ کہ ان کے شاگردوں میں سے کوئی اور۔

نصیر الدین چراغ دہلوی
۷۵۲ھ

اس عہد کے دوسرے مشہور بزرگ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی ہیں۔ خواجہ نصیر الدین، حضرت نظام الدین کے خلیفہ اعظم اور حسینی سید تھے۔ ان کا وطن لاہور تھا۔ لیکن خواجہ نصیر الدین کی ولادت اودھ میں ہوئی۔ وہ بڑے زاہد اور جید عالم تھے۔ اسی بنا پر حضرت نظام الدین محبوب الٰہی نے انھیں "چراغ دہلوی" کا خطاب دیا تھا۔ ان کی عوام میں مقبولیت کی وجہ سے بادشاہِ وقت محمد تغلق کو ان سے ڈر پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے ان کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ان کے ملفوظ "خیر المجالس" میں کئی نثر پارے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنی کتاب "تاریخ زبانِ اردو" میں ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں "علی مولا بدایونی، حضرت نظام الدین کے متعلق جو اس وقت سنِ بلوغ کو پہونچ چکے تھے۔ یہ پیشین گوئی

---

[1] ملاحظہ ہو ملفوظہ ہاشم حسینی العلوی صفحہ ( )

[2] ملاحظہ ہو "اردوے قدیم" طبع سوم صفحہ ( )

Hanif Razvi

فرماتے ہیں :

"علی مولا چوں دید آغاز کرد بہ زبان ہندی" ارے مولانا یہ بدا ہوسی"
یعنی اے مولانا ایں مرد بزرگ خواہد شد" مولانا علاوالدین گفت "علی از کجا می گوئی" "گفت" "من درا ودو چیزے می بینم یکے آن است کہ بہ زبان ہندی گفتند" :

"جو منڈاسا بندی سو پائین بسری"

یعنی "آں کہ دستار بر سر بندد او در پائے کسے افتد"

اس میں ایک اور جملہ اس طرح درج ہے :

"فرمودند کہ در عہد موسیٰ بُت پرستی بود روزے اورا تب آمد بر سرپائے بت سر نہاد و گفت ۔

"تو مرا گسائیں تو میرا کرتار مجھ اس تاپ تھیں چھڑا[1] ہیچ جواب نیامد"

اس کے علاوہ ان کا ایک اور مقولہ ملتا ہے جو انھوں نے اپنے مرید شیخ اخی سراج کو بنگالہ جانے کی ترغیب دیتے وقت کہا تھا جس وقت حضرت نصیر الدین نے شیخ اخی کو بنگالہ جانے کا حکم دیا تو شیخ نے جواب دیا" وہاں حضرت علاوالدین موجود ہیں ان کی موجودگی میں میرے جانے کی ضرورت نہیں اس پر انھوں نے ہندی میں جواب دیا :

"تم اوپر وے تل" [2]

شاہ بوعلی قلندر پانی پتی
۷۲۴ھ ہجری

شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی حضرت امام اعظم کی اولاد میں سے تھے اور اپنے وقت کے یگانہ روزگار سمجھے جاتے تھے ۔ وہ فارسی میں تصانیف کثیرہ کے مالک تھے فارسی میں ان کی مندرجہ ذیل تصانیف مشہور ہیں " جامع علم توحید" " رسالہ حکمنامہ" کچھ عارفانہ

---

[1] "تاریخ زبان اردو" صفحہ (۱۴۲) [2] "اردوئے قدیم" طبع دوم صفحہ (۲۳)

مثنویاں اور چند فارسی مکتوبات جو انھوں نے اپنے مرید اختیار الدین کے نام لکھے تھے۔[1] اُردو میں ان کی کوئی تصنیف یا تالیف نہیں ملتی۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب میں مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا اور ایک مقولہ اور دوہا دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ امیر خسرو نے ان کو اپنا گانا سنایا جس کو سن کر وہ بہت خوش ہوئے اپنا بھی کچھ کلام سنایا اسے سنکر امیر خسرو بہت آبدیدہ ہوئے، حضرت نے فرمایا "ترکا کچھ سمجھ دا ہے" امیر خسرو نے کہا، اسی لیے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھا"

مندرجہ ذیل دوہا بھی ان ہی سے منسوب کیا جاتا ہے:

"سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کہ بھور کدھی نہ ہووئے"[2]

شرف الدین یحییٰ منیری
۶۶۲ھ تا ۷۶۲ھ

شیخ شرف الدین کا تعلق بہار کے مشہور صوفی خاندان سے تھا[3] شیخ کے دادا حضرت تاج فقیہہ بیت المقدس سے ۵۷۶ھ میں منیر شریف تشریف لائے۔ منیر کی "تاج شاہی" مٹھائی ان ہی کے عہدِ شیریں کی یادگار آج تک بھی خاص وعام کے دل پسند ہے۔ ان کے تین فرزند اسرائیل، عبدالعزیز اور اسمٰعیل وہیں رہ بس گیے۔ جناب اسرائیل حضرت مخدوم یحییٰ منیری، کے والد ماجد تھے۔ ان کی شادی پیر شہاب الدین، "جگ جوت" کی لڑکی سے ہوئی۔ اور ان ہی کے بطن سے شرف الدین یحییٰ منیری پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے علم وفضل کا حال سُن کر بیعت کے ارادے سے دہلی گیے۔ لیکن وہاں جاکر نجیب الدین فردوسی کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگیے۔ کیونکہ اس وقت سلطان المشائخ کا انتقال ہوگیا تھا۔ بیعت کے بعد وطن کا قصد کیا اور راستے میں کئی دن عبادت وریاضت میں مصروف رہے۔ ان کے زہد واتقا، کا دور دور تک چرچا تھا۔ انھوں نے ایک بزرگ سید اشرف جہانگیر سمنانی،

---

[1] "اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۳۱) [2] اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۳۱)
[3] خزینۃ الاصفیا" صفحہ ۱۸۶، نیز مضمون "بہار میں مثنوی نگاری" از افسر اورینوی مطبوعہ "ساقی" کراچی، مارچ ۱۹۵۲ء

Hanif Raza

کے ہندوستان آنے کی پیشین گوئی کی تھی۔

تصانیف

فارسی میں ان کی دو کتابیں "ارشاد السالکین" اور شرح "آداب المریدین" بیان کیجاتی ہیں۔ پروفیسر حسن عسکری استاد تاریخ پٹنہ کالج نے اپنے مضمون "قرونِ وسطیٰ کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت" مطبوعہ سالنامہ "ساقی" ستمبر ۱۹۵۲ء (پٹنہ) میں ایک اُردو نثری قلمی نسخہ کی اطلاع دی ہے اور اسے حضرت شرف الدین یحییٰ منیری سے منسوب کیا ہے۔ گو یہ اس وقت ہماری دسترس میں نہیں لیکن ان کا اس زبان میں رسالہ یادگار چھوڑنا ناممکن نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ان کا بہت سا اُردو کلام دوہروں، کہ مندروں، اور عمل کی شکل میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ ان کے مریدِ خاص زین بدر عربی نے ۷۴۹ھ میں "معدن المعانی" کے نام سے ان کے ملفوظات کا مجموعہ تالیف کیا تھا۔ اس ملفوظ نیز دوسرے صوفیوں کے ملفوظات سے اس عہد کی زبان کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے "معدن المعانی" سے اپنی تصنیف "نقوشِ سلیمانی" میں ان کے چند نثر پارے اور آنکھوں کی تکلیف دور کرنے کا ایک منظوم نسخہ بھی نقل کیا ہے۔ نسخہ یہ ہے :

"لودھ پھٹکر مردہ سنگ ؛ ہلدی، زیرہ ایک ایک ٹنک
افیون، چنا بھر مرچیں چار ؛ ارد بھر موتھا اسمیں ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے ؛ نینا پیر ا پل میں ہرے" [۱]

اس نسخہ کو یحییٰ تنہا صاحب مصنف "سیر المصنفین" نے خسرو سے منسوب کیا ہے لیکن تنہا صاحب نے خسرو کی کسی تصنیف کا حوالہ نہیں دیا۔ اس لیے ندوی صاحب ہی کا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ "معدن المعانی" سے سید سلیمان ندوی نے کچھ اُردو کے فقرے بھی نقل کیے ہیں۔ لکھتے ہیں :

'خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی کے عرض کرنے پر کہ

"بہ زبان ہندوی نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است" بات بھلی پر سانہ کرے"

---

[۱] نقوشِ سلیمانی صفحہ ۴۸

حضرت شیخ نے اس کی تائید میں فرمایا :

"بعد ازاں بندگی مخدوم عظمہ الہ برزبان مبارک راند" دیس بھلا پردور" [1]

اسی واقعہ کو پروفیسر حسن عسکری اپنے مقالہ "شمالی ہند کے صوفیائے کرام کی ہندی دوستی" مطبوعہ معاصر" جلد (۲) میں دوہرے کی شکل میں مظفر بلخی کے مکتوب سے منقول کرتے ہیں، دوھرہ یوں ہے :-

"باٹ بھلی پر سانکری نگری بھلی پر دور ؛ ناہہ بھلا پہ پاقلا کرھر جوز"

"نقوش سلیمانی" میں ندوی صاحب نے دیسنہ ضلع پٹنہ کے کتب خانہ اصلاح میں مخزونہ حضرت شرف الدین یحیٰی منیری کے ایک فالنامہ کا بھی ذکر کیا ہے جو ستائیس فقروں پر مشتمل ہے چند اردو فقرے حسب ذیل ہیں :-

۱۔ جو من کی منسی کیا ہوئی سو ہوئی

۲۔ ناہیں کچھ کرو نصیب لاگی بات ہے

۳۔ راج پاٹ چل کے دیا تمکون

۴۔ آگے برے دن گیے اب سکھ پاؤگے [1]

ایک کچ مندرہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے جس کا ذکر پروفیسر عبد الغنی نے اپنی تصنیف "پرشین لنگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ" میں کیا ہے۔ ڈاکٹر عبد الحق نے اپنی تصنیف "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں ان کے چند دوہرے نقل کیے ہیں۔ گو یہ اس مقالے کے موضوع سے راست تعلق نہیں رکھتے تاہم زبان کا اندازہ کرنے کے لیے نقل کیے جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل دوھرے میں شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کا نام بھی آیا ہے :

"شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے ۔ گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے" [2]

---

[1] "نقوش سلیمانی" صفحہ ۹۴

[2] "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۲۰

اشرف جہانگیر سمنانی

۷۰۸ھ – ۸۰۸ھ

اشرف جہانگیر سمنانی، صوفی کامل اور زاہد باعمل تھے۔ ان کے والد سلطان ابراہیم سمنان کے بادشاہ تھے۔ والد کی وفات کے بعد سید اشرف جہانگیر نے کچھ دنوں تک امور سلطنت کی دیکھ بھال کی، پھر تخت و سلطنت چھوڑ کر فقیر ہو گیے۔ سات سال کی عمر میں انھوں نے قرآن حفظ کیا۔ اور چودہ سال کی عمر تک علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کر لی جب وہ چودہ سال کے ہوئے تو والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے اپنی مرضی کے خلاف لوگوں کے مجبور کرنے پر تاج و تخت قبول کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پھر سب کچھ چھوڑ کر شیخ رکن الدین علاؤالدین سمنانی اور دوسرے عالموں اور زاہدوں سے ربط پیدا کیا۔ ۲۳ سال کی عمر میں وہ ہندوستان آئے اور پہلے واچھ (سندھ) میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی خدمت اقدس میں گیے۔ پھر وہاں سے دھلی چلے گیے۔ جہاں علما اور فاضلین وقت جمع تھے۔ دھلی سے شیخ علاؤالدین علاؤالحق بنگالی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے ان کی بہت عزت و تکریم کی اور خرقۂ خلافت عطا کرنے کے بعد جونپور جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے جواب دیا، وہاں ایک شیر ہے، میں ان سے کیسے بسر آسکتا ہوں۔ (شیر سے ان کی مراد شیخ رکن الدین ابوالفتح۔ یعنے بہاؤالدین ذکریا ملتانی کے نبیرہ سے تھی)۔

شیخ نے جواباً کہا "تم خود شیر ہو تمہیں کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے"، مطلب یہ کہ علم و فضل میں تم کسی سے کم نہیں۔ کیفیت یہ تھی کہ جہاں سے وہ گزرتے بڑے بڑے علماً و فضلا آکر قدمبوس ہوتے تھے۔ اثنائے سفر میں ایک مقام پر خلفائے راشدین پر بحثیں ہو رہی تھیں کیونکہ انھوں نے ایک رسالہ خلفائے راشدین کی مدح میں لکھا تھا اور اس میں حضرت علیؓ کو دیگر صحابائے کرامؓ پر کسی قدر فوقیت دی تھی۔ اس بنا پر عوام کو ان پر شیعہ ہونے کا شبہ ہوا۔ لیکن بعد میں لوگ ان کے علم و فضل کے قائل ہو گیے۔ شہر جونپور کی سیر کے بعد کچھوچھہ (اودھ) گیے، وہاں کچھ دن قیام کے بعد شیخ بدیع الدین کے ہمراہ حرمین شریفین، مدینہ منورہ، نجف اشرف وغیرہ کی زیارت کی۔ واپسی میں اپنے وطن سمنان بھی گیے۔ وہاں سے کابل، غزنی قندھار اور ترکستان کا سفر کیا۔ اجمیر اور اجودھن میں خواجہ معین الدین اجمیری اور بابا فرید گنجشکر

کے مزاروں کی زیارت کی پھر گجرات اور گلبرگہ بھی گیے۔ گلبرگہ میں خواجہ بندہ نواز کے ہاں کچھ روز قیام کرنے کے بعد کچھوچھ جاکر مقیم ہوگیے اور وہیں ۸۰۸ھ میں وفات پائی ۔ ۱؎

تصانیف

انھوں نے فارسی میں بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ حامد حسن قادری مصنف "داستان تاریخ اردو" کے بیان کے بموجب انھوں نے اردو نثر میں ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ (جس کے بارے میں آگے تفصیل دی گئی ہے) ان کے ملفوظ "لطائف اشرفی" ۲؎ میں کئی اردو مقولے اور الفاظ ملتے ہیں۔ اسی ملفوظ میں ایک حکایت اس طرح آئی ہے:-

"سید اشرف جہانگیر سمنانی جب ردولی سے گزر رہے تھے اس کے قریب گاؤں میں مولانا میں مولانا کریم الدین دانشمند رہتے تھے۔ سید موصوف ان سے ملنے جانے لگے تو کسی نے مولانا کو جاکر اطلاع دی۔ انھوں نے فرمایا "ہی ہی" حضرت ایشان را نشاید کہ در خانہ من بیائند ایشان بسیار مرد بزرگ اند" وشل ہندوی فرمودند کہ

"بھیری کے منہ کھنڈ سمائے"

ان کے ملفوظ میں سانپ بچھو کے کئی منتر اور دواؤں کے کئی نسخے بھی ملتے ہیں جو اردو میں ہے کچھ ہندی الفاظ بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ جیسے 'چونا'، 'کبھی' وغیرہ "لطائف اشرفی" ہی میں ذیل کے واقعہ کے سلسلے میں ایک اور فقرہ بھی ملتا ہے۔

شیخ راجا نامی ایک بزرگ زہد و اتقا میں بڑے مشہور تھے۔ وہ کوئی کام خلافِ شرع نہ کرتے تھے۔ ایک دن حضرت مخدوم ایک مجذوب ابراہیم نامی سے ملنے تشریف لے گیے۔ شیخ راجا بھی ہمراہ تھے۔ ابراہیم نے جو تارک الصلوٰۃ تھے۔ سید موصوف کو کھانے پر مدعو کیا۔ سید موصوف شریک طعام ہوگیے۔ ابراہیم

۱؎ "خزینۃ الاصفیا" صفحہ (۳۹۷) ۲؎ "لطائف اشرفی" مطبوعہ نصرت المطابع دہلی صفحہ (۳۰۸، ۴)

Hanif Razvi

نے پوچھا آپ کا دوسرا ساتھی (مراد شیخ راجا) کہاں ہے۔ اسے بھی بلا لیجیے اس پر راجہ نے جواب دیا "میں تاریک الصلوٰۃ کے ساتھ ہم طعام ہونا نہیں چاہتا" مجذوب کو بہت غصہ آیا اور اسی غصہ میں ان کے تکیہ کھینچ مارا۔ جب حضرت مخدوم نے آگے بیچ بچاؤ کیا تب مجذوب کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ حضرت نے شیخ سے پوچھا راجہ تم نے یہ کیا کم عقلی کی جو کھانا نہیں کھایا، اس پر شیخ راجہ نے جواب دیا:

"عجیب مردمان اند و بہ زبان ہندی گفت

"بی پرکھ آپنہ الیسوں کہنہ آپتے ویسوں کہنہ [1] "

وہ متبسم ہوئے اور کہا عقیدہ اور طلب اس مرتبہ تک ہونی چاہیے کہ ناممکن اور ممکن میں تمیز ہو سکے۔ "تاریخ فیروز شاہی" از ضیائے برنی اور "تاریخ فیروز شاہی" از سراج عفیف میں بہت سے الفاظ اور مقولے ملتے ہیں پہلا تو وہ مشہور معروف جملہ ہے جس کی تذکرہ نگاروں نے طرح طرح سے تشریح کی ہے۔

محمد تغلق نے ۷۵۲ھ میں سندھ کے دار الخلافہ ٹھٹھہ پر فوج کشی کی اور اس حملہ میں مارا گیا اس سے دس سال پہلے بھی اس نے سندھ پر ایک ناکام حملہ کیا تھا اور اس میں ناکامی کے بعد گجرات کا رخ کیا تو سندھیوں نے جو جملہ کہا تھا، وہ مختلف طریقوں سے پیش کیا گیا ہے ہاشمی فریدآبادی نے اپنے مضمون "اُردو کی حقیقت تاریخ سے" میں اس جملے کو اس طرح لکھا ہے،

"برکت شیخ پٹھا ایک موا ایک نٹھا"

لیکن بعض اور علماء نے اسے مختلف صورت میں پیش کیا ہے۔ شمس سراج عفیف[2] کی تاریخ میں جو کلکتہ سے چھپی ہے "پٹھا" کے بجائے "تھیا" نیز "نٹھا" کی بجائے "نھیا" درج ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی[3] اور مولانا سلیمان ندوی اس کو اس طرح پڑھتے ہیں:۔

۱۔ "لطائف اشرفی" صفحہ ۴۰۹ نیز ملاحظہ ہو "معاصر" جلد ۴ صفحہ ۸۵۰، اس میں "لیئو پرکھیو آپن ویسوں کہنہ الیسوں کہنہ"

۲۔ "تاریخ فیروز شاہی" مصنفہ شمس سراج عفیف صفحہ (۲۳۱)

۳۔ "پنجاب میں اُردو" صفحہ (۷۹)

Hanif Raza

"برکت شیخ تھیا ایک موا ایک نھیا" [۱]

سیّد ہاشمی فرید آبادی اس کو جس صورت میں پیش کرتے ہیں اس کے جواز کے طور پر وہ یہ تفصیل دیتے ہیں:

"شیخ حسین المعروف بہ شیخ پٹھا (متوفی ۶۰۶ھ) ٹھٹھہ کے نامی بزرگ تھے۔ آخری لفظ "نھا" کے بجائے "بروزن 'پٹھا' یا 'نٹھا' زیادہ قرینِ قیاس سمجھتے ہیں۔ "ناٹنا" اور "انٹھنا" دہلی کے مضافات میں پلٹ جانے یا مکر جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور پنجابی و گجراتی میں بھاگ جانے کے معنی میں آیا ہے۔

زین الدین خلد آبادی
۷۰۱ھ تا ۷۷۱ھ

ان کا نام سیّد داؤد حسین تھا۔ ۷۰۱ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں حج کیا۔ واپسی میں ہندوستان آئے جس وقت محمد تغلق نے دہلی والوں کو دولت آباد جانے کا حکم دیا۔ مولانا زین الدین بھی کمال الدین سامانہ کے ساتھ دولت آباد آئے۔ یہاں آکر برہان الدین اولیا کے ہاتھ پر ۷۳۶ھ میں بیعت کی۔ یہ اپنے وقت کے بڑے جیّد عالم تھے۔ ۷۷۱ھ میں خلد آبادہی میں انتقال ہوا۔ ان سے ایک اُردو جملہ منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے وقتِ آخر جب اُن کے مرید نصیر الدین بدھری نے کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کے لیے وصیت کرنے کی خواہش کی تو منہ پھیر کر قبلہ رو ہوئے اور اُردو میں کہا:

"منجہ مت بلا وہ" [۳]

مخدوم جہانیانِ جہاں گشت
متوفی ۷۸۵ھ

حضرت مخدوم جہانیانِ جہاں گشت "قطبِ عالم" اور "شاہِ عالم" اس عہد کے آخری بزرگ ہیں۔ جن کے اُردو اقوال دستیاب ہوتے ہیں اور انھیں پر یہ عہد ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت مخدوم شاہ راجو قتال کے حقیقی بڑے بھائی اور شیخ احمد کبیر کے فرزند تھے۔ یہ بڑے باکمال بزرگ تھے۔ ان کی بزرگی کا اعتراف سیّد اشرف جہانگیر سمنانی نے بھی کیا ہے۔ شیخ

---

[۱] "نقوش سلیمانی" صفحہ ۴۶۔ [۲] "اُردو کی حقیقت تاریخ سے" رسالہ اُردو، جلد ۳۲ نمبر ۱، ۲
[۳] "روضتہ الاقطاب" مصنف رونق علی صفحہ ۲۱۴

شیخ امام الدین سے خرقۂ خلافت لینے کے بعد مصر شام عراق بلخ بخارا اور خراسان کا سفر کیا۔ مکہ میں ان کے ہمراہ امام عبداللہ یافعی تھے۔ جنھوں نے نصیر الدین چراغ دہلی کے متعلق ان سے فرمایا تھا کہ "چراغ دہلی است" ان کے بھائی راجو قتال (والد حضرت خواجہ بندہ نوازؒ) بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ تغلق تاجداروں کے سر ان کی چوکھٹ پر جھکتے تھے۔ مخدوم جہانیانِ جہاں گشت دو تین مرتبہ دھلی بھی آئے۔ دوسرے بھائی ہمیشہ یادِ الٰہی میں غرق رہتے تھے۔ جب فیروز تغلق خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت نے فرمایا:

"کاکا فیروز چنگا ہے"

بادشاہ نے اسی پرسشِ حال کو موجب افتخار سمجھا۔

پروفیسر سید حسن عسکری نے اپنے مضمون "بہار کے ایک شطاری صوفی"[1] میں امام الدین راجگیری کے قلمی ملفوظ" اور "اوراد امام الدین راجگیری" کے حوالے سے مخدوم جہانیاں کا ایک اور قصہ بھی لکھا ہے:۔

کسی نے مخدوم جہانیانِ جہاں گشت سید جلال الدین سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ وہی اوراد اور اعمال ہیں جو وہ بھی پڑھتا اور کرتا ہے جو خود مخدوم لکھتے اور کرتے ہیں لیکن اس کو اس کا خاطر خواہ جواب نہیں ملتا۔ اس پر مخدوم صاحب نے جواب دیا:

"کھانڈا ہے پھانڈا کہاں"

یعنی "خندق تو موجود ہے اس سے نکلنے کا ذریعہ کہاں ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے سچے عرفان کی کمی ہے۔ پروفیسر حسن عسکری نے لکھا ہے کہ امام الدین راجگیری کے ملفوظ "اوراد امام الدین راجگیری" میں اور بھی بہت سے ہندی جملے ملتے ہیں لیکن مجھے اس ملفوظ کے دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔

۱۔ "A [illegible] century Shuttari Sufi saint of North Bihar" مطبوعہ جرنل انڈین ہسٹری کانگریس منعقدہ ناگپور ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۵۱

Hanif Razvi

قطبِ عالم
سنہ ۷۹۰ھ تا سنہ ۸۵۷ھ

سید برہان الدین قطب عالم۔ سید جلال الدین جہاں گشت کے پوتے تھے۔ ان کا تھوڑا سا حال مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تصنیف "اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں لکھا ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت مخدوم جہانیاں کے چھوٹے بھائی اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے والد سید راجو قتال کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ مولانا عبدالحی نے "گلِ رعنا" [1] میں لکھا ہے کہ موصوف بچپن میں اپنے ننھیال بٹوہ (گجرات) چلے آئے تھے۔ وہاں 'قطبِ عالم' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام سراج الدین محمد بن عبداللہ تھا اور 'شاہِ عالم' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ دونوں باپ بیٹے اپنی خاندانی بزرگی و عظمت کے ساتھ خود بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ گجرات کے بادشاہ ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ جب وہ بٹوہ میں مقیم تھے۔ ایک رات نمازِ تہجد کے لیے اٹھے۔ صحن میں ایک لکڑی پڑی ہوئی تھی، اس سے ٹھوکر لگی پاؤں میں چوٹ آئی اور خون بہنے لگا اس وقت ان کی زبان سے یہ کلمہ نکلا۔ جسے پروفیسر عبدالغنی نے اپنی تصنیف "پرشین ... ایٹ دی مغل کورٹ" میں "مراۃ اسکندری" کے حوالہ سے اس طرح نقل کیا ہے:

"لوہ ہے یا لکرھے یا پتھر ہے یا کیا ہے" [2]

لیکن "اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں "تحفۃ الکرام" کے حوالے سے یہ جملہ یوں منقول ہے:

"لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے"

سراج اورنگ آبادی کے پیرِ طریقت سید عبدالرحمن چشتی کی تصنیف "مرات الاسرار" میں ایک اور واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ سندھ کے حاکم جام جالونے اپنی دو لڑکیوں میں سے ایک کی نسبت شاہ عالم (فرزند قطب عالم) سے اور دوسری کی محمد شاہ، بادشاہ گجرات سے کی تھی۔ جس لڑکی کی نسبت شاہِ عالم سے ہوئی تھی۔ وہ حسن و جمال میں اپنی بہن سے

---

[1] تذکرہ "گلِ رعنا"۔ صفحہ ۱۴
[2] "پرشین ... ایٹ دی مغل کورٹ" صفحہ ۸

بہتر تھی۔ محمد شاہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے حاکمِ سندھ پر دباؤ ڈال کر نسبت بدلوا دی۔ شاہِ عالم کو یہ سُن کر ملال ہوا۔ انھوں نے باپ سے اس کی شکایت کی۔ اس وقت قطبِ عالم کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا :

"بیٹے تسا نصیب ڈھون دیجہ"[1]

اس واقعہ کو مولانا عبدالحی نے "گُلِ رعنا" (دونوں) میں بھی نقل کیا ہے۔[2]

شاہ عالم
سنہ وفات ۸۸۰ھ

یہ قطبِ عالم کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ نام سراج الدین تھا لیکن شاہِ عالم کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کو یہ خطاب شاہ بارک اللہ چشتی نے دیا تھا۔ جو حضرت نظام الدین اولیا کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ایک بار انھوں نے بے اختیاری میں ان کو "شاہِ عالم" سے مخاطب کیا۔ اسی وقت سے ان کا یہ خطاب مشہور ہو گیا۔ شاہ عالم نے جب یہ واقعہ اپنے والد قطب عالم سے بیان کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا :

چشتیوں نے پکائی اور اسے بخاریوں نے کھائی"

ان کے ملفوظ "جمعات شاہی" میں ایک اور واقعہ مذکور ہے[3] کہتے ہیں:

ایک روز شاہِ عالم کہیں جا رہے تھے۔ ان کے صاحبزادے مخدوم شاہ (احمد) بھی ہمرکاب تھے سلطان شاہ بیاد شاہِ گجرات کا بھی اسی وقت اس طرف سے گزر ہوا۔ اس نے سلام نہیں کیا آپ کے صاحبزادے نے شاہِ عالم کو اس کے غرور کی طرف توجہ دلائی تو ہندی میں جواب دیا۔

"ارجن جی کارونہ بہایا ہوئے تو تجھ سے فقیروں کی پرسوں تین کناسی کرے"

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں "اُردو" عام طور پر استعمال ہونے لگی تھی۔

حضرت شاہِ عالم کے بعد بھی کئی علما اور بزرگانِ دین جیسے سید محمد جونپوری۔

---

[1] "مراۃ الاسرار" کتب خانہ روضتین۔ گلبرگہ [2] "گُلِ رعنا" صفحہ ۱۲۷
[3] تحفۃ الکرام صفحہ ۱۴۱، و "اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ (۲۰)

Hanif Razvi

بہاؤ الدین باجن، حضرت ہاشم حسینی، شاہ علی جیو گام وہی ذہنی۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی۔ شاہ محمد غوث گوالیاری، وجیہہ الدین احمد علوی وغیرہ کے مقولے اور ملفوظات بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ بزرگ آٹھویں اور نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔

مذکورہ بالا بزرگوں میں سے کئی ایسے ہیں جن کی تصانیف اُردو نظم و نثر کی شکل میں بھی ملتی ہیں۔ کیونکہ ان بزرگوں کو "زبانِ ہند" سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا ثبوت پندرھویں صدی عیسوی کی ایک تصنیف "مناقب محمدی"، سے ملتا ہے۔ اس کے مرتب علی شیر شیرازی، حضرت سید محمد اجہری کے خاص مرید تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے ہندی زبان کی خصوصیت کے متعلق گفتگو کی، جس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"عرض داشتیم یا سیدنا تا در لغات ہند از ہر زبان ہا حروف بیشتر است چنانچہ کسے غیر از مردان ایں اقلیم نہ تواند ہمہ حروف ایں در بار ادا نمود مثل ایمان کہ بہ سخت ترین زبان گویا نند ...... فرمود مہتر آدم را خدا از بہشت در سراندیل افگند و او بہ ہر زبان ہا واقف بود فرزندان ابو البشر بعضے یک لغت اخذ کرد و بعضے دو چہار لغت تا نوح۔ او نیز از ہمہ زبان ہا تکلم کردی۔ واز قبیل ہا برخاست و ہر یکے زبانے آموختہ بہ ملکے استقامت کرد۔ آن زبان منسوب بہ آن ملک شد۔ ہر گاہیکہ از ہند ہمہ لغت بیرون گشتہ۔ رومی و فارسی زبان ہا وغیرہ ہمانا نام زد شدند۔ زین موجب ہندیان می توانند، ہر زبان بیاموزند مانند صاحب زبان آن و دیگران را گو بہ ہندی رغبت افتند چنانکہ نگوید کہ زادہ ہند گوید" ؎

؎۔ ملاحظہ ہو مضمون نوشتہ پروفیسر حسن عسکری۔ "شمالی ہند کے صوفیائے کرام کی ہندی دوستی" مطبوعہ معاصر پٹنہ (۹)

Hanif Razvi

اس گہری دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے "لغاتِ ہند" میں اپنے وہ یادگار کارنامے چھوڑے۔ جن کا ذکر آنے والے ابواب میں اپنے موقع سے آرہا ہے ؏

Hanif Razvi

۳

مربوط نثر کی شروعات

زبان کے ارتقا میں تاریخی جبریت اُردو نثر کی ابتدا کے متعلق مختلف آرا، آزاد کی رائے۔ محمد یحییٰ تنہا کی رائے (فضلی کی کربل کتھا)۔ ڈاکٹر عبدالحق اور احسن مارہروی کے نظریے (بندہ نواز کی معراج العاشقین) حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر زور کی رائے (گنج العلم کے رسالے)۔ حامد حسن قادری کی تحقیق رسالہ تصوف مصنفہ اشرف جہانگیر سمنانی۔ اُردو نثر کا آغاز جدید مواد کی روشنی میں "رسالہ جنونیہ"۔ "جنونیہ" اور "ہفت اسرار"۔ رسالہ تصوف مصنفہ راجو قتال۔ راجو قتال اول و راجو قتال ثانی۔ راجو قتال اول کی دیگر تصنیفات "سہاگن نامہ" اور دیوان۔ راجو قتال کی تصنیف کے متعلق مزید شہادتیں ÷

Hanif Raza

66192

۳

مربوط نثر کی شروعات

چھٹی صدی ہجری کے آغاز سے لیکر ساتویں صدی ہجری تک کے جو ملفوظات یا اقوال پیش کیے گیے ہیں ان کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اردو عوام کی بول چال کی زبان ہونے کی حیثیت سے فارسی کے مستند مصنفین اور خاص طور پر اہلِ ارشاد و ہدایت پر اپنا اثر ڈالنے لگی تھی۔ یہ زمانہ دہلی میں مملوک بادشاہوں کے سلسلے کے اختتام اور خلجی خاندان کے ہندوستان میں تسلط کا زمانہ تھا۔

خلجیوں نے سنہ ۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۰ء (سنہ ۶۹۰ھ تا ۷۲۰ھ) تک حکومت کی۔ اس اثنا میں نہ صرف حدودِ سلطنت میں وسعت پیدا کی بلکہ اس تہذیبی اور لسانی سرمایہ میں انھوں نے اپنے پیش رو حکمرانوں سے حاصل کیا تھا، اضافہ کیا اور اس کو سارے ہندوستان میں پھیلایا۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں دکن بھی پہلی مرتبہ دہلی کے تسلط میں آیا۔ ان حکمرانوں نے اس زبان کو جسے انھوں نے اپنی زبان چھوڑ کر اختیار کیا تھا۔ ہندوستان میں تبادلۂ خیال کے لیے اتحاد کی ضرورت سے سارے ملک میں ایک زبان کی حیثیت سے پھیلایا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی لسانی شواہد کی بنا پر لکھتے ہیں :-

> "مسلمان حکمرانوں کے پے در پے سلسلوں اور دہلی کے عہدہ داروں اور دیگر لوگوں کے ذریعے اس زبان کو صوبوں میں مشرق، مغرب، شمال و جنوب ہر ایک سہولت بخش مشترک زبان کے طور پر پھیلنے میں مدد ملی" [۱]

۱۔ دی آریجن اینڈ ڈولپ منٹ آف دی بنگالی لینگویج مقدمہ صفحہ ۱۲

اپنی دوسری تصنیف "انڈو ایرین اور ہندی" میں بھی انھوں نے اسی خیال کا اعادہ کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

"یہ دکن تھا جس نے شمالی ہند کے لیے ادب کا نمونہ چھوڑا اور برج بھاشا (جو علاقہ واری) زبان تھی، کے برعکس خاص ہندی اور ہندوستانی کی ترویج کی۔" ۲

اصل میں شمالی ہندوستان سے مسلمان آکر جوق در جوق دکن کے تلنگی، مرہٹی اور کنڑی بولنے والے علاقوں میں اپنے قدم جما رہے تھے اور انھیں اس مقصد کے لیے ایسی زبان کی ضرورت تھی جو سب کی سمجھ میں آسکے۔ اس طرح یہ ہند آریائی بولی ۱۲۹۴ء کے قریب دراوڑ دیس میں بھی پہنچ گئی۔

محمد تغلق ۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء (۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ) نے جب ۱۳۲۸ء (۷۲۷ھ) میں دہلی کے بجائے دیوگڑھ کو اپنا پایہ تخت بنایا تو دہلی کی حکومت کی ساری کل اپنے تہذیبی اور لسانی سرمایے کے ساتھ دکن میں منتقل ہو گئی۔ دہلی کے نظم ونسق کے اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ جتنے متوسط اور ادنیٰ طبقے کے لوگ دکن آئے وہ اسی زبان کے ابتدائی ہیولیٰ کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کے علاوہ دکن کے دہلی کا جزبن جانے کے بعد شمال سے عام لوگوں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں کی آمد و رفت کا سلسلہ بہمنی سلطنت کے قیام ۱۳۴۷ء (۷۴۷ھ) تک جاری رہا جس کی وجہ سے دکن کا اس ہند آریائی بولی کے ساتھ ربط اور بھی استوار ہوتا گیا۔

مسلمانوں کے تعلقات اہلِ ہند سے جیسے جیسے وسیع ہوتے گیے انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اس ملک کے بسنے والوں کے خیالات سے واقف ہوں اور جو نیا فکری اور اعتقادی سرمایہ وہ خود اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس سے اہلِ ملک کو واقف کرائیں اس مقصد کے لیے انھیں سوائے اس زبان کو اختیار کرنے کے کوئی اور چارہ نہیں تھا چنانچہ مولوی عبدالحق اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اردو کی ابتدائی تصنیفات کا محرک اسلام کے عقاید اور تصوف کے مسائل

کو ہندوستان کے عوام اور خاص طور پر نومسلموں کو سمجھانے کی ضرورت اور خواہش تھی "۔ [1]

اس لیے اس دور کی تحریروں پر مذہبی عنصر غالب دکھائی دیتا ہے نومسلموں اور خاص طور پر عورتوں کی مذہبی تعلیم ان کا ایک مقدس فریضہ بھی تھا۔ ان کے لیے عربی، فارسی کا استعمال ممکن نہ تھا۔ اس لیے ان بزرگوں کو یہ مخلوط زبان اختیار کرنی پڑی۔ اس طرح یہ بولی بولی خاص ارادہ اور شعور کے بغیر ایک سماجی ادارہ کی حیثیت سے تاریخی جبریت (Historical - Determinism) کے اصول کے تحت نشوونما پاتی اور پھیلتی گئی۔ اس عوامی بولی کو عوام کی خدمت، ان کی ذہنی تربیت اور ان کے قریب تر آنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ یہی بڑے اور فطری محرکات تھے جنھوں نے اُردو نثر کی داغ بیل ڈالی۔

چنانچہ اُردو مربوط نثر کے ابتدائی آثار ہم کو ایسے بزرگوں ہی کی تحریروں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ جو اپنے زمانے میں ارشاد و ہدایت کا کام کرتے تھے۔

اُردو نثر کی ابتدا کے متعلق مختلف رائیں

اُردو تذکرہ نگاروں میں سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے اپنی معرکتہ الارا تصنیف "آبِ حیات" میں جہاں اُردو نظم کا سہرا ولی دکھنی کے سر باندھا ہے۔ نثر کے اولین رسالے کے مصنف کی حیثیت سے وہ فضلی کو پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

"محمد شاہ کے عہد ۱۱۴۵ھ میں ایک بزرگ تھے جن کا تخلص فضلی تھا انھوں نے "دہ مجلس" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ غالباً یہی اُردو کی پہلی تصنیف ہوگی۔" [2]

محمد حسین آزاد کے بعد محمد یحییٰ تنہا مصنف "سیر المصنفین" [3] اور عبدالحئی مصنف "گل رعنا" [4] نے بھی فضلی کی "کربل کتھا" ہی کو اُردو نثر کا پہلا کارنامہ بتایا ہے لیکن آزاد کی دوسری تحقیقات کی طرح اُردو نثر کے بارے میں اس نظریہ کو بعد کے محققین نے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

---

[1] "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۱۶) ، [3] "سیر المصنفین" صفحہ (۴۲) [4] "گل رعنا" صفحہ ۲۴

[2] "آبِ حیات" مقدمہ صفحہ (۰)

Hanif Raza

چنانچہ خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" کی دریافت کے بعد مولوی عبدالحق نے اس کو مرتب کرتے ہوئے جو مقدمہ اس پر تحریر فرمایا ہے اس میں وہ اس رسالے کو اُردو کی پہلی تصنیف قرار دیتے ہیں :

"ابھی تک جتنی کتابیں ملی ہیں ان میں معراج العاشقین سب میں قدیم ہے اس لیے اُردو کی پہلی تصنیف سمجھی جاسکتی ہے"۔ [1]

بعد میں پروفیسر احسن مارہروی نے "منشورات"[2] (تاریخ نثر اُردو) میں مولوی عبدالحق کی تحقیق پر اکتفا کرتے ہوئے ان کی ہمنوائی کی ہے۔ اُردو کے ایک اور محقق حکیم شمس اللہ قادری نے "اُردوئے قدیم"[3] میں شیخ عین الدین گنج العلم متوفی ۷۹۵ھ کے رسالوں کو اُردو نثر کا سب سے پہلا کارنامہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے بھی "اُردو شہ پارے"[4] حصہ اول میں حکیم شمس اللہ قادری کی رائے سے اتفاق کیا ہے لیکن پروفیسر حامد حسین قادری نے "تاریخ داستان اُردو" میں حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ تصوف کو جو (۷۵۸ھ) کی تصنیف ہے۔ اُردو نثر کا پہلا کارنامہ قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں :

"خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے جن کا مزار کچھوچھا شریف علاقہ اودھ میں ہے۔ اُردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر ۷۵۸ھ (۱۳۰۸ء) میں تصنیف کیا۔ نثر اُردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے"۔[3]

جدید مواد

لیکن مرتب اپنی تحقیق کے سلسلے میں ایک مختصر سا رسالہ دستیاب ہوا ہے۔ جو بیجاپور کے سرکاری عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ اُردو منظوم رسالے "پند نامہ" اور "چکی نامہ" بھی منسلک ہیں۔

اس رسالہ میں اُردو مقولوں کی تشریح فارسی میں کی گئی ہے۔ یہ رسالہ "جنو تیہ" کے نام سے موسوم ہے چنانچہ آغاز کی عبارت کا وہ حصہ جس میں اس کے نام کی طرف اشارہ کیا گیا، حسب ذیل ہے :

---

[1] مقدمہ "معراج العاشقین" [2] "منشورات" صفحہ ۲۳ [3] اُردوئے قدیم صفحہ ۴۰
[4] "اُردو شہ پارے" صفحہ ۱۹

Hanif Razvi

"الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علی
رسولہ محمداً و آلہ اجمعین بعد ایں راقم گوید حرص و ہوس گرفتار
شوی محمد و خان روزی ایں فقیر نشستہ بود یار موافق و محب صادق میر سید حسن محمد
ابن کلام ہندی خواندند و تکلیف کردند کہ معنی ایں کلام ہندی بگویند بنا بر ضرور
ہر چہ خاطر ایں خام آمد نجامہ بند کردہ "جنونیہ" نام نہاد۔"

کیٹلاگ میں بھی اس رسالے کا نام "جنونیہ" ہی درج کیا گیا ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

M.7. "A Manuscript written in 795 A.H. in a script mixed "Nask" And "Talik" style Comprising three works viz. 'Jonuniya' Chakinama and "pand nama".

اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ رسالہ سنہ ۷۹۵ھ کا مکتوبہ ہے لیکن یہ سنہ متن رسالہ میں کہیں لکھا ہوا نہیں ملا، پتہ نہیں مرتب فہرست نے اس سنہ کو کہاں سے اخذ کیا۔ البتہ رسالہ کے ترقیمہ میں اور ایک مقام پر کاتب نے سنہ ۵۰۰ھ درج کیا ہے ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

"چوں از خانہ بیرون می آئی سہ بار آیت الکرسی بخوانی با ہر کار بچہ روی ساز
واز او نیکو شود و در چشم سرمہ بکن و در ہفتہ موی سر موی بغل
بگیر و موی بینی پاک بکن یا علی۔ انار بخور د استخوان ہر بار شکن و ترش بخور کہ شہوت
تو کم گردد یا علی! انگشت ناخون مخور کہ شیطان می خورد دوازدہ ماہ و پانزدہم
ماہ حجامت مکن کہ علت شود و تمت تمام شد کار من نظام شد سنہ ۵۰۰ھ"

اگر ترقیمہ کے سنہ پر اعتبار کر لیا جائے تو یہ رسالہ سنہ ۵۰۰ھ کے پہلے کا لکھا ہوا ثابت ہوگا اس کا مطلب یہ کہ اس رسالہ کی تصنیف غزنوی دور سے متعلق ہو جاتی ہے۔ مسعود سعد سلمان (سنہ ۴۵۲ھ – سنہ ۴۹۲ھ) کے دیوان کے تذکرے اور خواجہ معین الدین چشتی کے بارے میں اس زبان میں تکلم کرنے کے شواہد کے علاوہ اس دور کے دوسرے تحریری مواد کی موجودگی ہیں جو پہلے باب میں پیش کیا جا چکا

Hanif Razvi

ہے۔ سنہ ۵ھ میں ایسے ملفوظ کا ضبطِ تحریر میں آنا ناممکن نہیں معلوم ہوتا اور اس سنہ ۵ھ کو تسلیم کر لینے پر اس کا مصنف مسعود سعد سلمان کا معاصر قرار پاتا ہے۔

لیکن چند اندرونی شواہد کی بناء پر مجھے اس سنہ کے معتبر ماننے میں تامل ہے۔ یہ شواہد حسب ذیل ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ اس میں ایک مقام پر خواجہ حافظ کا ایک مصرعہ نقل کیا گیا ہے۔ اس سے متعلق عبارت حسب ذیل ہے۔

" نزدیکِ عارفاں ہر سخن کہ از عوام الناس ظاہری شود خواہ نیک باشد خواہ بد ایشاں ہمہ راست می شوند حضرتِ حافظ دریں محفل می فرماید "

" ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق "

حافظ کا زمانہ ظاہر ہے کہ سنہ ۵ھ سے پہلے کا نہیں۔ حافظ ۷۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۹۲ھ میں وفات پائی۔ اس سے صریح نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ رسالہ آٹھویں صدی ہجری کے اواخر سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔

(۲) اسی رسالے میں ایک اور مقام پر حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ عبارت حسب ذیل ہے۔

"حضرت مخدوم شرف الدین منیری در مکتوب خود فرمودہ ....."

مخدوم کا سنہ ولادت ۶۶۱ھ اور سنہ وفات ۷۸۲ھ ہے۔ اس لحاظ سے اس رسالے کی تصنیف کا جو قدیم ترین سنہ مقرر کیا جا سکتا ہے وہ ۷۸۲ھ کے بعد کا ہوگا۔

رسالے کی زبان، اس کے اسلوب، جملوں کی وضع اور بندش سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے اواخر کی تصنیف ہے۔ اس رسالہ کا موضوع بھی اردو کے ابتدائی نثری رسالوں کی طرح جواب تک دستیاب ہوئے ہیں اخلاق اور تصوف کے نکات و رموز پر مشتمل ہے۔

"جنونیہ" ایک مختصر سا رسالہ ہے اس لیے ذیل میں مکمل درج کیا جاتا ہے۔ زبان کو سمجھنے میں فارسی کی تشریحی عبارتوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

رسالہ جنونیہ

قولہ (۱) "بات کی بات کرافات کرافاتست" یعنے جائے سخن سخن است و جائے خرافات کرافاتست معنیش چناں باشد یعنی نزدیک عارفان ہر سخن کہ از عوام الناس ظاہر می شود خواہ نیک باشد خواہ بد ایشان ہمہ را است می شوند حضرت حافظ درایں محل می فرماید:

"ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق"

قولہ (۲) "وہاں بسائی تین کا نون دو اجڑے ایک بستا نہیں"

معنی ظاہر آن است آں جا آباد کردند سہ دیہہ دو ویران بودند و یکی آبادانی نداشت۔ مراد مصنف آں باشد از سہ دیہہ شاید کہ یکی دنیا باشد، دوم بہشت سوم دوزخ۔ یعنی ہر دو ویرانند۔ زیرا کہ جای کہ "آدمیان" نمی باشد و یکی آبادانی۔ (نداشت یعنے ایں عالم دنیا ہر کہ می آید گذشتہ می رود۔ پس بیچہ روش آبادانی شود۔ و مصنف بہ ایں معنی کہ گفتہ باشد کہ یکی آبادانی نداشت چنانچہ شیخ سعدی قدس سرہٗ می فرمایند ؎

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت	رفت منزل بہ دیگرے پرداخت
واں دگر پخت ہمچناں ہوسے	ایں عمارت بسر نبرد کسے

قولہ (۳) "وہاں بسائی تین کمھار۔ دو لولی ایک کو ہاتھ نہیں"

معنی ظاہر آن است کہ آنجا آباد کردند سہ کلال دو از دست لنج بودند و یکی دست نداشت مراد از سہ کلال آبادان کردن آنست یعنے سہ کس را بہ ظہور آوردند۔ یکی طالب دنیا دوم طالب عقبےٰ سوم طالب مولیٰ

دو از دست لنج بودند یعنے طالب دنیا و طالب عقبیٰ از آں جہت کہ دست در طلب

قوسین کی عبارت سالار جنگ کے نسخہ سے ماخوذ ہے۔

مولی دراز نہ کردند۔

قولہ(۴) " انھو بس گھڑی تین ہانڈی دو پھوٹی ایک کوں تلا ہے نین "

معنی ظاہر این است کہ این ہا سہ آوند ساختند۔ ازآن دو شکستہ بودند یکی تہہ نہ داشت

معنی اش ہم چوں معلوم می شود۔

قولہ(۵) " دو کچی ایک پکتا نہیں "

معنی ظاہر آن است کہ دو خام ماندند و یکی پختہ نمی شود۔ و معنیش آن باشد یعنے

طالب دنیا و طالب عقبیٰ۔ ایک دو خام خیال بودند کہ ما عبادت کردیم چوں

قولہ(۶) " ان پر بلائی تین جہان "

معنی ظاہر آن است کہ بر بلای آن سہ برنج سہ جہان طلب کردند معنیش آن باشد یعنے

برائے ایں کار سہ کس را طلب کردند یکی علم، دوم عقل، سوم عشق۔

قولہ(۷) " دو لوتھی ایک آوتا نہیں "

معنی ظاہر آن است کہ دو رنجیدہ شدند و یکی نمی آید یعنے علم و عقل ہر دو دیدند کہ

ایں کار از دست نہ خواہد شد۔ عاجز شدہ ماندند۔ حضرت مخدوم شرف الدین منیری

در مکتوب خود فرمودہ عشق آسان نہ بود نہ آموختن عشق عشق را خانہ ایں است بر

نرحادین درش بستہ نے کسی را بار یکی نمی آید با ایں معنی۔

قولہ(۸) " ان پر کون فرمائی تین مکین "

بر ایشاں رحشت انداختند۔ معنی اش آن باشد کہ بریں سہ کس نظر کردند آیا از

دست ایشان ایں کار خواہد بر آمد۔

قولہ(۹) " دو چوکیں ایک لاگتی نہیں "

معنی ظاہر آن است کہ دو خطا شدند و یکی نمی رسد۔ معنی اش آن باشد کہ دیدند کہ

از علم و عقل ایں کار شدنی نیست از آن قطع نظر کردند و یکی نمی رسد معنی عشق کہ ہیچ

حیلہ است او نمی رسد ہمیشہ طالبان از عشق حاصل و عشق بفضل او حاصل می کرد "۔

Hanif Razvi

جیسا کہ رسالے سے ظاہر ہے، اُردو کے نو مقولوں کی تشریح فارسی زبان میں کی گئی ہے۔ اِس رسالہ کے مصنف اور وجہ تصنیف کا پتہ رسالے کی ذیل کی عبارت سے چلتا ہے۔

"الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمداً وآلہ اجمعین۔

بعد ازمیگوید حرص و حوا گرفتار شوی محمد وخان روزی ایں فقیر نشستہ بود یار موافق ومحبِ صادق میر سید حسن محمد ایں کلام ہندی خوانند و تکیف (تکلیف) کردند کہ معنی ایں کلام ہندی بگوئند"۔

رسالہ کے آخر میں یہ اشعار ہیں۔:

کہ احمد کی نادگی صورت پوساز — سو پیدا کیا ہے خُدا نے نماز
قیام اس میں جیوں "الف" ہے پیدا — رکوع اس میں جیوں "ح" رھیا ہی نیکا
جو سجدہ سو او "میم" کے ہے مثال — یو قعدہ سناؤں کہ آخر کا "دال"
دو جا میم سو پیٹ کے ہے مثال — دو پاواں بھی بنانے آخر کا دال
محمد کی نادن کی صورت اوپر — بھی پیدا کیا ہے خدا سب بشر

اس رسالے کے علاوہ اسی کے ساتھ منسلک دو اور رسالے ہیں جن میں سے ایک کا نام "چکی نامہ" اور دوسرے کا نام "پند نامہ" ہے۔ نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"خوش حال سکیا نکی قیبلی ہیں تانہ ÷ چلو سب سہلیاں میروانی کنانہ
ساتو سہلیاں ملکر نانی کے گھر آیاں ÷ کنوارا یانی حکمت کی لایاں

ہفت اسرار بعض محققین نے خواجہ بندہ نواز کی تصانیف میں ایک رسالے "ہفت اسرار" کا ذکر کیا ہے۔ اس کی زبان کے بارے میں علما میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا بیان ہے کہ یہ رسالہ فارسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ لیکن حکیم شمس اللہ قادری نے اسے اُردو کا رسالہ بتایا ہے۔

حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں۔:

Hanif Raza

"خواجہ بندہ نواز نے دکنی زبان میں سات مقولے ارشاد فرمائے تھے ان کے ایک مرید نے اس کی مبسوط شرح لکھی اور اس کا نام ہفت اسرار رکھا"۔ ل

ڈاکٹر زور کا بیان ہے:

"یہ مشہور ہے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے کسی مرید نے آپ کے سات اقوال کی ایک طویل تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ یہ ہفت اسرار کے نام سے موسوم ہے اور غالباً اس وقت بالکل ناپید ہے"۔ ۲

ڈاکٹر زور کے بیان سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ "ہفت اسرار" اب ناپید ہے۔ اس کے علاوہ حکیم شمس اللہ قادری کی اور ڈاکٹر زور دونوں کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقولوں کی شرح فارسی میں طویل کی گئی تھی۔ بظاہر جنونیہ پر یہ تعریف صادق نہیں آتی کیونکہ یہ ایک مختصر رسالہ ہے۔ نیز محمود خان نے، جن کی فارسی عبارت اوپر نقل کی گئی ہے حضرت خواجہ بندہ نواز کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس کے علاوہ رسالہ "جنونیہ" کی زبان مقولات اور ملفوظات کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ خواجہ بندہ نواز کے رسالے کافی نشو و نما پائی ہوئی نثر کا نمونہ ہیں، اس لیے یہ شبہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ چونکہ "رسالہ جنونیہ" میں بھی مقولے ہیں اس لیے یہ خواجہ بندہ نواز کا ناپید رسالہ "ہفت اسرار" ہے۔

ان شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "جنونیہ" مربوط نثر کا اولین نمونہ ہے اور ۸۹۵ھ کے قریبی زمانے کی تصنیف ہے۔ "ہفت اسرار" کے تذکرے سے ایک بات ضرور متعین ہو جاتی ہے وہ یہ کہ اردو کی نشو و نما کے اس دور میں ایسے رسالے عام طور پر لکھے جاتے تھے۔ جن میں اردو مقولوں کی تشریح فارسی میں کی جاتی تھی۔ یہ رسالے ابتداً ہندوستانی عوام کے لیے لکھے جاتے ہوں گے۔ بعد میں فارسی داں لوگوں کو سمجھانے کے لیے ان کی فارسی میں تشریح کر دی جاتی ہوگی۔

اس طرح یہ رسالہ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۹ھ) کے رسالوں اور رسالہ اشرف جہانگیر سمنانی (متوفی ۸۰۸ھ) نیز دوسرے تمام رسالوں کے مقابلے میں جن کا اب تک علم ہوا ہے، قدیم تر

ل "اردوئے قدیم" صفحہ (۱۴) ۲ "اردو شہ پارے" صفحہ (۲۰)

ثابت ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ رسالے کے مصنف کے بارے میں مرتب کو باوجود تلاش کے کچھ مواد دستیاب نہ ہو سکا۔

رسالہ اشرف جہانگیر سمنانی

"جنونیہ" کے بعد دوسری قدیم تصنیف سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ تصوف ہے جو ۷۵۸ھ کی تصنیف بتائی گئی ہے اور جسے پروفیسر حامد حسن قادری نے اردو نثر کی پہلی تصنیف کی حیثیت عطا کی ہے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مقولات پچھلے باب میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ تصوف کے اس رسالے کے بارے میں قادری صاحب رقمطراز ہیں۔:

"اب تک اربابِ تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیف نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہانگیر کے رسالہ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا۔ اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی" ؎۲

لیکن پروفیسر صاحب نے اپنی "داستان تاریخ اردو" میں اس رسالے کے محض تذکرہ پر اکتفا کیا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ یہ رسالہ انہیں کہاں سے دستیاب ہوا؟ اس لیے میں نے پروفیسر صاحب سے اس رسالے سے متعلق تفصیلات معلوم کرنی چاہی تھی۔ جس کے جواب میں موصوف نے تحریر فرمایا:

"سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ نثر میرے پاس نہیں ہے۔ نہ میں نے دیکھا۔ میر نذر علی درد کاکوروی کے ایک مضمون سے میں نے اس کا تذکرہ کر دیا تھا" ۔

پروفیسر قادری کے اس خط کے ملنے کے بعد میں نے جناب نذر علی صاحب درد کاکوروی سے اس رسالے سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی موصوف نے جو جواب عنایت کیا اس کے متعلقہ حصے ذیل میں درج ہیں:

؎۱ "تاریخ داستان اردو" صفحہ (۱۹) ؎۲ "داستان تاریخ اردو" صفحہ (۲۰)

"جناب حامد حسن قادری نے جس رسالے کی نشان دہی کی ہے، وہ میرے پاس نہیں ہے نہ میں نے صاحبِ موصوف کو دیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پرچہ "یادگارِ لاہور" میں "اردو اور شمالی ہند" کے عنوان سے میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں میں نے اس کا تذکرہ کیا ہے، یہاں اورنگ آباد میں حضرت شاہ قادر اولیا کی درگاہ میں، محبوب علی شاہ نامی ایک خادم تھے (عرصہ ہوا ان کا انتقال ہوگیا)۔ ان کے پاس سید اشرف جہانگیر والی کتاب کو میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ قلمی کتاب تھی اس کتاب کے صفحہ (۱۸) کا ٹکڑا یہ ہے :-

"اے طالب آسمان زمین سب خدا ہیں ہے جو تحقیق جان اگر
تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بہیتر سب
ذات ہی ذات ہے"۔

چونکہ مرتب مقالہ کی دسترس میں یہ رسالہ نہیں ہے اور اس کا بھی پتہ نہیں کہ یہ رسالہ اب موجود بھی ہے یا نہیں۔ اس لیے اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا مشکل ہے تاہم جناب نذر علی صاحب دردؔ کاکوروی کی عنایت سے جو نمونہ دستیاب ہوا ہے وہ اتنا مختصر ہے کہ اس سے رسالے کی زبان اور موضوع کے بارے میں کسی بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور اگر کچھ مترشح ہوتا ہے تو یہ کہ اس کی زبان سید اشرف جہانگیر کے ملفوظات کی زبان سے بہت مختلف اور شاید "معراج العاشقین" کے بعد کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ سوائے اس کے کہ جملوں کی ساخت میں فرق ہے کوئی اور بات ایسی نہیں دکھائی دیتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے آغاز کی تصنیف ہے۔

میں نے اس رسالے کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب سے رہنمائی چاہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کو اس رسالے کے اصلی ہونے کے بارے میں شبہ ہے۔ چنانچہ میرے استفسار کے جواب میں موصوف نے جو خط مجھے تحریر فرمایا تھا اس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے

"جس رسالے کا ذکر حامد حسن قادری صاحب نے کیا ہے وہ بہت مشتبہ ہے اور وہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔"

Hanif Razvi

شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے

حکیم شمس اللہ قادری نے حضرت عین الدین گنج العلم کے چند نثری رسالوں کا ذکر اپنی تصنیف "اردوئے قدیم" میں کیا ہے۔ جو ان کے بیان کی رو سے ۸۲۵ھ کی تصنیف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"آپ نے چھوٹے چھوٹے کئی رسالے دکھنی زبان میں تصنیف کیے تھے۔ منجملہ ان کے تین رسالے ایک مجموعہ میں کالج قلعہ سینٹ جارج کے کتب خانے میں موجود تھے۔ ان کے اوراق کی مجموعی تعداد چالیس تھی۔ اور ان میں فرائض وسنن کے متعلق مختلف احکام و مسائل تحریر تھے۔" [1]

حکیم صاحب مرحوم نے ایک ملاقات میں مجھ سے یہ بھی بیان کیا تھا کہ یہ رسالے انھوں نے دیکھے تھے لیکن اُردوئے قدیم کے کسی ایڈیشن میں ان کے اقتباسات شامل نہیں کیے گیے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے بھی شیخ عین الدین گنج العلم کے ان رسالوں کا تذکرہ "اردو شہ پارے" جلد اول میں کیا ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"ان کی نسبت مشہور ہے کہ دکھنی میں چند چھوٹے چھوٹے رسالے تالیف کیے تھے ان میں سے تین کے مخطوطے کہتے ہیں کہ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے کتب خانہ میں محفوظ تھے ان رسائل کی ضخامت صرف (۴۰) صفحات بتائی جاتی ہے وہ مذہبی موضوع پر لکھے گیے۔ یہ اطلاعات حکیم شمس اللہ صاحب پر مبنی ہیں۔" [2]

حالات زندگی شیخ عین الدین گنج العلم
۷۰۶ھ لغایۃ ۷۹۹ھ

شیخ عین الدین گنج العلم علاؤالدین خلجی کے زمانہ حکومت میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ان کا سنہ ولادت ۷۰۶ھ ہے۔ ان دنوں گجرات ارباب فضل وکمال کا مرکز و مرجع تھا۔ حدیث و فقہ کی بہت سی کتابیں گجرات میں لکھی گئیں جن کی تفصیل اس طرح لکھی گئی ہے۔

---

[1] اردوئے قدیم صفحہ (۴۱)
[2] "اردو شہ پارے" صفحہ (۱۹)

Hanif Raza

شیخ شہاب الدین نے "نور المسافر" اور "بستان المحدثین" سلاطین گجرات کے نام پر لکھیں
امام بدر الدین نے صحیح بخاری کی تعلیقات لکھیں۔

شیخ علاؤ الدین نے اسی زمانے میں "تبصیر الرحمٰن" ضخیم تفسیر لکھی۔ اس کے علاوہ شیخ الاکبر کی "فصوص" اور شہاب الدین سہروردی کی "عوارف" کی شرحیں لکھیں۔ شیخ عین الدین نے بھی گجرات کا سفر اختیار کیا اور علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ دیوگڑھ (دکن) گئے جس کو محمد تغلق نے دولت آباد کا نام دیکر دھلی کی بجائے پائے تخت بنا دیا تھا جو علماء و فضلاء یہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض جیسے سید خوندمیر علاؤ الدین۔ بہاؤ الدین ذکریا۔ شمس الدین صلا مغانی شیخ منہاج الدین وغیرہ کا تذکرہ فرشتہ نے کیا ہے۔ عین الدین خوندمیر کے مرید ہو گئے اس کے بعد ۷۳۱ھ میں عین آباد ساگر تشریف لائے۔ یہاں سے بیجاپور چلے گئے۔ بیجاپور سلطان علاؤ الدین حسن گنگوے بہمنی کی سلطنت کا جزو تھا۔ شیخ نے حسن گنگوے بہمنی اور اس کے چار جانشینوں کا زمانہ دیکھا۔ آخر (۸۹) سال کی عمر میں ۷۹۹ھ میں وفات پائی۔ "روضۃ الاولیا" اور "خزینۃ الاصفیا" میں ان کی عمر (۱۳۲) سال بتائی گئی ہے۔ ساتھ ہی "روضۃ الاولیا" میں مذکور ہے کہ آپ سید الاقطاب رئیس العشاق، خواجہ محمد گیسو دراز کے استاد تھے۔

تصانیف

شیخ نے بہت سی کتابیں لکھیں ان کی تصانیف کی جملہ تعداد (۱۳۲) بتائی جاتی ہے [1]۔ فارسی میں ان کی مندرجہ ذیل دو کتابیں مشہور ہیں:

(۱) قاضی منہاج الدین جوزجانی کی "طبقات ناصری" کا تکملہ جسے مشہور مورخ ابو القاسم فرشتہ نے دیکھا تھا اور اپنی تاریخ کی تدوین میں اس سے استفادہ بھی کیا تھا شیخ نے اس کتاب کا نام "ملحقات طبقات ناصری" رکھا تھا۔

(۲) "اطوار الابرار" ان کی ایک اور مشہور تصنیف ہے جن میں اکابر اولیا کے حالات لکھے ہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری نے ان کے اُردو رسالوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جس کی تعداد نہیں بتائی صرف یہ لکھا ہے کہ ان رسالوں میں فرائض وسنن کے متعلق مسائل نظم کیے گئے تھے۔

---

[1]۔ "روضۃ الاولیاء" صفحہ (۱۸)

اور یہ رسالے مدراس کے قلعہ سینٹ جارج کالج کے کتب خانے میں محفوظ تھے ۱ے لیکن نصیرالدین ہاشمی نے ان رسالوں کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا ہے۔ "دکن میں اُردو" چوتھے ایڈیشن میں وہ لکھتے ہیں :

"بعض اصحاب شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اور پہلا ناشر قرار دیتے ہیں مگر چونکہ ہم نے ان کو دیکھا نہیں اور بعض وجوہ سے یہ رسائل ہنوز تحقیق طلب ہیں اس لیے ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے" ۲ے

رسالہ شاہ راجو اس عہد کا آخری نثری رسالہ سید شاہ راجو کا رسالہ تصوف ہے جو راقم الحروف کو اس مقالے کے مواد کی چھان بین کے دوران دستیاب ہوا ہے۔ یہ رسالہ کتب خانہ روضتین گلبرگہ (دکن) میں محفوظ ہے اور اُردو فارسی کے حسب ذیل رسالوں کے ساتھ منسلک ہے۔

(۱) رسالہ الوہیت
(۲) رسالہ حضرت شاہ راجو
(۳) رسالہ سیر التواریخ
(۴) تحفتہ الملک
(۵) مجمع الفواید
(۶) رسالہ حکمت التوحید
(۷) رسالہ شکارنامہ بندہ نواز
(۸) رسالہ دارالاسرار بندہ نواز
(۹) رسالہ جہانگیری
(۱۰) رسالہ حضرت شاہ میراں
(۱۱) رسالہ وجودیہ
(۱۲) رسالہ داشتن چہار پیر و چہار خانوادہ
(۱۳) رسالہ معراج السالکین
(۱۴) رسالہ وجودیہ از شیخ فریدالدین گنج شکر

ان میں سے نمبر ۱-۳-۴-۵-۶-۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴ فارسی کے رسالے میں اور ۲-۷ و ۸ اُردو کے۔ یہ سارے رسالے ایک جلد میں بندھے ہوئے ہیں جو کتب خانہ کی فہرست میں سلسلہ نشان (۲۶) پر "مجموعہ رسائل" کے نام سے درج کیے گیے ہیں۔

نمبر ۲ کے علاوہ دوسرے دو رسالوں کا ذکر خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کے سلسلے میں کیا گیا ہے یہاں جو رسالہ قابل ذکر ہے وہ رسالہ نمبر ۲ یعنی "رسالہ شاہ راجو" ہے۔ یہ رسالہ (۱۶) سولہ صفحے کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں مذہب اسلام کے عقاید اور تصوف کے نکات درج ہیں ابتدائی

۱ے "اُردوے قدیم" صفحہ (۴۱) ۲ے دکن میں اُردو طبع چہارم صفحہ ۲۵

Hanif Razvi

دور کے بعض رسالوں کی طرح یہ رسالہ بھی سوال؛ جواب کی شکل میں لکھا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کے حقایق اور تصوف کے نکات خواہش مندوں کے لیے مختصر طور پر ضروری مواد فراہم کرنے کے مقصد سے یہ تصنیف کیا گیا۔

نمونہ یہ ہے

جان العزیز اول کچھ نہ تھا آسمان تھا نہ زمین نہ عرش نہ کرسی نہ چاند نہ تارے نہ کچھ تھا اور ذات حق تعالی اپنے میں آپی تھا۔ اس حدتلک کے صفتوں کا بھی ظہر نہ تھا۔ نہ اپنی خبر رکھتا تھا نہ غیر کی۔

سوال۔ کس واسطے خبر نہیں رکھتا تھا ؟

جواب۔ کہ خبر رکھنا صفاتوں سوں تعلق رکھتا ہے ہور اپنی ذات سوں اپے ایسا مشغول تھا جو کس صفتا نکا گنجائش نہ تھا جس وقت صفتا نکا گنجائش نہ تھا تو خبر رکھنا بھی ممکن نہیں۔

سوال۔ صفتاں قدیم یا جدید

جواب۔ قدیم میں ظہور اس کا ذات مربی میں مخفی ہے جیو نکے شراب ذات میں عطر پھول میں۔

سوال۔ اس مرتبے کا ناوں کیا۔

جواب۔ اس مرتبے کو غیب ہویت بولتے ہیں۔

سوال۔ غیب ہویت کے معنی کیا ؛

جواب۔ اول کچھ نہ تھا ہور اپنے موں آپ تھا تو منداں کیا جس وقت سبحانہ تعالے یو منداں کرنا چاہا ہور غیب نے حضوریت کا ارادہ کیا۔ اول آپ میں اپی جانا کہ میں۔

سوال۔ اس مرتبہ کا ناواں کیا ؛

جواب۔ ابدیت بعد از جانیا کہ میں ایسا ہوں

سوال۔ اس مرتبہ کا ناواں کیا

جواب۔ اس مرتبہ کا ناواں وحدت بولتے ہیں۔ ہور حقیقت میں محمد ہور برزخ کبری ناواں رکھتے ہیں۔

سوال۔ ازمو دو نسبت ہوتے ہیں یو وحدت کے نسبت ہوتے ہیں سو کون کون۔

جواب۔ ایک احدیت دوسرا واحدیت

سوال۔ احدیت سو کیا واحدیت سو کیا

جواب۔ جس اعتبار جو خالص ہے نبی کا چہ علم ہی اس نسبت کا ناون احدیت ہے

جس اعتبار چارو اعتبار ثابت ہوتی ہیں اس نسبت کا ناون واحدیت ہے۔

سوال۔ چارو اعتبار کیا

جواب۔ جس وقت آپس میں ہونکو دلکو جاننا یعنی وجود ہون تو اعتبار وجود کا اس ماکیا ہو اپ سین جانیا سو عدم سون جلنیا ہے تو اعتبار علم کا ثابت ہوا۔ ہور جس وقت آپ سین جانیا تو آپ سین اپنی پرورش ہوا تو اعتبار نور کا ثابت ہوا۔ ہور جس وقت آپ سین آپ میں اپنی پرورش ہوا تو اپنے کون نظر آیا۔ تو اعتبار شہود کا ثابت ہوا۔

Hanif Razvi

سوال۔ وحدت کے معنی کیا

جواب۔ یک ذات قابلِ محض

سوال۔ احدیت کے معنی کیا

جواب۔ یک ذات بلا اعتبار صفات

سوال۔ جس وقت اپن اپسین جانیا تو ایسا ہی جانیا کیا باتیں۔

جواب۔ جانے کیا وہ اجمال وجمع کے طریقہ پر۔

سوال۔ اس مرتبے میں اشیا کوں کیا کہتے ہیں

جواب۔ شیونات ذات بولتے ہیں۔

سوال۔ شیونات ذات کے معنی کیا

جواب۔ ذات کیا قابلیاں

ل شاہ راجو نام کے جن سے یہ رسالہ منسوب ہے۔ دو بزرگ گزرے ہیں۔ ایک سید شاہ راجو قتال جو سید محمد گیسو دراز حسینی کے والد اور جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے چھوٹے بھائی تھے۔

مخدوم قطب عالم گجراتی سید شاہ راجو اپنے چچا ہی کے فیض یافتہ تھے۔ ان بزرگوں کے ملفوظات گذشتہ باب میں پیش کیے جا چکے ہیں۔

اس رسالے کے شاہ راجو کی تصنیف ہونے کے بارے میں سوائے لوح کی مذکورہ بالا عبارت کے اندرونی یا بیرونی طور پر کوئی شہادت اس بات کی نہیں ملتی کہ یہ کس شاہ راجو کی تصنیف ہے، کیونکہ اس نام کے ایک اور بزرگ گولکنڈہ کے حکمران ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں گزرے ہیں اس رسالے میں کوئی ترقیمہ بھی نہیں ہے۔ نہ قدیم دور کی کسی تاریخ میں اس رسالے کا تذکرہ ملتا ہے۔

راجو قتال ثانی سنہ وفات ۱۰۹۲ھ

سید شاہ راجو کا اصلی نام جو ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد تھے، پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے اپنی "تاریخ گولکنڈہ" میں رضی الدین لکھا ہے [۱] یہ خواجہ بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے۔ شاہ اکبر حسینی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ حیدرآباد میں فتح دروازہ کے قریب رہتے تھے۔ ان کے معتقدین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے بعض مشہور شعرا جیسے طبعیؔ، قطبیؔ وغیرہ نے ان کی مدح لکھی تھی۔ مثنوی "بہرام و گل اندام" کا مصنف طبعیؔ جو گولکنڈہ کے آخری بڑے شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اپنی مثنوی میں سید شاہ راجو کی مدح ان الفاظ میں کی ہے۔:

ولی تو بڑا ہے لکر شاہ راجو
چل آیا ہے شاہ تیرے گھر شاہ راجو
خبر تیری معلوم نیں بیخبر کون
خبردار جانے خبر شاہ راجو
کھڑا ہو کے خدمت منے تیری سورج
اڑاتا کرنون کی چنور شاہ راجو

بہرام و گل اندام ۱۰۸۱ھ کے قریب کی تصنیف ہے۔ شاہ صاحب کا انتقال ۱۰۹۲ھ میں ہوا۔ لیکن ان بزرگ کی کسی تصنیف کا اب تک پتہ نہ چل سکا۔ نہ تو کسی "تذکرہ اولیا" ہی میں

[۱] مجید صدیقی صاحب نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔

یہ لکھا گیا ہے کہ شاہ راجو قتال حسینی اُردو کے مصنف تھے اور نہ کسی تاریخ ادب میں اب تک اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگر "رسالہ شاہ راجو" انشا راجو کی تصنیف ہوتی تو ظاہر ہے کہ ان کے زمانے میں بیجاپور اور گولکنڈہ میں اُردو شعر و ادب کو جو ترقی ہو چکی تھی اس کا کچھ نہ کچھ پرتو اس رسالے کے موضوعات زبان اور اسالیب میں بھی کہیں نہ کہیں نظر آجاتا۔ میں نے اس سلسلے میں جس قدر چھان بین کی مجھے ناکامی ہوئی اور یہ بات کسی طرح قیاس میں نہیں آسکتی کہ شاہ راجو حسینی ثانی جو وجہی غواصی اور ابن نشاطی کے تقریباً معاصر تھے۔ "سب رس" "سیف الملوک بدیع الجمال" "طوطی نامہ" "گلشن عشق" جیسی معرکتہ الارا اور بسیط تصانیف کے مقابلے میں ایسی مختصر اور ابتدائی قسم کی تصنیف لکھتے۔ یہ صحیح ہے کہ اس رسالہ کا موضوع معرفت کے مسائل ہیں۔ تاہم جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے شاہ ملک بیجاپوری نے "احکام الصلوٰۃ" جیسی ضخیم تصنیف پیش کردی تھی۔ اور میراں یعقوب "شمایل الاتقیا" جیسی کتابیں تصنیف کر چکے تھے شاہ راجو خصوصیت کے ساتھ ایسی ابتدائی قسم کی تصنیف نہیں لکھ سکتے تھے۔ ہمعصر کارنامے ہمیشہ ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ شاہ راجو کے اس رسالے کی صورت میں معاصر تصانیف کا کچھ بھی اثر نہیں ملتا۔ پھر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس طرح کی تصانیف اپنے موضوع اور اسالیب دونوں لحاظ سے زیادہ تر آٹھویں اور نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے قرین قیاس بات یہی ہے کہ یہ رسالہ شاہ راجو اول ہی کی تصنیف ہے۔

اس قیاس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ شاہ راجو اول کے کچھ اور اُردو اور فارسی رسالے بھی دستیاب ہوئے ہیں جیسے "سہاگن نامہ" (اُردو) "تحفۃ النصائح" اور "دیوان راجا" جس کی تفصیل آگے بیان کی گئی ہے۔

حالاتِ زندگی سید شاہ راجو
متوفی ۷۹۵ھ

سید شاہ راجو اشرف جہانگیر اور عین الدین گنج العلم کے معاصر تھے۔ جن کی تصانیف اور فرمودات کا سراغ لگتا ہے۔ سید شاہ راجو قتال سید محمد گیسو دراز کے والد اور جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کا پورا نام سید یوسف حسینی تھا اور عرف سید راجا۔ ان کی بیوی بی بی رانی کہلاتی تھیں۔

Hanif Raza

اور سیدہ تھیں۔ بی بی رانی کے بھائی سید ابراہیم متوفی حکومت دہلی کی طرف سے دولت آباد کے صوبہ دار مقرر کیے گیے تھے۔ سید راجا سلطان المشائخ کے مرید اور ان کے خلیفہ خاص نصیر الدین چراغ دہلوی کے فیض یافتہ تھے۔

٧٢٧ھ میں جب سلطان محمد تغلق نے باشندگان دہلی کو دولت آباد جانے کا حکم دیا شاہ راجو بھی اپنے اہل وعیال کو ہمراہ لیکر ٢ ر رمضان المبارک ٧٢٧ھ کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ گجرات سے ہوتے ہوئے چار ماہ کے سفر کے بعد ١٠ ر محرم کو دولت آباد پہنچے اور قلعہ دولت آباد کے شمالی جانب یعنی کو خلد آباد میں سکونت اختیار کی۔ ان کے دوسرے ساتھیوں یعنے برہان الدین غریبؒ امیر حسن علاء سنجری وغیرہ نے بھی یہی مقام قیام کے لیے پسند کیا۔ خلد آباد آنے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ آپ کا مزار خلد آباد میں ہے۔ گولکنڈہ کا آخری تاجدار ابوالحسن بھی آپ کے مزار کے پاس دفن ہے۔

سید راجو کے سن وفات کے بارے میں علما میں بہت اختلاف ہے۔ مولوی عطا حسین "سیرت بندہ نواز" کے مصنف نے ٧٣١ھ بتایا ہے۔ "برکات الاولیا" کے مصنف اور "محبوب الزمن" کے مولف نے بھی اسی سن کو مستند مانا ہے لیکن شیخ عبدالقادر سرفراز نے بمبئی یونیورسٹی کے مخطوطات کے کیٹلاگ میں سنہ وفات ٧٩٥ھ بتایا ہے اور یہ سنہ وہ اس وجہ سے معتبر سمجھتے ہیں کیونکہ "تحفۃ النصائح" جو سید راجو کی تصنیف ہے ٧٩٥ھ میں لکھی گئی۔ اس کی تائید ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی "تذکرہ اردو مخطوطات" میں کی ہے۔[1]

اس کے علاوہ ٧٩٥ھ میں سید راجو کے بقید حیات ہونے کا ثبوت مصنف برکات الاولیا کے اس بیان سے بھی ملتا ہے کہ جس وقت خواجہ بندہ نواز ٨٠١ھ میں دکن تشریف لائے تو ان کے والدان کے ساتھ تھے۔[2]

تصانیف

سید شاہ راجو کی اب تک صرف ایک فارسی مثنوی "تحفۃ النصائح"[3] کا حال معلوم تھا۔ یہ مثنوی انھوں نے اپنے فرزند سید محمد گیسو دراز کے لیے لکھی تھی۔ جیسا کہ ذیل کے

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات ج ١ صفحہ (٣٥) [2] برکات الاولیا (ترجمہ روضۃ الاولیاء) صفحہ ( )

[3] ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی بمبئی یونیورسٹی مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سرفراز صفحہ ( ) نیز تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ (٣٥)

شعر سے پتہ چلتا ہے :

"گویدہمی یوسف گدا در وعظ سخنی چند را

از بہر خلف خویش لقا بو الفتح آن نور البصر"

اس کا ترجمہ شاہ راجو ثانی کے مرید قطب الدین قطبی نے ۱۰۴۵ھ میں کیا۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ تصنیف شاہ راجو ثانی کی ہے جس کا ترجمہ ان کے مرید نے کیا[۱]

مجھے ان کی ایک اُردو مثنوی "سہاگن نامہ" کا بھی پتہ چلا ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے[۲]۔ یہ ایک مختصر سی نظم ہے جو ساٹھ ابیات پر مشتمل ہے۔ ترقیمہ کی عبارت جو فارسی میں ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۱۴۲ھ میں قاضی عظیم الدین کی فرمائش پر قاضی بدیع الدجیٰ نے ہاشم پیر کے مکان میں نقل کیا تھا۔ ترقیمہ کی اصل عبارت حسب ذیل ہے :

"بہ ید احقر العباد بدیع الدجیٰ قاضی بمکنہ ہاشم پیر سرکار ناندیر و باشندہ صوبہ محمد آباد و بالا گھاٹ در قلعہ پالم بہ حسب الارشاد جامو صاحب قاضی عظیم الدین خان مدظلہ در یک گھڑی افتتاح یافت روزیکہ چرخ۔

روزیکہ چرخ رشتہ عمرم رہا کند   ایں خاک تیرہ بند زبندم جدا کند

یارب نگاہ دار تو ایمان آں کسے   کاید خط در ایں بخواند و برمن دعا کند

رسالے میں ابتدائی دور کی اکثر تصانیف کی طرح عورتوں کو دینی مسائل سے واقف کرانے کا ایک خاص نہج اختیار کیا گیا ہے۔ عورت کے احترام کے مدنظر اور عوام کے تخاطب کے انداز کے اتباع میں جگہ جگہ اسے "سہاگن" کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

سُن ری سہاگن سُن ری سُن   یکیک بول چیت دھر سن

کن سوی کپٹ پائی کمان   کھولنا کہنا بھید یہان

اس طرح سے عام عورتوں کے بدعتی عقاید تفصیل سے بتا کر ان کو ترک کرنے اور ان سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایک خاص بات اس نظم میں یہ ہے کہ اکثر مشکل ہندی الفاظ کی تشریح

۱۔ دکن میں اُردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۳۵   ۲۔ نمبر فہرست ۳۱۴

ان کے نیچے فارسی میں کر دی گئی ہے چنانچہ مذکورہ بالا اقتباس کے آخری شعر میں "سک اور سہرا" کے نیچے فارسی میں یعنی "منت و مراد" لکھا ہوا ہے۔ اس نظم کے آخری شعر میں سید راجو کا بھی نام آیا ہے شعر حسب ذیل ہے :

"سید راجو عابد ہے ۔ بخشن ہارا معبد ہے"

نظم کے کچھ اور شعر یہ ہیں :

سن ری سہاگن سن ری سن ۔ یکیک بول چت دھر سن
کن سوی کبیٹ یا کی کمان ۔ کھول نہ کہنا بھید یہ ہان
مت دیوا کین بھیجنگے ۔ بت دیو یا کین پوجینگے
جانے جو ہے پوج نکو ۔ سک اور سہرا کوچ نکو
(یعنے منت و مراد)
کین صدقہ کیسر کاری کی ۔ یا کین سر پر واری کی
دیوی ملیدی جن لاویں ۔ بے شک دوزخ میں جاویں
ناری کھریان باندی نا ۔ ماٹ ہور مٹکیاں ماندی نا
غیر از خدا کو سجدہ نہ کر ۔ کافر ہوکر دوزخ نہ پڑ
بی بیاں پریاں شہ ریشم ۔ شیطان کی ہے راہ نشم
(نشم راہ بدرا گویند)

ججّا سہاگن نہ کہلا ۔ جگھ سنواری ناچلا
ٹوٹے کا ٹونا کر نکو ۔ کن فال توں کین پھر نکو
ارکل ترت کا چھوری سبک ۔ روزہ رکھ کر بھیک نہ منگ
پاوٹاں جانا مسلم چھور ۔ دین تے باغی کفر ہے کھور
چھو شک برسو یا کہ مونجا ۔ سو ہے کافر جن پونجا
(بت خانہ)
جو کوئی کاثر لیونگی ۔ سخت شکنجے کھینچینگی
(کاثر نیاضی را گویند)

Hanif Razvi

سیّد شاہ راجو کا ایک فارسی دیوان موسومہ "دیوان راجا" کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس میں موجود ہے جس کا ذکر[1] ایتھے نے کیا ہے۔ کتب خانہ باڈلین[2] میں اور اسپرنگر[3] کے کیٹلاگ میں اس نسخے کے موجود ہونے کا پتہ دیا گیا ہے۔

ایتھے کو شاہ راجو کے زمانے کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے چنانچہ اس نے ان کا زمانہ بارھویں صدی ہجری بتایا ہے۔ غالباً اسے شاہ راجو اول اور شاہ راجو دوم میں تسامح ہوا ہے۔

میں نے اس دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ روضتین بھی دیکھا ہے۔ یہ نسخہ ایتھے کے بیان کیے ہوئے نسخے سے زیادہ مکمل معلوم ہوتا ہے۔

نصیرالدین ہاشمی صاحب نے "دکن میں اُردو" میں ایتھے کے حوالے سے سید شاہ راجو کے دیوان میں اشعار ہندی کا بھی ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ انھیں اس دیوان میں "شاہ راجو" کا کوئی ہندی شعر نہیں ملا[4]۔

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ سیّد شاہ راجو نے اُردو نثر کے علاوہ نظم میں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

معاصرین

شاہ راجو، امیر خسرو اور امیر حسن علا سنجری کے معاصر اور پیر بھائی تھے۔ خسرو کے اُردو کلام کے متعلق بہت رد و قدح کی جاتی رہی ہے لیکن بالآخر دورِ جدید کی تحقیقات نے خسرو کو "کھڑی بولی" یعنے اُردو کا پہلا شاعر تسلیم کر لیا ہے۔ اور ان کے ریختوں، لوریوں اور انملیوں کو ہندی کے علما نے ابتدائی ہندی (اور اُردو) کا نمونہ تسلیم کر لیا ہے۔ خسرو نے "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں اپنے ہندی دیوان کا ذکر کیا ہے[5]۔ اسی میں وہ اپنے معترضین کو یوں جواب دیتے ہیں۔

"چو من طوطیِ ہندم از راست پرسی ٭ ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

اور

"آہوئے ہندیم من نے او شترے حجازم"

۱؎ ملاحظہ ہو ڈیسکرپٹیو کیٹلاگ نمبر ۱۷۰۲۔ ۲؎ کیٹلاگ ۱۷۷۹
۳؎ کیٹلاگ اسپرنگر ۵۳۹
۴؎ "دکن میں اردو" طبع چہارم ۱۹ (فٹ نوٹ)
۵؎ "مقالہ ہذا صفحہ ( )

Hanif Razvi

یہ "ہندی" جس کی نغز گوئی پر خسرو کو فخر ہے اُردو ہی کا ابتدائی روپ ہے۔ خسرو نے فارسی میں ایک مثنوی "تغلق نامہ" بھی لکھی تھی جس میں غیاث الدین تغلق کا بیان ہے۔ اس میں ایک اُردو فقرہ ملتا ہے، جو یہ ہے :

"ہے ہے تیر مارا"۔ [1]

ان کی مشہور تصنیف "خالق باری" کے بارے میں یہاں کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔

خسرو کے علاوہ آٹھویں صدی ہجری ہی کے ربع آخر میں مُلّا داؤد کا بھی نام ملتا ہے، جنھوں نے ایک ہندی مثنوی "چندر بدن" لکھی تھی جس میں "لورک" اور "چندا" کا افسانہ بیان کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر مُلّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تصنیف "منتخب التواریخ" میں کیا ہے۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی اکبر کے زمانے میں بہت مقبول تھی۔ دراصل یہ قصّہ فیروز شاہ تغلق کے وزیر خان جہاں مقبول کے بیٹے اور جانشین کے لیے مُلّا داؤد نے منظوم کیا تھا۔ اسے مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربّانی توحید اور معرفت کے رمز کے طور پر منبر پر استعمال کرتے تھے۔ [2] اس قصّہ کو خواصی مصنف "سیف الملوک و بدیع الجمال" نے بھی ۱۰۳۵ھ میں لکھا تھا۔ [3]

شاہ راجو کے تیسرے اہم معاصر امیر حسن علا سنجری ہیں۔ سنجری شاہ راجو کے ہمراہ دکن آئے تھے۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے لیکن ان کے اُردو کلام کا حال ابھی تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔ کچھ ہی عرصہ ہوا کہ جناب سخاوت مرزا کو اُردو کی ایک نایاب بیاض دستیاب ہوئی جس میں امیر حسن سنجری کے بھی کچھ اُردو اشعار مل گئے ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے مضمون "اُردو کی ایک نایاب بیاض" میں جو رسالہ اُردو (کراچی) میں شائع ہوا ہے، سنجری کے حالات لکھے ہیں اور کلام کو بھی روشناس کرایا ہے۔ آٹھ اشعار پر مشتمل اس غزل کا پہلا اور آخری شعر ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"ہر لحظہ آید در دلم دیکھوں اوسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود با آن صنم جیوؑ لائے کر

---

[1] "گجری اور اُردو زبان کی نشو و نما میں اہلِ گجرات کا حصہ" مقالہ از پروفیسر ابراہیم ڈار مطبوعہ رسالہ اُردو (کراچی) اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۸۵
[2] "صوفیائے کرام کی ہندی دوستی" مطبوعہ سہ ماہی معاصر نمبر ۴ صفحہ ۱۰۷، [3] "دکن میں اُردو" (طبع چہارم) صفحہ ( )

Hanif Razvi

بس حیلہ کردم اے حسن بے جاں شدم از دم بہ دم
کیسے رہوں تجھ جیوبن تم لے گیے سنگ لائے کر

سیّد شاہ راجو کے اتنے قریبی دوست کے مذکورہ بالا کلام کی موجودگی میں اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے اور سیّد شاہ راجو کا اُردو میں کچھ ملفوظ چھوڑنا کوئی خلاف قیاس بات نہیں رہ جاتی۔ ٭

Hanif Razvi

(۴)

خواجہ بندہ نواز اور ان کے معاصرین کے نثری کارنامے

دورِ تغلق میں ثقافتی ترقی ۔ بہمنیوں کا عروج ۔ خواجہ صاحب کی دکن میں آمد ۔ حالاتِ زندگی ۔ خواجہ صاحب کی عظمت کے متعلق رائیں ۔ تصانیف ۔ تصانیف کی تعداد میں اختلاف ۔ ایک متنازع فیہ مسئلہ ۔ خواجہ صاحب نے اُردو میں تصنیف و تالیف کی یا نہیں ؟ اُردو تصانیف کے بارے میں شواہد ۔ اُردو تصانیف اُردو تصانیف کی نوعیت ۔ معاصر تصانیف اور متاخر تصانیف "معراج العاشقین" "سہ بارہ" "ہدایت نامہ" "ہشت مسائل" "ہفت اسرار" "خلاصتہ التوحید" "شکار نامہ" "تمثیل نامہ" "دار الاسرار" "تلاوت المعراج" "تلاوت الوجود" "وصیت الہادی" "رسالہ وجودیہ" تصانیف کے نمونے اور ان پر تبصرہ ۔ خواجہ صاحب کا اسلوبِ بیان ۔

معاصرین

اکبر حسینی ۔ عبداللہ حسینی ۔ شاہ داول ۔ سید محمد جونپوری
بہاؤ الدین باجن ۔ کمال الدین ۔ شاہ قلندر
بدر الدین محمد مصنف "آداب الفضلا" ۔ قوام فاروقی
مصنف "شرف نامہ" ۔

Hanif Raza

۴

حضرت خواجہ بندہ نواز کے نثری رسالے

نویں صدی ہجری کی ابتدا اردو ادب کی تاریخ میں مربوط اور مستقل نثری تصانیف کے آغاز کی وجہ ممتاز رہی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی میں تغلق خاندان کے حکمران موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ اس میں شک نہیں "عہدِ تغلق" تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں یادگار ہے۔ اس دور میں فنونِ لطیفہ کی کافی سرپرستی ہوئی۔ ادب، تعمیر، موسیقی، ثقافتی سب ہی میں ایک نئے رجحان کا آغاز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی میں بھی یہ دور ایک طرح سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

یوں تو خلجیوں ہی کے دور سے ہندوستان کے دور دست علاقے نئے حکمرانوں کے زیرِ نگیں آرہے تھے۔ لیکن ان کے بعد ان کے جانشینوں محمد تغلق اور فیروز تغلق نے دکن، بنگال، گجرات وغیرہ تک سلطنت کے حدود وسیع کرلیے تھے۔ محمد تغلق نے دکن میں دیوگڑھی کو اپنا پایۂ تخت بنا کر ملی جلی ثقافت اور زبان کے پھیلاؤ کے لیے ایک نیا میدان فراہم کردیا تھا۔ اسی وقت سے دہلی کے اکثر علماء و فضلا بھی دکن منتقل ہونے لگے۔ لیکن دکن میں تغلق خاندان کی حکومت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ محمد تغلق کی وفات کے بعد فیروز تغلق نے دلی کو آباد کیا۔ اس سیاسی شکست و ریخت میں دکن شمالی ہند کے تسلط سے نکل گیا۔ اور ۷۴۸ھ (۱۳۴۸ء) میں ایک آزاد و خود مختار حکومت قائم کرلی۔

دکن کا پہلا خود مختار مسلمان حکمران علاؤالدین حسن بہمنی تھا جس نے بہمنی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ یہ خاندان ۷۴۸ھ تا ۹۳۲ھ (۱۳۴۸ء تا ۱۵۲۶ء) تقریباً دو ڈھائی سو سال تک دکن پہ حکومت کرتا رہا۔ اس کا پہلا پایۂ تخت گلبرگہ تھا۔ جہاں اردو مربوط اور مستقل نثر کا پہلا کارنامہ لکھا گیا۔

Hanif Razvi

یوں تو بہمنیوں نے فارسی کی کافی سرپرستی کی لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کو اس نوخیز زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا بھی احساس تھا جو دکن میں مختلف زبانیں بولنے والے طبقوں کے آپس میں تبادلۂ خیال کا ذریعہ بن چکی تھی اور یہ ضرورت رفتہ رفتہ ادب و شعر کے لیے بھی مستقل طور پر استعمال ہونے لگی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

"یہ دکن ہی تھا جس نے شمالی ہند کے برخلاف یہاں کی زبان برج بھاشا تھی۔ ہندی یا ہندوستانی زبان کو اپنا کر ادبی نمونے کی مثال قایم کی۔" [۱]

بہمنی دور دکن کی تاریخ میں نہ صرف اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس دور میں مربوط نثری تصانیف اردو میں لکھی جانے لگیں بلکہ اس لیے بھی کہ بہمنی دربار نے بہ حیثیت مجموعی علوم و فنون کی سرپرستی کی۔ شعرا اور اہلِ قلم کی مدد کی اور ملی جلی تہذیب "ہند لمانی" تہذیب کو پروان چڑھایا جس کی ترقی میں بعد میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں نے بھی بیش از بیش حصہ لیا۔ محمد شاہ ثالث بہمنی سنہ ۸۶۷ ہجری سنہ ۸۸۷ ہجری (۱۳۶۶ء - سنہ ۱۳۸۷ء) کے وزیر محمود گاواں نے دکن میں علم و فضل کو عام کیا۔ اسی نے فارسی کے مشہور شاعر عبدالرحمٰن جامی کو بھی دکن آنے کی دعوت دی تھی [۲]۔ محمد شاہ ثانی (سنہ ۷۸۰ ہجری تا سنہ ۷۹۹ ہجری) نے فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیرازی کو دکن بلایا تھا [۳]۔ اسی خاندان کا حکمران فیروز شاہ بہمنی (سنہ ۸۰۰ ہجری - سنہ ۸۲۵ ہجری) خود بھی بڑا عالم تھا۔ تواریخ میں مذکور ہے کہ علم ہیئت سے اسے بڑی دلچسپی تھی اور سنہ ہجری میں اس نے بمقام دولت آباد ایک رصد گاہ تعمیر کرائی تھی [۴]۔

شاہ راجو قتال کے شہرہ آفاق فرزند صدر الدین ابو الفتح ولی اکبر الصادق سید محمد یوسف الحسینی الملقب بہ "گیسو دراز" اسی زمانے میں گلبرگہ وارد ہوئے اور احمد شاہ بہمنی کے تخت نشین ہونے تک دکن میں ارشاد و ہدایت کا مرکز بنے رہے۔ احمد شاہ بہمنی (سنہ ۸۲۵ ہجری تا سنہ ۸۳۸ ہجری) کے زمانے تک دکن میں اردو بولنے والے عوام کافی تعداد میں بس گئے تھے۔ اس زمانے کے حالات لکھتے ہوئے تاریخ دکن کے مستند مصنف ابو القاسم فرشتہ نے یہاں کے بسنے والوں کے مختلف طبقوں کی تفصیل

---

[۱] ملاحظہ ہو "انڈو ایرین اور ہندی" صفحہ ۱۰۷۔ [۲] ملاحظہ ہو "تاریخ بہمنی" مصنف ہارون خان شیروانی۔

[۳] "شعر العجم" [۴] "اردوئے قدیم" صفحہ ( )

اس طرح لکھی ہے :-

۱- " دکھنی " سے مراد وہ لوگ تھے جو سلطان علاؤالدین خلجی یا اس کے بعد شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ ہندوستان سے آکر دکن میں آباد ہوگیے تھے اور یہاں ان کی دو تین نسلیں گزر چکی تھیں یہ لوگ دکھنی کہلانے لگے تھے ۔ بعد میں ان کی زبان دکھنی کہلانے لگی ۔

۲- " غریب " وہ لوگ تھے جو ترکستان ، ایران یا افغانستان سے وقتاً فوقتاً آکر دربار میں توسل پیدا کرتے تھے اور ان کی زبان بالعموم فارسی ہوتی تھی ۔

۳- " حبشی " وہ لوگ تھے جو حبش یعنی ابی سینیا کے باشندے تھے اور یمن کے راستے ہندوستان آمے تھے یہ لوگ عربی اور حبشی دونوں زبانیں بولتے تھے ۔

ملک کے اصلی باشندے ان کے علاوہ تھے سلطنت کے شمال مغرب میں مرہٹے آباد تھے ۔ جنوب مشرق میں کنڑی اور تلنگی بولنے والوں کی بستیاں تھیں ۔

خواجہ صاحب دکن میں تقریباً ربع صدی تک ارشاد و ہدایت کا م کرتے رہے ۔ ارشاد و ہدایت کی ضرورت زیادہ تر ان لوگوں کے لیے تھی جو عوام کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔ خواجہ صاحب نے جو مذہبی رسالے لکھے ہیں وہ زیادہ تر انھیں عوام کے لیے لکھے ہیں ۔ کیونکہ حقیقت میں ارشاد و ہدایت اور احکام دین سکھانے کی ضرورت انھیں لوگوں کو تھی ۔ خواجہ صاحب کے ان رسالوں کے لیے اردو زبان کو استعمال کرنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دکھن میں یہ زبان عوام کی زبان بن چکی تھی ۔

حالات زندگی خواجہ صاحب کا اصلی وطن دہلی تھا ۔ جہاں ان کے بزرگ پانچویں صدی ہجری میں ہرات سے آکر بس گیے تھے ۔

سلسلہ نسب و خاندان خواجہ صاحب صحیح النسب سید تھے ۔ ان کا سلسلہ اٹھارہ واسطوں سے زید

مظلوم بن زین العابدین بن حضرت امام حسینؓ بن حضرت علی کرم اللہ وجہ سے ملتا ہے [1]۔ خواجہ صاحب کے دادا حضرت ابی الحسن الجندی، محمد غوری کے ساتھ ہرات سے دہلی فتح کرنے کے لیے آئے تھے۔ اسی جنگ میں شہید ہو گیے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کی اولاد دھلی ہی میں بس گئی۔ ان کی اولاد میں سے سید یوسف عرف سید راجو قتال کے دو فرزند سید چندن اور سید محمد حسینی تھے۔

سید محمد حسینی دہلی میں ۴/رجب ۷۲۰ھ کو تولد ہوئے۔ ان کا نام محمد کنیت ابو الفتح اور لقب صدر الدین ہے۔ خواجہ صاحب کی کاکلیں بہت دراز تھیں اس لیے عام طور پر گیسو دراز کے لقب سے مشہور تھے [2]۔

خواجہ صاحب کی ولادت کے وقت حضرت خواجہ نظام الدین بقید حیات تھے۔

۷۲۶ھ میں سلطان محمد تغلق بادشاہ دہلی نے دولت آباد (دیوگرھ) کو اپنا پائے تخت منتخب کیا۔ اور دہلی کے باشندوں کو دولت آباد جانے کا حکم دیا تو سید یوسف حسینی المعروف بہ راجو قتال بھی اپنے اہل وعیال سمیت ۷۲۸ھ میں دھلی سے روانہ ہوئے۔ چار مہینہ کے سفر کے بعد ۷۲۹ھ کو دولت آباد پہونچے۔ ان کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاء کے اور کئی خلفاء جیسے حضرت برہان الدین غریب۔ خواجہ امیر حسن علاء سنجری وغیرہ بھی تھے۔ خواجہ صاحب نے ابتدائی تعلیم والد اور نانا سے حاصل کی۔ یہ دونوں بزرگ نصیر الدین چراغ دھلوی کے تربیت یافتہ تھے۔ ان ہی کی زبانی نصیر الدین دھلی کے اوصاف سن سن کر انھیں آپ کی ذات سے عقیدت پیدا ہوئی۔ ان کی بہت خواہش ہوئی کہ دھلی جائیں لیکن کم عمری اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ آخر ان کی والدہ بی بی رانی کسی بات پر اپنے بھائی سید ابراہیم متوفی، صوبہ دار دولت آباد سے ناراض ہو گئیں اور اس قدر برداشتہ خاطر ہوئیں کہ اپنے دونوں فرزندوں سید حسین عرف چندن حسینی اور سید محمد گیسو دراز کے ساتھ دہلی

---

[1] خواجہ صاحب کے سوانح حیات کے ماخذ "تذکرہ اولیائے دکن" (   ) و "خزینۃ الاصفیا" (محمد سرور) "اخبار الاخیار" (عبد الحق حقی) و "تذکرہ محبوب الزمن" (عبد الجبار ملکاپوری) "سیر محمدی" (محمد علی سامانی) اور "تاریخ حسینی" (   ) ہیں۔ [2]

Hanif Razvi

روانہ ہوگئیں۔

۷۳۶ھ میں جس وقت یہ دہلی پہونچے۔ خواجہ صاحب کی عمر پندرہ سال کی تھی لیکن مرشد کی ملاقات کا اشتیاق غالب تھا۔ ایک دفعہ جمعہ کے دن حضرت چراغ دہلی جامع مسجد تشریف لائے خواجہ صاحب انھیں دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ اور ۱۶ رجب کو ۷۳۶ھ میں نصیر الدین چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوکر حلقہ ارادت میں داخل ہوگیے۔ خواجہ صاحب ہمیشہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے ساتھ ریاضت و ذکر میں شریک ہوتے اور علوم ظاہری کے حاصل کرنے میں کوشش کرتے۔ ساتھ ہی سلسلۂ درس بھی جاری رکھا کیونکہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی خواہش تھی کہ وہ سلسلۂ درس ترک نہ کریں۔ چنانچہ آپ نے امام ہمام تاج الدین کے پاس "کافیہ" کا ایک حصہ ختم کیا۔ اس سے بھی سیری نہ ہوئی تو قاضی عبدالمقتدر سے "کافیہ" "شرح کافیہ اور "کشاف" کی تعلیم ختم کی۔ ان کے علاوہ سید شرف الدین کھیتلی وغیرہ سے بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انیس ۱۹ سال کی عمر میں علوم ضروریہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کرلی اور تمام تر وقت ریاضت اور مجاہدہ میں صرف کرنے لگے۔ اس زمانے میں روز نصیر الدین چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کرتے کہ اگر حکم ہو تو جس قدر علوم ظاہری حاصل کیے ہیں۔ اسی پر اکتفا کرکے علوم باطنی کی تحصیل میں مشغول ہوجاؤں۔ لیکن شیخ ممدوح نے اجازت نہیں دی۔ اسی زمانے سے خواجہ صاحب نے تصنیف و تالیف شروع کی پہلے تو "کشاف" پر حواشی لکھے۔ پھر رسالہ قشیری کی فارسی میں شرح لکھی۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے رسالہ کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ اسی زمانے کا معرکۃ الآرا کارنامہ عبدالقاہر سہروردی کی شہرہ آفاق کتاب "شرح آداب المریدین" کی شرح بھی ہے۔ اس کی ایک شرح آپ کے پیشرو بزرگ شرف الدین یحییٰ منیری نے بھی عربی میں لکھی تھی۔ خواجہ صاحب نے اس کی شرح فارسی میں لکھی۔ پھر "خاتمہ شریف" کے نام سے آداب المریدین کا تکملہ یا ضمیمہ لکھا۔ مستند سیرتوں میں ہے "فصوص الحکم" کی شرح بھی لکھی۔ نیز "تمہیدات" عین القضاۃ ہمدانی کی شرح بھی اسی زمانے میں لکھی۔ اور یہ تمام تصانیف مرشد کی خدمت میں پیش کیں۔

Hanif Raza

اسے دیکھ کر شیخ ممدوح بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد علوم باطنی کے حاصل کرنے کی اجازت دیدی۔

۱۸؍ رمضان ۷۵۷ھ کو چراغ دہلی راہی عالم بقا ہوئے۔ خواجہ صاحب ہی نے ان کی نعش مبارک کو غسل دیا، کفن پہنایا اس کے بعد سجادہ ارشاد پر متمکن ہوئے اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ اور اس وقت تک بیاہ نہیں کیا تھا۔ آخر چالیس سال کی عمر میں والدہ کے اصرار سے سید احمد بن عارف باللہ جمال الدین کی صاحبزادی بی بی رضا خاتون سے نکاح کیا۔ ان کے خسر یعنی جمال الدین مغربی بھی بلند پایہ محدث اور فقیہہ تھے۔ جمال الدین کے خلیفہ کمال الدین مغربی میران جی شمس العشاق کے مرشد تھے۔

خواجہ صاحب دہلی ہی میں سجادہ ارشاد پر متمکن رہ کر خلق خدا کی ہدایت میں ۸۰۰ھ تک مصروف رہے۔ اس سال امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا ۸۰۱ھ میں اٹک پہونچ کر دہلی کی جانب بڑھا۔ اس شہر کی تباہی اور بربادی کا منظر حضرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دہلی سے ہجرت ہی مناسب سمجھی۔ انھوں نے دہلی کے دیگر سادات اور عامۃ الناس کو آنے والی بلا سے خبردار کیا۔ اور دہلی سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ خواجہ صاحب ۷؍ ربیع الثانی ۸۰۱ھ کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ اس کے بعد تیمور دہلی پہونچا۔ خاندان تغلق کے آخری بادشاہ سلطان ناصر الدین نے ۸۰۱ھ میں امیر تیمور سے مقابلہ کیا، اور شکست کھائی۔

خواجہ صاحب دہلی سے گوالیار گیے۔ جہاں ان کے مرید اور خلیفہ علاؤالدین مقیم تھے۔ علاؤالدین نے تمام علما اور عمایدین شہر کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ اور گوالیار لیجا کر اپنے مکان میں ٹھیرایا۔ یہاں کچھ دن ٹھیر کر آپ نے علاؤالدین کو خلافت دی۔ گوالیار سے چندیری اور کھنبایت ہوتے ہوئے دولت آباد روانہ ہوئے۔ اس وقت دکن میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کی حکومت تھی۔ اسے خواجہ صاحب کے دولت آباد تشریف لانے کی اطلاع ہوئی تو عضد الملک کو جو دولت آباد کا گورنر تھا بادشاہ نے خط لکھا کہ وہ خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر گزرانے اور گلبرگہ آنے کی التجا کرے۔ چنانچہ وہ الند ہوتے ہوئے ۸۰۳ھ میں گلبرگہ پہونچے۔

جب گلبرگہ کے قریب پہونچے تو سلطان فیروز شاہ نے اپنے تمام اہل خاندان، امرا، سادات علما، اور فوج کے ساتھ ان کی پیشوائی کی اور بہت ادب و احترام کے ساتھ گلبرگہ آیا۔ یہاں تشریف

Hanif Razvi

خواجہ صاحب چند سال تک قلعہ کے قریب فروکش رہے اس کے بعد اس جگہ سکونت پذیر ہوئے جہاں اب آپ کا مزار ہے۔ اسی مقام پر بروز دوشنبہ ۱۶۔ ذی قعدہ ۸۲۵ھ میں خواجہ صاحب نے رحلت فرمائی۔

خواجہ صاحب کے کمال وعظمت کے معترف ان کے اکثر معاصرین اور متاخرین تھے۔

جب ایک بار آپ غلبہ حال سے مجبور ہو کر پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بقدر ضرورت میں نے پڑھ لیا۔ اب اگر حکم ہو تو سلسلہ درس چھوڑ دوں۔ ان کے مرشد نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اور فرمایا سلسلہ کی تکمیل کرو، کیونکہ

"مارا باتو کارہا است"

خواجہ صاحب کی تصانیف اور حالات زندگی اور خاص طور پر ان مساعی سے جو انہوں نے دکن کے اُردو داں عوام کو علوم دین سے واقف کرانے کے لیے کیں چراغ دہلی کا مذکورہ بالا قول بہت پُرمعنی ہے۔ نہ صرف دکن ہی کے عوام بلکہ اس زمانے کے اکابر اولیاء بھی ان کے فیض سے مستفیض ہوئے۔ اور ان کی عظمت و رفعت کی شہادت دی۔ چنانچہ حضرت اشرف جہانگیر سمنانی دور دراز راہ طے کر کے ایک بلکہ دو بار گلبرگہ آئے اور ایک مدت تک خواجہ صاحب کی خدمت میں رہ کر ان کے فیضان ظاہری و باطنی سے مستفید ہوئے [1]۔

سید اشرف جہانگیر کے خلیفہ نظام حاجی غریب یمنی نے ان کے جو ملفوظات "لطائف اشرفی" کے نام سے جمع کیے ہیں ان میں خواجہ بندہ نواز کے متعلق اپنے پیر کی زبان سے سن کر لکھتے ہیں۔

"حضرت قدوۃ الکبریٰ یعنی (حضرت سید اشرف جہانگیر) می فرمودند کہ چوں بہ شرف ملازمت پیر سید محمد گیسودراز مشرف شدم آن مقدار حقائق و معارف کہ از خدمت وے بہ حصول پیوست از ہیچ مشائخ دیگر نبود سبحان اللہ

---

[1] ملاحظہ ہو خزینۃ الاصفیا صفحہ ۳۷۶ و "لطائف اشرفی"

Hanif Razvi

چہ جذبہ قوی داشتہ اند "۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

" مدت در ولایت دکن در قصبہ گلبرگہ اتفاق نزول افتاد و در مرتبہ درآن گذر رایات علائی شد "۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث "اخبار الاخیار" میں ان کے حالات میں لکھتے ہیں :

" سید محمد یوسف الحسینی دہلوی خلیفہ رئیس شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی است جامع است میان سیادت و علم و ولایت شانے رفیع و رتبہ منیع و عالی دارد و او در میان مشایخ چشت طریقے مخصوص است "۔

عبدالرحمٰن چشتی مراۃ الاسرار میں خواجہ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں :

" بزرگ ترین خلیفہ حضرت شیخ نصیر الدین اودھی بود "

مذکورہ بالا اقوال سے خواجہ صاحب کے فیضانِ باطنی کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اپنے فیض کو عام کرنے کی خاطر ہی خواجہ صاحب نے عربی فارسی اور اردو میں بہت ہی تصانیف کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

تصنیفات

خواجہ صاحب کی تصانیف کی تعداد کے بارے میں اکثر علماء میں اختلاف ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری مرحوم نے ان کی تعداد تیس بتائی ہے[2]۔

غلام یزدانی سابق ناظم آثار قدیمہ اپنے ایک مضمون مطبوعہ "ہسٹری آف دکن"[3] میں ان کی تعداد (۸۰) بتاتے ہیں لیکن علی حسین مرحوم جنھوں نے خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات اور تصنیفات کے بارے میں جہاں بین کی تھی وہ اپنی سیرت بندہ نواز میں لکھتے ہیں :

" عام طور پر مشہور ہے کہ ان کی عمر ایک سو پانچ سال کی تھی اور ان کی تصنیف کی تعداد بھی ایک سو پانچ ہے "[4]۔

---

[1] "لطائف اشرفی" [2] ملاحظہ ہو اُردوئے قدیم طبع سوم مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۱۴ ؛ [3] مطبوعہ محکمہ اطلاعات حیدرآباد ؛ [4] سیرت بندہ نواز صفحہ (۱۰) مطبوعہ نظام پریس چھتہ بازار حیدرآباد

Hanif Razvi

یہ حقیقت ہے کہ آپ تصانیفِ کثیرہ کے مالک تھے اپنی تصنیف و تالیف کے بارے میں اپنے ملفوظ "جوامع الکلم" میں لکھتے ہیں۔

"ہر کس در آں حضرت سلوک کرد بہ چیزے مخصوص شد ما بہ سخن مخصوص ایم خدائے مارا دولت بیان اسرار خویش داد ہر چند کہ می خواہم کہ نظر میں از سخن خویش ساقط شود نشد البتہ مرا نظر بہ سخن خود باشد واز سبب ایں معنے نیک اندوہگین باشم چرا باشد کہ نظر از ایں ساقط نہ شود" ۵؎

یوں تو چشتیہ طریقہ کے بزرگوں میں خواجہ حسن بصری سے حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی تک اس سلسلے کے سارے بزرگ صاحبِ تصنیف و تالیف تھے۔ لیکن تصانیف کی تعداد اور اہمیت ہر لحاظ سے خواجہ سید محمد گیسو دراز کے پایہ کو کوئی نہیں پہونچتا۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کی تصانیف عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ خواجہ صاحب کی سب سے بسیط سیرت مرتبہ حافظ عطا حسین صاحب ان کی عربی اور فارسی کی تصنیفات (۳۷) بتاتی ہے۔ ان میں سے دو عربی میں ہیں۔ باقی (۳۵) فارسی ہیں۔ یہ تصانیف جیسا کہ حافظ عطا حسین صاحب لکھتے ہیں۔ سنہ ۷۴۶ھ سے ۸۲۵ھ کے درمیان لکھی گئیں۔ اگر ان کے بیان کو صحیح مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے پچیس برس کی عمر کے بعد تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کی لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

کتبِ سیرت میں مذکور ہے۔ خواجہ صاحب انیس سال کی عمر تک علوم کی تکمیل کر لی تھی۔ اور کچھ رسالے لکھ کر آپ نے پیر کی خدمت میں پیش بھی کیے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ مرشد کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ نصیر الدین چراغ دہلی کا انتقال ۷۵۷ھ میں ہوا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ان کی تصانیف کا سلسلہ اس سنہ سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

۵؎ مخطوطہ جوامع الکلم صفحہ (۸۴) کتب خانہ روضتین۔

Hanif Razvi

خواجہ صاحب کی چند فارسی تصانیف کا تذکرہ پیچھے گزر چکا ہے۔ ان کے علاوہ ان کی اور تصانیف جو سلوک و تصوف اور ادب کے موضوعات پر ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

سلوک و تصوف

(۱) ترجمہ عوارف المعارف (۲) شرح تصوف (۳) مشارق الانوار (سیرت نبی صلعم) (۴) شرح رسالہ قشیریہ۔ (۵) خطائر القدس (۶) اسمار الاسرار یہ آپ کی معرکتہ الارا تصنیف ہے جس میں باطنی علوم بتائے گئے ہیں۔ (۷) حدایق الانس (۸) استقامت شریعت بہ طریق الحقیقت (۹) حواشی قوت القلوب (۱۰) مجموعہ یازدہ رسایل یعنی مصباح القلوب وغیرہ (۱۱) وجود العاشقین (۱۲) مکتوبات (۱۳) رسالہ در رویت باری تعالیٰ و در کرامات اولیا۔ (۱۴) رسالہ در بیان رایت ابی فی احسن صورت (۱۵) شرح الہامات غوث اعظم (۱۶) رسالہ در ذکر (۱۷) رسالہ در مراقبہ (۱۸) رسالہ دل آرام (۱۹) رسالہ ضرب الامثال (۲۰) رسالہ منظوم در افکار (۲۱) رسالہ توحید (۲۲) تلاوت الوجود (۲۳) عشق نامہ (۲۴) جواہر العشاق (۲۵) شجرہ نسب۔

ادب

(۱) شرح بیت امیر خسرو[۱] (۲) انیس العشاق (دیوان شعر فارسی)

اُردو تصانیف

خواجہ صاحب کی اُردو تصانیف کا سب سے پہلے تذکرہ مولوی عبدالحق صاحب کے دیباچہ "معراج العاشقین" میں ملتا ہے۔ اس کے بعد حکیم شمس اللہ قادری ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور جناب نصیر الدین ہاشمی نے بھی خواجہ صاحب کا ذکر اُردو کے مصنف کی حیثیت سے کیا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق "معراج العاشقین" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"آپنے بعض رسالے ہندی یعنی دکھنی اُردو میں بھی تصنیف فرمائے ہیں"[۲]

حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں:

"خواجہ صاحب نماز ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو علم تصوف اور حدیث

---

[۱] خسرو کی حسب ذیل بیت کی شرح ہے ۔ ز دریائے شہادت چوں نہنگ لا برآرد ہو ۔ تیمم فرض گردد نوح را در عین طوفانش

[۲] ملاحظہ ہو دیباچہ "معراج العاشقین"

Hanif Razvi

سلوک کا درس دیا کرتے تھے۔ گاہے گاہے درس میں کلام اور فقہ کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ جو لوگ عربی فارسی سے ناواقف تھے ان کے سمجھانے کیلیے آپ دکھنی میں تقریر فرماتے اور ایسے مریدوں کی فرمایش پر آپ نے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے دکھنی میں تصنیف فرمائے تھے۔ منجملہ ان کے معراج العاشقین اور ہدایت نامہ زیادہ مشہور ہیں،، [2]

مولانا احسن مارہروی نے معراج العاشقین کو اُردو نثر کی سب سے پہلی تصنیف شمار کیا ہے [3] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے بھی اپنی مستند کتاب "اُردو شہ پارے" میں خواجہ صاحب کو اُردو کے مصنفین میں شامل کیا ہے۔ ان کے علاوہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے بھی "دکن میں اردو" ایڈیشن چہارم میں خواجہ صاحب کا شمار اُردو کے اولین مصنفین میں کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"جدید تحقیقات کی رو سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی المتوفی ٨٢٥ھ وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس کی ابتدا کی اور معراج العاشقین اور ہدایت نامہ وغیرہ مرتب فرمائے"۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بات ثابت ہے کہ خواجہ صاحب نے اُردو میں بھی تصانیف چھوڑے ہیں۔ خواجہ صاحب کے اُردو کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنانے کے کئی اہم اسباب تھے:

ا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے اسلاف دو صدی سے دہلی میں رہ بس گئے تھے۔ ان کی یہاں کی مقامی زبان سے واقفیت لازمی تھی [4]۔ ان کے اکثر اہل خاندان راجو قتال۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت، قطب عالم۔ شاہ عالم وغیرہ جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے۔ ہندوستانی عوام کی رشد و ہدایت کے لیے اُردو استعمال کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کا فریضہ عوام کی رشد و ہدایت تھا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس عوامی زبان

---

[1]

[2] اُردوئے قدیم، صفحہ ۴۱۔ [3] ملاحظہ ہو تاریخ نثر اُردو صفحہ (۳۴) [4] ابوالحسن الجندی شہاب الدین غوری کے ہمراہ دہلی آئے تھے۔ یہیں شہید ہو گئے۔

Hanif Razvi

سے ناواقف ہوں اس لیے یہ سمجھنا کہ انھوں نے اپنے اسلاف کی روایات کو برقرار رکھا تو کوئی خلاف قیاس بات نہ ہوگی۔ خاص طور پر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعد کے دور میں شاہ میراں اور ان کے سلسلے کے تمام بزرگوں نے اپنے مرشد اور جد اعلیٰ کی لفظاً و معناً پیروی کی۔

۲۔ خواجہ صاحب کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ ہم پیچھے دیکھ آئے ہیں کہ اس سے پہلے کی صدیوں میں اردو نثر کا ارتقا مستقل ہوتا رہا۔ خواجہ صاحب کے زمانے تک زبان ارتقا کے اتنے مرحلے طے کر چکی تھی کہ اس میں تحریر و تقریر کی جاسکے۔

۳۔ ایک آخری بات یہ ہے کہ اکثر رسالے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ ان کے سلسلے کے بزرگوں کے ملفوظات میں دستیاب ہوئے ہیں اور جس حالت اور جس طریقے پر وہ دستیاب ہوئے ہیں اسے دیکھتے ہوئے انھیں غلط طور پر خواجہ صاحب کے رسالوں سے منسوب کیے جانے یا کسی قسم کی تحریف کی ضرورت اور گنجایش معلوم ہوتی۔ اس لیے جب تک خواجہ صاحب کی تصنیف کی تردید میں کوئی معین شہادت دستیاب نہ ہو۔ یہ سمجھنا حق بجانب ہے کہ یہ خواجہ صاحب ہی کے مصنفہ ہیں۔

سب سے قدیم شہادت جو خواجہ صاحب کے اردو ارشادات کی ملتی ہے وہ عبداللہ بن عبدالرحمن چشتی کا ملفوظ "عشق نامہ" ہے۔ اس میں خواجہ صاحب کا یہ مقولہ نقل کیا ہوا دستیاب ہوتا ہے:

"بھوکوں موئے سوں خدا کچھ انیڑتا ہے، خدا کوں انیڑنے کی استعداد ہور ہے۔"

ایک اور ناقابل تردید ثبوت آپ کی اردو سے انس کا یہ ہے کہ آپ نے اپنے چھوٹے فرزند اصغر حسینی کو "میاں لُہرہ" [۱] کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس طرح اپنے پوتے شاہ یداللہ کو "میاں قبولا" پکارتے تھے [۲]۔ ایک اور واقعہ ہے جو "تذکرۃ الملوک" [۳] میں

۱۔ لُہرہ کے معنی دکھنی میں چھوٹے کے ہیں۔ ۲۔ سیر محمدی مصنفہ محمد علی سامانی۔ ۳۔ تذکرۃ الملوک رفیع الدین شیرازی کی تصنیف ہے جو سلاطین بہمنیہ اور عادل شاہ کی تاریخ ہے اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں لکھی گئی۔

درج ہے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کے گھر کی اونچی زبان بھی "اُردو" ہی تھی۔
ملّا رفیع الدین شیرازی لکھتے ہیں کہ ایک روز شاہ ید اللہ کے فرزند ندیم اللہ حسینی، خواجہ بندہ نواز کی گود میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک خربوزہ تھا۔ خواجہ صاحب نے اسے لے لیا۔ تو ندیم اللہ حسینی کہنے لگے :

دادا اموریے ہان۔ مورے ماریا

خواجہ صاحب کی اُردو تصانیف کی مزید شہادت، آپ کی مستند سیرت "تاریخ حبیبی و تذکرہ مرشدی"، سے ملتی ہے جو سلطان علاؤالدین احمد شاہ ابن احمد شاہ ولی بہمنی کے وزیر نظام الملک بہ المقلب بہ ملک راجہ کی فرمائش سے تالیف ہوئی تھی اس کا مصنف عبدالعزیز بن شیر ملک بن محمد واعظی ہے۔ مصنف نے اس کے جمیع مطالب سید ید اللہ حسینی کی سند سے بیان کیے ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ کلکتہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں اور دوسرا حبیب گنج علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے اس کا مطالعہ حبیب گنج علی گڑھ کی مخطوطات کی فہرست کی ترتیب کے سلسلے میں کیا تھا۔ اس مخطوطے کو دیکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔
حکیم صاحب کا بیان ہے کہ اس کے باب ہفتم میں جس کا عنوان

"مباحث واردات در علوم و نویسانیدن تصنیفات"

ہے۔ خواجہ صاحب کی تصنیفات کے سلسلے میں اُردو رسالوں "ہدایت نامہ، دارالاسرار" کے نام بھی دیکھے تھے۔

حال ہی میں رسالہ "اُردو" (کراچی) میں سخاوت مرزا صاحب کا ایک بسیط اور محققانہ مضمون شائع ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اُردو میں شعر بھی کہے تھے۔ چنانچہ ایک غزل بھی جو آپ کے نام سے منسوب ہے، اسی مضمون میں نقل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نصیر الدین ہاشمی صاحب نے بھی "دکن میں اُردو" میں آپ کا کچھ کلام نقل کیا ہے۔
نصیر الدین صاحب ہاشمی نے خواجہ صاحب کے صرف تین رسالوں معراج العاشقین، ہدایت نامہ۔ سہ بارہ کا ذکر کیا ہے۔ کچھ مزید تفصیلات کا علم "تذکرہ مخطوطات (ادارہ"

ادبیات اُردو حیدر آباد دکن) سے بھی ہوتا ہے جو ۱۹۲۵ء میں شایع ہوئی۔ لیکن مجھے اس مقالے کی تدوین کے لیے مواد کی تلاش کے سلسلے میں خواجہ صاحب کے کچھ مزید رسالے بھی دستیاب ہوئے ہیں. ان میں سے بعض رسالوں کے بارے میں تو شبہ نہیں کہ وہ خواجہ صاحب ہی کی تصنیف ہیں۔ لیکن کچھ رسالے ایسے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن کے بارے میں صرف قیاس یہ ہے کہ وہ خواجہ صاحب کی تصنیف ہو سکتے ہیں۔ اصل میں جو لٹریچر خواجہ صاحب سے منسوب ہوتا ہے وہ نہایت احتیاط سے مطالعہ کیا جانے کے قابل ہے کیونکہ ان سارے رسالوں کے مطالعہ کے بعد مرتب مقالہ کو ایسا محسوس ہوا کہ کچھ رسالے تو یقیناً آپ کے مصنفہ ہیں لیکن کچھ رسالے ایسے بھی ملے ہیں جن کے بارے میں قیاس ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کے ارشادات کو ان کے مریدین اور معتقدین نے نقل کر لیا تھا۔ کچھ رسالے تو غالباً آپ کے مواجہ میں نقل ہوئے تھے لیکن بعض شاید عرصہ تک ذہنوں میں محفوظ چلے آئے اور بعد کو ضبطِ تحریر میں لائے گئے۔ تذکروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب اپنے ملفوظات کو معتقدین سے لکھواتے تھے۔ چنانچہ کچھ رسالوں میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جیسے ایک رسالے "شکار نامہ" میں ایک جگہ تحریر ہے۔ :

"حضرت محمد حسینی فرماتے ہیں ارشاد کی ترتیب سوں شکار نامہ نو باپ اور سات ماں کے ہم چہار فرزند تھے"۔

فارسی میں بھی ان کا یہی طریقہ تھا مسئلۂ رویت باری تعالیٰ کے اقتباس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے :

"محمد یوسف حسینی می گوید یعلم اللہ آں طائفہ را دیدہ ام کہ ایشان یکے ساعتے از دیدار او محروم نہ ماندہ اند"۔

ان رسالوں میں جنھیں خواجہ صاحب کے فرمانے پر معتقدین نے نقل کیا ہے۔ اکثر ایسے الفاظ آتے ہیں "حضرت محمد حسینی فرماتے ہیں" وغیرہ۔

جو رسالے راست خواجہ صاحب سے منقول نہیں ہوئے بلکہ کچھ عرصہ تک سینہ بہ سینہ چلے آئے اور بعد میں کسی نے ان کو نقل کر لیا اس طرح کے بھی دو تین رسالے دستیاب ہوئے ہیں۔ پرانے زمانے

میں اکثر کتابیں اسی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں چنانچہ "پرتھوی راج راسو" بھی اسی طرح تقریباً سینہ بہ سینہ محفوظ چلی آئی اور تصنیف کے تقریباً دو سو سال بعد ضبط تحریر میں لائی گئی ؎۱۔

ان رسالوں میں جو اب تک شائع ہو چکے ہیں سب سے پہلا رسالہ "معراج العاشقین" ہے۔ جسے مولوی عبدالحق نے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب فرمایا تھا یہ رسالہ تاج پریس حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا تھا اس لیے اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اس رسالے کی تصنیف کا سنہ متعین طور پر معلوم نہ ہو سکا لیکن مولوی عبدالحق صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ ۸۰۱ھ یا اس کے لگ بھگ کی تصنیف ہے۔ اسی سنہ کو احسن مارہروی نے بھی صحیح مان لیا ہے لیکن نصیرالدین صاحب ہاشمی نے معراج العاشقین سہ بارہ اور ہدایت نامہ کا سنہ ۸۱۵ھ تا ۸۲۵ھ کا درمیانی زمانہ بتایا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ۸۰۱ھ سے قبل کی یعنی آپ کے قیام دہلی کے زمانہ کی تصنیف ہے۔ اس کے وجود مندرجہ ذیل ہیں:

سب سے پہلا ثبوت اس رسالے کی زبان ہے جیسا کہ ڈاکٹر زور بھی اپنی تصنیف "اردو شہ پارے" حصہ اول میں لکھتے ہیں۔

"یہ قدیم دکھنی سے مختلف ہے اس کی صورت کھڑی بولی سے زیادہ متاثر معلوم ہوتی ہے" ؎۲۔

چنانچہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"وہ درحقیقت کسی شمالی ہند کے باشندے کی تحریر ہے اور بہت ممکن ہے کہ بندہ نوازہی اس کے اصل مصنف ہوں"۔

اس کا موضوع خواجہ صاحب کے قیام دہلی کی تصانیف کی طرح کا "تصوف" ہے۔

معراج العاشقین یہ تصوف کے نکات اور رموز پر مشتمل ہے۔ قرآن اور حدیث کی مدد سے اس رسالے کے ذریعہ متصوفانہ مسلک کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

؎۱۔ ملاحظہ ہو مضمون پرتھی راج راسا، از پروفیسر محمود شیرانی، اورینٹیل کالج میگزین۔

؎۲۔ "اردو شہ پارے" صفحہ (۲۰)

پانچ تن۔ واجب الوجود۔ ممکن الوجود۔ ممتنع الوجود۔ عارف الوجود۔ اور ذکر جلی ذکر خفی ذکر سری کے ذریعہ انسانی زندگی کے معراج یعنے ذاتِ وحدت الوجود تک کس طرح رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کو سمجھایا ہے۔ عروج صوفیا کی اصطلاح میں مقامِ وحدت تک پہنچنے سے مراد ہے۔ یہاں سالک عالم "اجساد" کو مٹا کر عالم "مثال" جا پہنچتا ہے۔ پھر وہ عالم مثال سے بھی آگے عالم ارواح میں جاتا ہے اس کی آخری منزل عالم "اعیان" ہے جس کے بعد وہ "واحدیت" اور "وحدت" کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے۔ عروج کی آخری حد تک "نور محمد" ہے اور سالک کی رسائی وہیں تک ہے۔ البتہ پیغمبر علیہ السلام احدیت اور واحدیت کے درمیان "برزخ" کی مانند ہیں۔

"عشق [1]" بھی تصوف کی خاص اصطلاح ہے۔ چنانچہ "صوفیا" خدا کی ذات کو مجسم "عشق" سمجھتے ہیں۔ حضرت داؤد کے استفسار پر خدا نے فرمایا:

"کنت کنزاً مخفیا فحبت ان عرف فخلقت الخلق"

(میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا مجھے اپنے اظہار کی خواہش ہوئی تو میں نے اپنے سمجھنے کے لیے یہ دنیا پیدا کی)

"من لگن [1]" کے مصنف بحری لکھتے ہیں:

یہ نفس اگر نہ چلبلاتا کیوں کھول کواڑ باہر آتا

رہتا نہاں اپنی چھاری منے آپس کی قدیم کوٹھری میں

چنانچہ پہلا باطنی اظہار "ذاتِ محمدی" میں ہوا۔ جو بعد میں خدا کا محبوب بنا اس طرح محمد کا نام "حبیب اللہ" (خدا کا محبوب) ہوا۔ "اعیان" اور "ارواح" بعد کے تنزلات کے مدارج میں۔ پہلا درجہ "محبت" یا "عشق" کو حاصل ہے۔

"عشق کی دو صورتیں ہیں جلال اور جمال ذاتِ محمدی کا ادنیٰ اظہار "جمال" ہے۔ یہاں وہ "ہادی" (رہنما مرشد) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ "مضل" (یعنی ضلالت میں پڑا ہوا گمراہ) یا ابلیس "جلال" کا مظہر ہے۔

---

[1] من لگن مطبوعہ مدراس۔

حقیقت محمدی کا ظہور جس کو "روح اعظم" بھی کہتے ہیں پہلے عالم مثال میں ہوا پھر عالم ارواح و اجساد میں۔

"معراج العاشقین" سے مراد عاشق کے (محمد کے ذریعے) خدا تک پہنچنے کے ہیں محمد کے ذریعے یعنی شریعت کے ذریعے اس لیے خواجہ صاحب حقیقت کے ساتھ شریعت کے مسایل بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ اس واقعہ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

کنت کنزا مخفیا ماحبت ان عرف مخلقت الخلق "

اس کا معنا دریائے قدیم سے برابر اٹھارے محمد کا نور بوتے ہیں۔ اس میں الیں کون دیکھیا سو خالق میں تے خلق کون اظہار کیا۔

قولہٗ تعالیٰ

" اول ما خلق اللہ نوری " اس کا معنے اے محمدؐ سب خلق کون تیرے نور سوں پیدا کیا ہوں اس روشنائی میں اپنی تصویر دیکھا سو دونوں عالم نورانی یعنی نورانی سو ابوالارواح، ہوا روحانی سو ابوالاجساد "۔ [1]

" توحید کے دریا میں ٹھیرنا ذکر خفی کے محل میں وحدہٗ لاشریک لہٗ کی نیند لینا، اس جاگا کا حال پیغمبر علیہ السّلام کے سو معلوم کرنا " [2]

خواجہ صاحب کے نزدیک "طریقت" یہ ہے۔

" ذکر قلبی کر شریعت کے کانسے میں پیلا نا نرگن ہوا تو ممکن کا درد جائے گا جو پانی میں ماٹی پانی میں پانی آگ میں پانی، پانی میں بارا پانی میں خالی پانچ عناصر الکا ممکن الوجود بوجا تو طریقت تمام ہوا "۔ [3]

" ذکر قلبی " یعنی خدا کے نام کا ورد اس طرح کیا جائے کہ سالک اپنے آپ کو فانی محسوس کرے اور اس حد تک خدا کا تصور کرے کہ خدا اس کی ذات میں مستور معلوم ہو۔

---

[1] معراج العاشقین صفحہ ۱۴ مطبوعہ تاج پریس [2] معراج العاشقین صفحہ ۱۳
[3] معراج العاشقین صفحہ ۱۲

Hanif Razvi

پانچ عناصر ہوا۔ پانی۔ خاکی آگ کی تشریح یوں کی جاتی ہے۔:

ہوا۔ خُدا کی سانس ہے۔ چنانچہ حدیث ہے لا۔۔۔۔

"ہوا کو بُرا مت کہو کیونکہ ہوا خدا کی سانس ہے"

آگے چلکر لکھتے ہیں، خدا فرماتا ہے۔ ہم نے اس کو انسانی جسم کی خلا میں بھرا۔ پانی سے مراد "بحر المسجور" وہ دریا ہے جو عرش سے پرے ہے۔ "آگ" سے مراد وہ نور یا روشنی جو قلوب کو منور کرتی ہے یعنی مرید کو اس درجہ استغراق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے عناصر کو بھول کر ان عناصر میں مل جائے۔ (پوری کتاب اس قسم کے مضامین سے بھری ہوئی ہے)

۲۔ سہ بارہ

خواجہ صاحب کا دوسرا رسالہ ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ یہ رسالہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ نواب عنایت جنگ (حیدرآباد دکن) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ رسالہ بھی ابتدائی دور کے اکثر مذہبی رسالوں کی طرح سوال وجواب کی شکل میں لکھا گیا ہے۔

سوال۔ ذاتی ایمان کونسا اور صفاتی ایمان کون

جواب۔ الکھنڈ احال ثابتی ہے سو ذاتی ایمان وہ ہے ثابتی آتی اور جاتی ہے سو صفاتی ایمان۔

سوال۔ ایمان کے جھاڑاں کیا اور ایمان کے ڈالیاں کیا اور ایمان کے پات اور ایمان کا وطن کیا اور ایمان کا بیج کیا اور ایمان کا پوست کیا اور ایمان کا سر کیا اور ایمان کا جیو کیا۔

جواب۔ ایمان کا جیو قرآن ایمان کی جڑ توبہ ایمان کی ڈالیاں سو بندگی ایمان کی پات پرہیزگاری ایمان کا تخم سو علم ایمان کا پوست سو شرم ایمان کا وطن سو مومن کا دل ہے"۔ [۱]

اس رسالے کی زبان بھی معراج العاشقین کی زبان کی طرح فارسی عربی آمیز کھڑی بولی ہے۔

---

[۱]۔ "اُردو شہ پارے" صفحہ (۲۰۱-۳)

Hanif Razvi

(۳) "ہدایت نامہ" اس رسالے کو ڈاکٹر عبدالحق[1] صاحب اور حکیم شمس اللہ قادری[2] صاحب نے خواجہ صاحب کی تصنیفات میں شامل کیا ہے۔ اس رسالے کا صرف نام ہی ملتا ہے نہ تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور نہ حکیم شمس اللہ قادری کسی نے بھی اس کی تفصیل نہیں لکھی۔ ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی صاحب کی تصانیف میں اس رسالے کا تذکرہ بھی نہیں ملتا۔ مجھے بھی یہ رسالہ کسی کتب خانہ میں دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس لیے اس کا اقتباس اور تفصیل نہیں دی جا سکی۔

(۴) "ہشت مسائل" ایک اور رسالہ آپ کا مصنفہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس رسالے کا ذکر صرف ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کے کام" میں کیا ہے[3] کسی اور نے اس کا حال نہیں لکھا۔ اور ڈاکٹر عبدالحق نے بھی اس کی کچھ تفصیل نہیں دی ہے۔

(۵) "ہفت اسرار" اس رسالے کا ذکر حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر زور نے خواجہ صاحب کی مصنفات میں کیا ہے۔ اس رسالے کا کچھ حال پچھلے باب میں گزر چکا ہے۔ یہ رسالہ بھی مجھ کو دستیاب نہ ہو سکا۔ حکیم شمس اللہ قادری کے خیال میں یہ رسالہ اب ناپید ہے۔

مذکورہ بالا رسالے وہ ہیں جن کا تذکرہ اور جن کی تفصیل پچھلے محققین کی تصانیف سے ملتی ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور رسالے مجھے اس مقالے کی تدوین کے سلسلے میں مواد کی تلاش کے دوران میں ایسے دستیاب ہوئے ہیں جو خواجہ بندہ نواز کے نام سے منسوب ہیں:

۱۔ خلاصۃ التوحید
۲۔ شکار نامہ
۳۔ تمثیل نامہ
۴۔ دارالاسرار
۵۔ تلاوت المعراج
۶۔ وصیت الہادی
۷۔ رسالہ تصوف

لیکن ان رسالوں کی چھان بین کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ ان تمام رسالوں کو خواجہ صاحب کی اصل تصانیف نہیں مانا جا سکتا کیونکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ

---

[1] دیباچہ معراج العاشقین صفحہ (۷)، [2] اردوئے قدیم صفحہ ۴۱
[3] اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ (۳۶)

Hanif Razvi

ان کے ملفوظات ان کے مریدوں نے جمع کیے ہیں۔ خواجہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں لکھتے تھے، بلکہ کاتب (دستملی) سے لکھواتے تھے[1]۔ ایک آدھ رسالہ بھی ہے۔ جو شاہ میران جی شمس العشاق اور شاہ برہان کے زمانے میں ان کے معتقدین نے بعد میں لوگوں کی زبانی سن کر قلمبند کیا۔ خواجہ صاحب کے رسالے کی چند عام خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ دکھنی کے اثر کے ساتھ کھڑی بولی کے بھی کافی اثرات ملتے ہیں۔ کیونکہ خواجہ صاحب کی عمر کا کافی حصّہ دہلی میں بسر ہوا۔

۲۔ ان رسالوں میں عربی فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں بے تکلفی سے استعمال کیجاتی رہی ہیں۔

۳۔ ان کے جملوں کی ساخت پر بعد کے چند رسالوں جیسے شاہ میران جی یا شاہ برہان الدین کے ابتدائی رسالوں کے مقابلے میں جن پر دکھنی کا اثر زیادہ ہے زیادہ صاف ہے۔

خلاصۃ التوحید

خواجہ صاحب کے پچھلے تمام رسالوں میں "معراج العاشقین" کے بعد بھی وہ مستند رسالہ ہے جس کے متعلق خواجہ صاحب کی تصنیف ہونے کے بارے میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خواجہ صاحب کے سلسلے کے خاص بزرگوں یعنی میران جی شمس العشاق اور امین الدین اعلیٰ کے سلسلے کے بزرگ شاہ صدرالدین ذاکر کے رسائل کے ساتھ دستیاب ہوا ہے۔ شاہ صدرالدین، بندہ نواز کے تیسرے سلسلے کے خلیفہ اور شمس العشاق میراں جی کے معاصر تھے اور یہ رسالے خواجہ بندہ نواز سے لیکر شاہ صدرالدین ذاکر کے سلسلے کے مختلف بزرگوں کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالہ مرتب کو اس مقالے کے نگران جناب پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا جو موصوف کو شاہ صدرالدین ذاکر کے سلسلے کے ایک بزرگ کے خاندانی کتب خانے سے دستیاب ہوا تھا۔ جسے انھوں نے نقل کرلیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے شاہ صدرالدین کے ایک اور رسالے "مرآۃ الاسرار" کو اپنے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ طبع بھی فرمادیا ہے۔ نیز ان کی اور دو تصانیف "مصباح النور" اور "مفتاح النور" بھی موصوف کے

---

[1] خاتمہ۔ مرتبہ عطا حسین۔ مقدمہ ص۱

کتب خانہ میں محفوظ ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ اسی بیاض میں خواجہ بندہ نواز اور اگلے اور پچھلے اکثر ایسے بزرگوں کا ذکر ہے۔ جو اردو کے شاعر یا مصنف گزرے ہیں جن میں سے بعض کے کارناموں پر اسی مقالے کے صفحات میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور ان کا شجرہ درج ہے۔ اس لیے یہ مناسب نظر آتا ہے کہ اس شجرہ کو یہاں نقل کیا جائے۔

شجرہ

۱۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید حمید اللہ شاہ حسینی چشتی معروف فیاض العالمین قدس اللہ سرہٗ مدظلہ العالی

۲۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شاہ سعادت علی چشتی

۳۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شاہ حیدر چشتی

۴۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شاہ محمد بخش چشتی

۵۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ مرتضیٰ حسینی چشتی

۶۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ امین الدین علی شیر خدا چشتی

۷۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شمس المحققین شاہ برہان الدین چشتی

۸۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شاہ میران جی شمس العشاق

۹۔ الٰہی بحرمت حضرت شاہ کمال الدین سرمست بیابانی

۱۰۔ الٰہی بحرمت حضرت شاہ جمال الدین عبداللہ مغربی

۱۱۔ الٰہی بحرمت حضرت صدر الدین ابوالفتح ولی الاکبر الصادق سید محمد یوسف الحسینی الملقب گیسو دراز بندہ نواز قدس سرہٗ۔

۱۲۔ الٰہی بحرمت حضرت ابراہیم الثانی حمید الملت والدین محمود اودھی چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۔ الٰہی بحرمت حضرت سلطان العاشقین رحمۃ العالمین خواجہ نظام الدین بدٰانی۔

۱۴۔ الٰہی بحرمت حضرت فرید الدین گنجشکر۔ اجھودنی۔

۱۵۔ الٰہی بحرمت حضرت قطب الدین وکیل الباب الاوشے چشتی

۱۶۔ الٰہی بحرمت حضرت معین الدین حسن سنجری چشتی

Hanif Razvi

۱۷۔الہٰی بحرمت حضرت ابوالانور عثمان ہارونی

۱۸۔الہٰی بحرمت حضرت حاجی شریف زندانی چشتی

۱۹۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی

۲۰۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ناصح الدین احمد چشتی

۲۱۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ناصرالدین ابویوسف چشتی

۲۲۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ قدوۃ الدین ابومحمد چشتی

۲۳۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ابواسحاق چشتی

۲۴۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ابوابراہیم ممشاد علو دینوری

۲۵۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ امین الدین ابوہبیرۃ البصری

۲۶۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ سید بدرالدین حذیفۃ المرعشی

۲۷۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ امان العرض سلطان ابراہیم ادھم بلخی

۲۸۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ابوالفضل فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ عنہ

۲۹۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ابوالفضل عبدالواحد بن زید رحمتہ اللہ عنہ

۳۰۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ابوالفضل ابوالنصر حسن بصری رضی اللہ عنہ

۳۱۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ابوالفضل ابوالحسن علی ہاشمی علیہ الصلوٰۃ والسلام

۳۲۔الہٰی بحرمت حضرت خواجہ انبیا ابوقاسم ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

صدرالدین نام کے دو بزرگ گزرے ہیں۔ ایک خواجہ صاحب کے معاصر جن کا مزار ایکت پوری (ضلع ناسک) ہیں۔ ان کا سنہ انتقال "برکات الاولیا" کے مصنف کی رو سے ۶۰۷ھ ہے۔ دوسرے بزرگ خواجہ صاحب کے خلیفہ تھے جن کا انتقال ۹۸۹ھ میں ہوا ان کا مزار بڑودہ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ دراصل ان کا نام محمد بن شمس الدین تھا۔ وہ گجرات کے

لہ۔ ملاحظہ ہو برکات الاولیا صفحہ ۸۱ نیز تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول۔

کاملین میں سے تھے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے پچیس تیس برس کی عمر میں ترک دنیا کر کے تجرید و تفرید اختیار کی تھی۔ ۹۵۲ھ میں احمد آباد آ کر محمد غوث گوالیاری سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ ان کے بارے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ کئی سال تک مرشد کی خدمت میں رہ کر بعد "جواہر خمسہ[1]" کے عامل ہوئے۔ شہر مندو میں عرصہ تک چلّہ کش رہے تھے۔ ان کے مریدوں میں شیخ جمال شاہ صادق حسینی، شیخ محمود وغیرہ باکمال بزرگ گزرے ہیں۔

خلاصۃ التوحید

صدر الدین ہی کے قلمی رسائل کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ کل انیس (۱۹) رسالے ہیں جن میں ایک کے سوا سب رسالے اُردو نظم و نثر میں ہیں۔ دو تین اس سلسلے کے بزرگوں کے شجرہ ہیں جن میں دو آنحضرت سے شروع ہو کر تینتیس واسطوں سے حمید اللہ حسینی تک پہنچتے ہیں۔ یہ شجرہ آگے نقل کیا گیا۔ اس میں وہ سارے بزرگ آ گیے ہیں جن کی اردو تصانیف کا تذکرہ ان اوراق میں ملے گا۔ یہ بزرگ خواجہ بندہ نواز کے خلفا میں ہیں جن کا سلسلہ شاہ امین الدین اعلیٰ یا علی تک پہنچتا ہے۔ اس جلد میں ۱۹ رسالے ہیں۔ پہلے دو رسالے تصوف کے ہیں۔ لیکن مصنفین کے نام نہیں ہیں۔

تیسرا رسالہ مفتاح النور منظوم ہے اس کے مصنف صدر الدین ذاکر ہیں۔

پانچواں رسالہ بھی تصوف کا ہے جس کے مصنف کا نام نہیں ہے۔

چھٹا رسالہ خلاصۃ التوحید حضرت خواجہ بندہ نواز کا ہے۔

ساتواں رسالہ تصوف میں ہے اس کے مصنف کا بھی نام نہیں معلوم۔

آٹھواں شجرہ ہے۔

نواں رسالہ شاہ امین الدین اعلیٰ کا ہے۔

دسواں شاہ برہان الدین جانم کے ارشادات پر مشتمل ہے۔

گیارھواں کمال الدین شاہ کا ارشاد نامہ ہے۔

---

[1] چنانچہ رسالہ "مراۃ الاسرار" اسی کی (جواہر خمسہ کی) تشریح ہے۔

بارھواں رسالے کے مصنف کا نام نہیں۔

تیرھواں رسالہ مراۃ الاسرار شاہ محمد صدر الدین کا نثر میں ہے۔

چودھواں شجرہ ہے اور

پندرھواں مصباح النور شاہ محمد صدر الدین کی تصنیف ہے۔

سولہویں سے انیس ویں تک فارسی رسالے ہیں۔

گیارہواں رسالہ ارشاد نامہ کمال الدین شاہ کے نام سے موسوم ہے۔ غالباً یہ وہی کمال الدین ہیں جو شاہ میراں جی شمس العشاق کے پیر تھے اور جمال الدین عبداللہ مغربی کے خلیفہ تھے۔ اور جمال الدین خواجہ بندہ نواز کے خلیفہ ہیں۔ رسالے کے سرنامہ پر صاف طور پر یہ عبارت لکھی ہے۔

"ایں رسالہ خلاصۃ التوحید تصنیف حضرت خواجہ بندہ نواز"

یہ رسالہ بھی خواجہ صاحب کے اور رسالوں کی طرح تصوف کے نکات پر مشتمل ہے۔ اس میں تصوف کے بعض اسرار کی تشریح کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح "نو بطوں" سے کائنات کا ظہور ہوتا ہے۔ نیز "حقیقت محمدی"[1] یا اسم اعظم کیا ہے۔ نو بطوں[2] کی تفصیل صوفیا اس طرح کرتے ہیں۔ :

ہستی مطلق	ہستی مجمل	ہستی مفصل
۱- امین دیکھ	۱- روح مقیم	۱- روح جاری
۲- امین شاہد	۲- انا نور	۲- من نور
۳- امین نور	۳- ممکن الوجود	۲- واجب الوجود

اس کی تشریح خواجہ صاحب خلاصۃ التوحید میں یوں کرتے ہیں :

"امین دیکھ" بولتے ہیں جس وقت دیکھ تصرف نہیں آیا تھا۔ "ادیکھ بھی بولتے

---

[1] اس کی تشریح معراج العاشقین میں کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو مقالہ ہذا صفحہ (   )

[2] "نو بطون" نامی ایک رسالہ سید شاہ میراں جی خدانما سے بھی منسوب ہے اس رسالے میں نو بطوں کی تشریح اسی طرح کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے صفحہ (   ) مقالہ ہذا۔

Hanif Razvi

ہیں۔ ہور اسیچ بولتے ہیں بیچ گنج مخفی کے دو صفتوں سون تھا۔ "امین دیکھ" "امین شاہد" دیکھ ذات شاہد صفات "امین نور" مصدر دو نوں کا، اس مصدر کے تئیں حقیقت محمدی بولتے ہیں۔ امین دیکھ ذات نے بیچ آئینہ امین شاہد صفات کی دیکھا یعنی دیکھتا پنا سوچ نور دستا پنا سوچہ شاہد دستے پنے میں دسیا سوچہ روح مقیم ہے۔

"خلاصۃ التوحید" کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے :

"کنت کنزا" مخفی کے حال کون ذات صفات لا بشرط لا بہ شرائط ولاتعین غیب الغیب وجود الجت مجہول النعت عین اس کا نور......

ذات بلا اعتبار ہور مرتبہ ہویت بولتے ہیں اور بھی ناموا بھوت ہیں ہور اس استطلاحات کون اولیائے کامل و محققان داخل بیچ اصطلاح دکن کے اس حال کا ناوں امین دیکھ بولتے ہیں ہور اسیچ بھی بولتے ہین۔ جس وقت دیکھ تصرف مین نین آیا تھا۔ اوسے ادبچھ بھی بولتے ہیں۔ ہور اسیچ بھی بولتے ہین بیچ کنج مخفی کے دو صفتوں سون تھا۔ امین دیکھ امین شاہد دیکھ ذات شاہد صفات امین نور مصدر دونوں کا اوس مصدر کے تیئں حقیقت محمدی بولتے ہیں امین دیکھ ذات نے بیچہ آئینہ امین شاہد صفات کی دیکھا یعنے دیکھتا پنا سوچ نور دستا پنا سونچ شاہد دستے پنے بن دسیا سونچ روح الروح مقیم یعنی بیچ آئینہ دستے پنے کے اپنا چہ عکس دیا سوچہ روح مقیم ہے۔ امین دیکھ کی سب میں یو نمین شکل پیدا ہوئی یعنی نور شہود روح بعد اس کی امین شاہد نی بیچہ آئینہ امین دیکھ کی دیکھیا سو امین نور نظر آیا۔ یعنی دستے پنے کون دیکھتے پنے مین معلوم کر کر انا نور کہا۔ یعنی دستا پنا بھی بھنیچہ ہور دیکھتا پنا بھی بھنیچہ اس حال کون انا نور بولتے ہین بعد اس کی روح مقیم نے انا نور کون دیکھیا سو روح جاری ہوا یعنی او عکس ہلی جو قایم تھا بیچہ دستے

Hanif Razvi

پنے گے یعنی دسنے کی جس میں آیا سو شکل نی بیچ آئینہ دستے پنے کی معلوم نہے ہین آپ کون آپ دیکھیا ہوں کر دیکھ میں دیکھ پیدا کیا سو اوس دیکھ کا ناون روح جاری ہے جیسا کہ خواب سون ہشیار کیا اما او ہشیارے عروج کی نسبت جین خواب ہے۔ یعنی مجمل کی حال سون مفصل کی حال میں پیدا کیا اوس مفصل کون مجمل کرنا بھوت دشوار ہوا بعد اس کی انا نورنی روح جاری کو دیکھیا سو من نور کی شاہدی پیدا ہوئی یعنی دیکھیا پنا بھی سینچہ دستا پنا ہی سینچہ دستے پنے میں ویسا سو بھی سینچہ ہون کر کر شاہدی پیدا ہوئی سو حال کون من نور بولتے ہیں یعنی انا نور کی حال مین سینچہ نور دستا پنا ہون سینچہ دیکھتا سیا ہون۔

تمثیل نامہ

یہ رسالہ چودہ صفحات پر مشتمل ہے اور نے مجھے بیجاپور میں خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے سلسلے کے بزرگ شاہ امین الدین اعلیٰ کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا اس کے ساتھ خواجہ صاحب کے دو اور فارسی رسالے مصالح القلوب اور تلاوت الوجود بھی منسلک ہیں تمثیل نامہ کا موضوع اخلاق و ہدایت ہے۔ زبان نسبتاً سہل اور طریقہ بیان بھی عام فہم ہے۔ اس کی وجہ ممکن یہ ہو کہ اس میں تصوف کے عوامی اور دقایق کی بحث نہیں ہے۔

اس رسالے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ مال جاہ و دولت ناپائیدار اشیا ہیں قایم رہنے والی ذات صرف باری تعالیٰ کی ذات ہے۔

زبان کے اعتبار سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسالہ "معراج العاشقین" کے بعد لکھا گیا ہوگا کیونکہ اس میں عربی فارسی الفاظ کم اور دکھنی عنصر زیادہ ملتا ہے۔

تمثیل نامہ کا اقتباس حسب ذیل ہے:

"علم پر یا ہون کر یون مستی بکریا ہے تو یو مستی فنا ہے نعیم مستی پادشاہی کا مین پادشاہ ہوں منجی کیا ہوا ہے۔ کر یو مستی بکریا ہے تو یو مستی فنا ہے سا تو مستیاں فنا ہے اللہ کی ذات کی مستی بقا ہے۔ اول حب ذات کا ذات سوا لہ کا بقا ہے دوم "ہب" جانیا نکا سو یو جا نیا دا اپنی پر کی خدا کی خدائی ہے۔ جو لگ تو لگ یو جا

Hanif Razvi

نیات بقا ہے سوم ہب خوبصورتی کا کہیں مین ہماری تن میں ایک حالی صورت ہیں نورانی تن کی ممکن الوجود سورت (صورت) بقا ہے۔ چہارم حب ہنر کا سو محمد کا کہ اپنی پچھانت کرنا ہور خدا کی پہچانت کرنا دوسرا تن ممکن الوجود)۔
اس میں تمثیل کے ذریعے خدا کی حقیقت سمجھائی گئی ہے۔ جو خواجہ صاحب کے بیان کی خاص خصوصیت ہے۔

"اندھاری رات میں جون گھران (گھراد) باراں میں دستی تیون کرنا سو باٹ حقیقت بھی اس اندھاری میں واجب ہور ممکن دستی تین"

تلاوت المعراج

یہ رسالہ سالار جنگ کے کتب خانے کے ایک مجموعہ میں منسلک ہے جس کا نام "چہاردہ رسائل" [1] ہے۔ "چہاردہ رسائل" کے سرورق پہ "رسالہ جات بندہ نوازؒ" لکھا ہوا ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے کہ چودہ کے چودہ رسالے خواجہ صاحب کی تصنیف ہیں لیکن مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوائے چار رسالوں کے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ باقی رسالے دوسرے مصنفین کے ہیں ان میں شیخ ابو الحسن خرقانی کی فارسی تصنیف "چہار پیر و چہار خانوادہ" اور بو علی قلندر پانی پتی کا ایک فارسی رسالہ تصوف بھی شامل ہیں۔ ایک رسالے ہے جس کا عنوان "شرح کلمۂ طیب دکھنی" ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خواجہ صاحب کے کسی مرید کا لکھا ہوا ہے، اس میں مصنف نے جگہ جگہ گولکنڈہ کے والی قطب شاہ کا ذکر کیا ہے اور جگہ جگہ اپنے مرشد خواجہ بندہ نواز کے اقوال کا حوالہ دیا ہے۔ مجموعہ میں چند دکھنی نظمیں بھی شامل ہیں یہ رسالہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کی مذکورہ بالا قلمی بیاض میں بھی منقول ہے اور کمال الدین شاہ کے نام سے منسوب ہے۔ ان پر آئندہ صفحات میں بحث کی گئی ہے۔

جو رسالے خواجہ صاحب سے منسوب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ تلاوت المعراج ۲۔ رسالہ تصوف ۳۔ شکار نامہ

---

[1] نمبر مخطوطہ صفحہ ۲۱۲ فہرست کتب خانہ سالار جنگ [2] فن تصوف صفحہ ۶۲۱ فہرست کتب خانہ سالار جنگ

Hanif Razvi

"تلاوت المعراج" کا ایک اور نسخہ علیحدہ رسالے کی شکل میں سالار جنگ کے کتب خانے میں ہی محفوظ ہے۔ دونوں نسخوں کی عبارت ایک ہے۔ دوسرے نسخے پر بھی "تلاوت المعراج" تصنیف بندہ نواز درج ہے۔ "تلاوت المعراج" کا انداز بیان اور موضوع خواجہ صاحب کی دوسری تصانیف سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے اکثر رسالوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مخاطب کو اکثر اے عزیز سے متوجہ کرتے ہیں اس رسالے میں بھی تصوف اور اخلاق کے مسائل آسان زبان میں سلجھائے گئے ہیں ایک شعر جو "معراج العاشقین" میں درج ہے اس رسالے میں بھی نقل کیا گیا ہے شعر یہ ہے۔ ع

طبیب عشق را دکان کدام است

علاج جان کند او را چہ نام است

اس رسالے کے خواجہ صاحب کی تصنیف ہونے کا ایک مزید ثبوت یہ بھی ہے کہ خواجہ صاحب نے عبدالقاہر سہروردی کی مشہور تصنیف "آداب المریدین" کی شرح کی تھی۔ اس کا ذکر خواجہ صاحب کی تصنیفات کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ "آداب المریدین" کے فقرہ (۹۷) میں بتایا گیا ہے کہ مرید پر لازم ہے کہ وہ نفس کے اخلاق و عادات بدلنے کی کوشش کرے اصل عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے

فرمایا' مرید پر لازم ہے کہ نفس کے اخلاق و عادات بدلنے کی کوشش کرے یعنے معتدل بنائے۔ اخلاق ذمیمہ جیسے غرور۔ مکر۔ ٹھگوپاپن۔ حرص۔ آز و حسد خود نمائی۔ باہم جھگڑا کرنا۔ غیبت کرنا۔ ایک شخص کو دوسرے کے خلاف بھڑکانا۔ بدگمانی۔ بے حیائی وغیرہ ہیں۔ ان کو اخلاق حمیدہ کے ساتھ جو ان کی بالکل ضد ہو بدل دیا جائے۔ [۱]

اس کو وہ اُردو میں "تلاوت المعراج" میں یوں بیان کرتے ہیں :

: اے عزیز : دارو دکھا کر حکیم منع کیا سو پرہیز کرنا اس کا پرہیز ہوے تو

۱۔ انتخاب "آداب المریدین" مترجمہ حافظ عطا حسین صفحہ ۱۶

خوب سن دل کی کان سون ہو ریاد رکھ اول وسواس دوم کینہ سوم کبر چہارم بغض پنجم غضب ششم حسد ۔ ہفتم عذر، ہشتم حرص ۔ نہم ہوس دہم طمع ۔ یازدہم بخیلی ۔ دوازدہم غصہ ۔ سیزدہم مغروری ۔ چہاردہم حرام ۔ پانزادہم فسق ۔ شانزدہم فاحشہ ہفدہم عنانیت (انانیت)، ہیجدہم تکبری ۔ نوازدہم غیبت ۔ بیستم خلاف ۔ بیست ویکم چغلی ۔ بیست دوم ۔ عداوت ۔ بیست وسوم شرک ۔ یہ سب چیز ان کون یہ بات بولتے ہیں ۔ انکون پرہیز کرنا مراقبے کے کونے بندنا :-

"تلاوت المعراج" کا کچھ اور اقتباس درج ذیل ہے :

:- دنیا کے دکھ کے سو چھوٹکارا ہو ویگا یوں پانچھ تن ہے پانچ نفس ہے پانچ دل ہے پانچ روح پانچ منزل ہے پانچ فرشتے ہے ہر ایک تن پر پانچ علت ہے اوسے داروان (دوائیں) ہے اسے موشیب سون بہتارا کامل حکیم ہونا ہے پانچ تن بوجیا فرض ہے ۔ پہلا تن واجب الوجود ہے اس کا مقام شیطانی باٹ شریعت ذکر جلی نفس امارہ اس کا دسنگ عقل و قیاس فرشتہ موکل میکائیل شہادت میدا منزل ناسوت روح حیوانی یعنی سفلی انا یعنی واجب کے انکھاں یوں غیر دیکھا اور حرص کے کاما سون فاغفر لنا سو جسد ناکسون بدبوئی لینا سون بعض زبان سون بد بولنا سو کینا شہوت کون غیر جاگا خرچنا سو گیا ایسے طبیب کامل ہونا بغض (غالباً مرض) پہچاننا تب دارو دینا

" طبیب عشق را دکان کدام است
علاج جان کند او راچہ نام است "

ای عزیز ہر ایک درد کون دارو جدا جدا دیتا اس کی دھات پوچ کر علاج کرنا سب آزاد کون ایکچہ دارو دینا سو اوسی طبیب کم عقل نادان ہے ۔

ای عزیز دارو دکھا کر حکیم منع کیا سو پرہیز کرنا اس کا پرہیز ہوی تو خوب سن دل کی کان

سون ہور یاد رکھ اول وسواس دوم کینہ.......

مراقبہ کے کونے بند نامشاہدے سے میکائیل کے ورد کے پانے سون اور جلیکار اگر کو بلانا سکے گا۔ کارگر دینا ترگس ہور توشفا پاوے گا طبیب فرمائی پرہیز کیے تو اپے طبیب ہوئے گا راست یوں مائی میں ماٹی پاوے۔

تلاوت المعراج میں کبئ تک باتاں بندہ نواز ظاہر باطن فرمائی ہیں جو کوئی مالک جو کوئی سالک اس رسالہ کے خبر رکھ کر چلے گا تو او بھی سالک ہووے گا۔

رسالہ تصوف یہ رسالہ بھی سالار جنگ کے کتب خانہ میں چہاردہ رسایل میں بندھا ہوا ہے۔ اس میں مذہب اسلام اور ایمان کے مسائل کی وضاحت کی گئی۔ اس میں بھی خواجہ صاحب اکثر سامعین کو ای عزیز سے مخاطب کرتے ہیں۔

اقتباس نیچے درج کیا جاتا ہے:

" قولہ تعالیٰ لقد منا اللہ علی المومنین انفسھم المومناة بعث فیھم رسول من انفسھم "

اوس کا معنا خدا خدا کہا مسلمان کو تماری وجود میں محمد کا نور رکھا ہوں سو تن میں اور جانو ہر ایک پر پچھانت کرنا واجب ہے نعمت خدا کیا ہے سو کرنا فرض ہے نہیں تو برا عذاب ہے نبی علیہ السلام کہے ہیں الاسلام علی اخمسہ اس کا معنا یو ہے پیغمبر علیہ السلام کہے ہیں انسان کی بوجن کون کلمہ پانچہ طرہ (طرح) سو ہے۔

اول لا دویم الا سویم الا اللہ چہارم اللہ پنجم ہو۔

(یہ عبارت نسخہ معراج العاشقین، مخزونہ انجمن ترقی اُردو۔ علی گڑھ کے بھی آغاز کی ہے۔)

ای عزیز لا واجب پر ثابت کرنا اللہ ممکن پر ثابت کرنا لا اللہ ممتنع پر ثابت کرنا عارف پر ثابت کرنا ہور واحدین پر ثابت کرنا۔

ای عزیز محمد کو معراج کی قبر (خبر) دینے کی واسطے اپے جبرئیل ہو کر خفی میں اسو جل میں بند سو ہوشیار کر کے عرض کیے حضرت براق پر سوار اٹھئی "

پچھلے رسالوں کی طرح سو یا "واجب الوجود" "عارف الوجود" اور "ممتنع الوجود" کی تشریح دوسرے انداز سے کی گئی ہے "معراج العاشقین" میں بھی اس کی تشریح ہے۔

شکارنامہ

"شکارنامہ" نام کے دو مخطوطے دستیاب ہوئے دونوں کے مطالب ملتے جلتے ہیں۔ صرف عبارتوں میں اختلاف ہے ایک رسالہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے[1]۔ دوسرا رسالہ "یازدہ رسائل"[2] میں منسلک ہے جو کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں ہے۔

شکارنامہ میں ایک تمثیل کے پیرایہ میں "معرفت" کی تعلیم دی گئی ہے۔ تمثیل یہ ہے۔

چار گھر ہوتے ہیں جن میں سے ایک گھر ٹوٹا یعنی ویران رہتا ہے۔ پہلا گھر شریعت دوسرا طریقت تیسرا حقیقت چوتھا معرفت کا ہوتا ہے۔ معرفت کا دروازہ بند رہتا ہے۔ البتہ اس گھر میں ایک محراب ہے جسے قبولیت کا محراب کہا جاتا ہے اس محراب میں ایک ہانڈی رکھی ہوئی ہے جسے عبودیت کی ہانڈی کہا جاتا ہے۔

جب اس ہانڈی کے کاڑنے (نکالنے) کے واسطے ہات انپڑ دیا (بڑھایا) جاتا ہے تو وہ ہاتھ میں آتی سو ایک پتھر ارکھا جاتا ہے جسے بینکا پتھر بولتے ہیں لیکن پانچ گز زمین نیچے کھودی جاتی ہے۔ جس میں پہلا گز ذکر جلی دوسرا گز قلبی تیسرا گز روحی اور چوتھا گز سری اور پانچواں گز خفی کا ہوتا ہے تب وہ ہانڈی ہاتھ آتی ہے۔

"جلی۔ قلبی۔ روحی۔ سری۔ خفی تصوف کی اصطلاحیں ہیں مطلب یہ ہے کہ ان اذکار کے بعد معرفت نصیب ہوتی ہے یعنی ہانڈی ہاتھ آتی ہے"

جب ہانڈی کاڑی (نکالی) جاتی ہے تو اس میں سے عشق کی آگ میں پکا ہوا ایک ہرن نکلتا ہے جو کوئی اسے کھاتا لذت لیتا ہے۔ آخر ایک نے کہا "میرا حصہ دو" یہ میرا حصہ جو کوئی بولیا (بولا) اسے نفس شیطانی بولتے ہیں۔ بالآخر اس مانگنے والے

---

[1] نمبر سلسلہ کتب ۳۴۸۔ [2] کتب خانہ روضتین گلبرگہ نشان (۱۳) اس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ (   ) مقالہ ہذا۔

Hanif Razvi

کو ایک ہڈی دی جاتی ہے وہ ہڈی بھی نیچے گر جاتی ہے جس سے خربوزے کا بیج نکلتا ہے اس کو زردآلو کی بیل لگتی ہے اس بیل کو بُجالی (بوجھی) الگ جاتی ہے۔ (یعنی کیڑا اور دیمک) سو اس کو عورت فرزند ہوتے ہیں اور دینوی بکھیڑا دن میں پھنس جاتا ہے"

مطالب گو ملتے جلتے ہیں لیکن ان دونوں شکارناموں کی عبارت الگ الگ ہے۔ چنانچہ کتب خانہ روضتین کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

حضرت محمد حسینی فرماتے ہیں :

ارشاد کی ترتیب سون شکارنامہ نو باپ اور سات ماں کے ہم چہار فرزند تھے تفصیل اس نو باپ کی یہ ہے یعنی اول باپ نور ذاتی دوم باپ نور محمدی سوم باپ سر چہارم باپ روح پنجم باپ ضمیر ششم باپ فواد ہفتم باپ قلب ہشتم باپ مضغہ نہم باپ تن یہ باپ ہیں۔ اور سات مایو ہین یعنی اول نور دوسرا صفا سیوم ماہوا چہارم مابارا پنجم مانار ششم ماپانی ہفتم ماماٹی اسے سات ما کہتے ہیں۔ اگر کوئی غلط کہیں تو دیکھو حضرت شاہ برہان صاحب اپنے کلمۃ الحقایق کیوں فرمائے اور چہار فرزند یو ہین یعنی اول فرزند عقل قیاس دوم فرزند عقل وہم سوم فرزند عقل کمان چہارم فرزند عقل آگاہ ان میں سکی اور ایک کو جام تین یعنی عقل قیاس ہی نکی ہے۔ یعنی لکھتے ہیں کہ خدا کیسے جیز سر بکا ہے۔ یا مہتاب سر بکا ہے یا آسمان سر بکا ہے۔

مخطوطہ سالار جنگ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

شکارنامہ

نو بابا پانچ ہور سات ماناوان کی ہمین چار فرزندان تین تنکے کپڑے پھاٹے یکسون کپڑے نین جسے کپری نین اس کے آستین میں پیسے تھی چارو ملکو بازار کون گیئے او بازار چوبیس جنیان کا تھا اس میں چہار کمانان تھیان تین توٹیاں یکسون چلہ و گوشہ نہ تھا۔ سو کمانان کے وہان چہار تیر تھے تین توٹی یکسون میانہ وسوفار نہ تھا جسے میانہ و سوفار نہ تھا سو او تیر لیکر چلے جاتی تھی وہاں چہار ہرن تھی تین موی یکسون جیوئے نہ تھا۔ جیسے جیو نہیں اس ہرن کو

Hanif Razvi

میانہ ہور سوفار نہ تھا سو تیر چلے و گوشہ نہیں سو کماں کوں جوڑ کر مار کر پاڑی بعد ازاں
اوسے باندنے کے واسطے لیسری ڈھنڈی دہاں چار لیسریاں تھیاں تین تو ٹیاں
یکسکوں اپنے میانہ نہ تھا۔ سو اوس لیسری باندکر اوسے پکانے کے واسطے لے کر
چلے وہاں چار کھوٹی تھی تین کچھو ٹوٹی یک ممتاج نہیں اس گھر میں گیئے ﴿

روضتین کے کتب خانہ کے خاتمے کی عبارت درج ذیل ہے :

﴿ چار ہرن ہیں تین موئے اور ایک کو جی نہیں یعنی اول ہرن نفس امّارہ دوم ہرن
لوّامہ سویم نفس مطمئنہ یعنی یہ تین موئے اللہ کے یاد میں فعل بطرف غیر سوں یہہ
تینوں سے گذرے یعنی موئے اور چوتھا نفس ملہمہ اوسے جی نین اوس طرفسوں
وہ خبر پونچانہارا ہے سو اوس خبر پہونچانے ہارے کو جی نین یعنی خودی
نین۔ سو کیا سبب.....

ہور چار گز یعنی یوں ہیں اول گز شہادت مبدا دوم گز (گز) شہادت وجدا
سوم گز شہادت حمدا چہارم گز شہادت شہدا یعنی دو تین گز یوں جان
بوجھ کر اس تین سے ابھی گز کی ان کے ہونا چوتھا گز شہادت شہدا یعنی عاشق
ومعشوق مل ذوق لینے ایک کا تو جب اس چوتھی گز کو پہنچ کر اوس میں پینے کی
ہانڈی کو جان لینے کے ہات سے نکالی اوس ہانڈی ہیں وحدانیت کے اکسوں
پکائی یعنی سنجتہ کئے اور ایک جل کیے اور اوسے نور کے تیاں میں نکالے اور چارمٗن
مل کر کھاتے تھے۔ یعنی اس نور میں خدا کی ذات کا ذوق لیتے تھے۔ یعنی لذت
لیتے تھے یعنی جیوں پھول ہیں باس یا جیوں باس ہیں پھول یا جیوں کانڈی میں
یوں بولا اوسے روح المقدس کہتے ہیں۔ یعنی وہ بندہ بولا کہ نفس دل روح سر انور
ذات کہتے ہیں۔ سو وہ کثرت پورا نہیں ہوتا یعنی بندہ کہتے ہیں تو کثرت پورا
نہیں ہوتا ہے۔ یعنی جہاں صاحب تے۔ وہاں بندہ بھی اور جہاں ذات ہے
وہاں صفات بھی تو صاحب کوں کہنا اور بندہ کوں جب اس واسطے بندہ کہا کہ مرا

Hanif Razvi

بھی تقسیم دیو یعنی میری سمجھ کا ذوق ہے سولیون یعنی مجھے بھی ذوق دیو سواوسے ایک ہڈی دیئے یعنی الشریعت والجد الطریقت والجسم والحقیقت والقصام والمعرفت کالمغز یعنی ہڈ حقیقت مغز معرفت ہے یعنی اوسے تحقیقی کا ہڈا دیئے یعنی اس سون نہایت ہوا قول حضرت علی کرم اللہ وجہ من عرفہ نفسہ فقد عرف ربہ اس کے ہاتھ سے ہڈ گرا یعنی تحقیقی کا ہڈ پایا سو خربوزے کا بیج ہوا یعنی ایمان کا بیج ہوا بضوع وبسعون سبقة افضلها قوله لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه وادناها اما نت الا ذا الحب ای سبقة سواوسے زرد آلو کی بیل ہوئی۔ اوس سے کلمہ بیل ہوئی۔ سواس بیل کو بجا لی (توجہی الگی" سو نماز روزہ زکات حج احکام ارکان یہ پھل لگے سواونوں کو سب عالم نے کھائے یعنی علماء فضلا شیخ مشائخ قاضی قضات ان سب عالم نے کھائے یعنی عبادت کا یعنی نماز، روزہ، زکواۃ، حج کا ذوق لیے اور عوام بھی اپنی قدر موافق بندے کے کرتے ہیں یعنی ہر ایک ناون کا ذوق لیتے ہیں یعنی کھاتے ہیں۔ سواونوں کا پیٹ پھوٹ گیا۔ یعنی وہ لوگ ظاہر بندہ گے کرتے ہیں سو یعنی محنت میں پڑتے ہیں اور معرفت کو نین پہنچے سوان کا پیٹ پھوٹ گیا ہے ؁

سالار جنگ کے کتب خانہ کے مخطوطے کے خاتمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

؁ وہاں چار گھر تھے تین ٹوٹی ایک بستا نین سو چہار گھر اول گھر شریعت دوم گھر طریقت سوم گھر حقیقت چہارم گھر معرفت سو یو معرفت کھولتا نین ولی بستا ہے یون گھر حقیقت کا ہے اس معرفت کے گھر میں کہہ گیے وہاں دیکھتے ہیں تو ایک محراب تھا اُسے قبولیت کا محراب بولتے ہیں اس میں ایک ہانڈی تھی اوسے عبودیت کی ہانڈی بولتے ہیں اس ہانڈی کاڑنے واسطے ہات انپڑای تو ہات انپڑیا نین سو ایک پتھر ارکھے اس میں پینکا پتھر بولتے ہیں۔ اس پتھر کے اوپر سوار ہوی تو ہات نیئں انپڑیا، بعدازاں پانچ گز (گز) زمین کھودی اول گز

جلی دوم گز قلبی سوم گز روحی چہارم گز سری پنجم گز خفی۔ پانچویں گز کو اوتر کر عبودیت کی ہانڈی کون کاری اس میں عشق کی آگ تھے پکائی سو ملتا ہوں لطیف سون ملی احد ذات کو اوسے کھائی سو لذتاں لیتے تھے یکس نے بولیا میر تقسیم دیو جو کوئی بولیا اوسے نفسِ شیطانی بولتے ہیں اوسے دی ایک ہڈ اوس کے ہات میں سون او ہڈ پریا سو خربوزے کا بیج ہوا سو طمع بولتی ہیں اوسے زرد آلو کی بیل ہوی سو پیکا ملیا اس بیل کون بجالی لگی سو اسے عورت فرزندان ہوی سو او دنیا کی گرفتاری میں پریا سو پیٹ ہو گیا۔ حضرت بندگی مخدوم اپین انو تھے خبر یز ہوں ؁

روضتین کے مخطوطے میں ایک جگہ حضرت شاہ برہان کے کلمۃ الحقائق کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ روضتین کا مخطوطہ حضرت شاہ برہان کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن دونوں میں نہ صرف لوح پر بلکہ آغاز اور اختتام دونوں مقامات پر اس رسالے کے خواجہ بندہ نواز کے ملفوظ ہونے کی طرف صریحاً اشارہ ملتا ہے۔

میں نے خواجہ صاحب کے تین طرح کے رسالوں کا اوپر تذکرہ کیا تھا۔ یہ رسالہ بھی عرصہ تک سینہ بہ سینہ محفوظ چلا آیا بلکہ ان دونوں مخطوطات سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ یہ کہ ان ملفوظات کے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کے دوران میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے اپنی طرف سے بھی بہت کچھ اضافہ کر دیا۔ اور یہ ضرورت دوسرے بزرگوں کے بھی متعلقہ اقوال بھی نقل کر دیئے ہیں چنانچہ روضتین کے مخطوطے میں شاہ برہان کے اقوال کی طرف اشارے کا اس سے سوا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

دارالاسرار

ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانے میں اس نام کے دو مخطوطے محفوظ ہیں۔ ایک خواجہ بندہ نواز سے منسوب ہے۔ دوسرے رسالے کے مصنف کے نام کا پتہ مرتب فہرست کو نہ چل سکا۔ غالباً ترقیمہ اور آخری حصہ کی کسی عبارت کی بناء پر اوسے "مرید سلطان" کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ سلطان نامی ایک شاعر گذرا ہے جو کرنول کا رہنے والا تھا۔ لیکن ان دونوں رسالوں کی عبارتوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جزوی اختلافات کے سواء وہ بعینہ ایک ہی ہیں۔ مرتب فہرست

نے جو اقتباسات ان دونوں رسالوں سے نقل کیے ہیں وہ لفظ بہ لفظ وہی ہیں۔ ملاحظہ ہو دارالاسرار مخطوطہ نمبر (۱۷۰)[1] نیز دارالاسرار نمبر (۲۱۸)[2]۔

مجھے اس کا ایک اور مخطوطہ بھی دستیاب ہوا ہے۔ جو کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں محفوظ ہے اس رسالہ کی عبارت مذکورہ بالا رسائل سے مختلف ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطہ دارالاسرار میں سارے مسائل نو ابواب یا "نودر" پر منقسم کیے گئے ہیں لیکن روضتین کے کتب خانہ میں یہ تقسیم نہیں ہے۔ اور مقابلے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ ادارہ ادبیات اردو کے دارالاسرار سے بالکل مختلف ہے۔ ادارہ کے مخطوطے میں ایک کے ترقیمہ سے خواجہ بندہ نواز کا ہونا ظاہر ہوتا ہے دوسرے نمبر (۲۱۸) میں ابہام ہے۔ روضتین کے مخطوطہ میں یازدہ رسائل ہیں، خواجہ بندہ نواز سے منسوب رسائل میں منسلک ہے۔

روضتین کے مخطوطے کے آغاز کی عبارت حسب ذیل ہے۔ :

؎ حضرت محمد حسینی فرماتے ہیں پیر کو اور پیغمبر کو اور خدا کو ایک ہیچ کر دیکھنی چاہیے، حضرت علی کہی عرفت ربی بربی و آیت ربی حضرت علی کہے ہیں پچھانا خدا کو خلایق ہیں دیکھا خدا کو یعنی مسلمان کی اڑ سے مسلمان ہے خدا کو پوچھتے یو بھائی بناد دیا ہے۔ ایک نے ایک پوچھیا افسوس تو کیا انا المومن المھیمن یو ناوں خدا کا ہے مومن سوالی پوچھیا موہیمن یو دوسرے کو پوچھتا تو خدا کہا میں پوچھتا ہوں کہ سرکوہی پوچھتا ہوں یو ناوں خدا کا ہے خدای تعالی اپی مومن ہے یعنی خدا کو پوچھتا ہے سو پیغمبر ہی پوچھے ہیں تو سالک ہی پوچھتا ہے۔ ؎

ادارہ ادبیات اردو کے اس دارالاسرار کے آغاز کی عبارت جو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا گیا ہے حسب ذیل ہے :

؎ پہلا در کنت کنزاً مخفی فاحبت ان عرف فخلقت الخلق یعنے

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۲۰۱
[2] " " " " " ۲٦۱

Hanif Razvi

آن سلطان اپنی ذلت کی دریا میں چار راس گنج رکھا تھا بقا کے موتیوں سوں بھر کر
اور اس حال میں یکا یک اس گنج کی طرف نظر کیا اس موتیوں کا اجالا دکھ کر عاشق ہوا۔
مصلحت تجویز میں وہ جو لاج کے موتیاں چھوپا کر رکھنا خوب نہیں بلکہ عاشقاں کے
بازار میں ظاہر کرنا بھلا ہے۔ واجب الوجود کی بات شریعت کا مقام نفس امارہ ہے
ذکر جلی زبان سے بولنا اللہ تعالیٰ منع کیا سوئیں کرنا اور پیر منع کیا سوئیں کرنا سب سے
بہتر ذکر قلبی ہے اور اللہ محبت زیادہ رکھنا ۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے "مرید سلطان" سے منسوب دارالاسرار کی عبارت بھی بعینہ وہی ہے۔ جو اس نام کے ایک سے زیادہ مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ فارسی اور زیادہ تر اردو میں لکھے ہوئے ہیں اس طرح کے صرف تین رسالوں کا اب تک علم ہوا ہے۔ یہ بھی غالباً اس طرح کے اختلافات ہیں جو زبانوں کے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جس کی کچھ تفصیل شکار نامہ کے سلسلے میں دی گئی ہے۔ مرتب کے خیال میں روضتین کا مخطوطہ زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک تو خواجہ صاحب کے ذاتی کتب خانہ کی کتابوں کے ساتھ محفوظ اور آپ سے منسوب رسائل میں منسلک ہے دوسری بات یہ ہے کہ اس میں واضح طور پر ان ارشادات کو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا گیا ہے۔

لیکن یہ ان رسالوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جو خود خواجہ صاحب نے تحریر فرمائے تھے بلکہ اس کا شمار ان رسالوں میں ہوگا جو آپ کے معتقدین نے آپ کی زبان سے سن کر نقل کر لیے تھے۔

دارالاسرار کے نام سے خواجہ صاحب کا ایک فارسی رسالہ بھی موجود ہے۔ مجھ کو تلاش کے باوجود فارسی رسالہ دستیاب نہ ہو سکا ورنہ دونوں کے موازنے سے بہت سے امور کی وضاحت ہو سکتی تھی۔

بندہ نواز کا اسلوب اور زبان

خواجہ بندہ نواز کی تصانیف گو مذہبی نوعیت کی ہیں اور اکثر اخلاق تصوف اور معرفت کے مسائل ان کے موضوع ہیں۔ ان کا اسلوب بیان بھی عالمانہ ہے۔ تاہم ان کا ان ادق مضامین کو پیش کرنے کا طریقہ دل نشین ہے۔ اپنے مطالب کو قابل قبول بنانے کے لیے مولانا رومی کی طرح قصوں اور کہانیوں کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ قطع نظر قدیم زبان متروک الفاظ اور محاوروں کے ان کا یہ خاص طریقہ بہت ہی جاذب نظر ہے۔

شکارنامہ میں قبولیت عبودیت وغیرہ کو تمثیل کے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں :

٭ گھر میں گیے وہاں دیکھتے ہیں تو ایک محراب تھا جسے قبولیت کا محراب بولتے ہیں اس میں ایک ہانڈی تھی جسے عبودیت کی ہانڈی بولتے ہیں ہانڈی کا ٹانے پات اینپڑائے تو بات اینپڑیا نہیں ٭

خواجہ صاحب بھی اگلے دور کے اکثر بزرگوں کی طرح عبارت کو دلچسپ اور موثر بنانے کے لیے موقع بہ موقع اشعار درج کرتے ہیں۔ اس کا ایک فایدہ یہ بھی مقصود ہے کہ مطالب شعر کی مدد سے حافظہ میں زیادہ بہتر طریقے پر محفوظ رہ سکتے ہیں۔ "معراج العاشقین" اور "تلاوت المعراج" میں عموماً انھوں نے بھی طریقہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً پیر کو وہ مجازاً طبیب کامل سے تعبیر کرتے اور لکھتے ہیں :

٭ (۱) پیر طبیب کامل ہونا نبض کو پہچان کو دوا دینا ٭

طبیب عشق را دکان کدام است

علاج جان کند او را چہ نام است[۱]

(۲) "اس کا معنا جب کوئی ساقی ہات سوں دیدار کا شراب پیوے گا یعنی پیر کے ہات سوں مست ہووے گا"۔

لباس زہد و تقوی تا نہ پوشی

شراب معرفت را کے بہ نوشی[۲]

(۳) "خدا کے عشق میں ہو اس کا معنا اس کا اطاعت اس کی خوشی اس کا کہنا"،

"من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی

تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری" [۳]

"ذکر الخفی اس کا معنا عروج تے نزول کوں اینپڑنا"

۱؎ "معراج العاشقین" صفحہ ۱۱

۲؎ " " " صفحہ ۱۸

۳؎ " " " صفحہ ۲۲

مردانِ خدا خدا نہ باشند

لیکن زخدا جُدا نہ باشند[1]

تصوف اور عرفان خواجہ صاحب کے اُردو رسالوں کی خصوصیات ہیں گو کبھی کبھی اخلاق انسانی کی تہذیب بھی ان کے مدنظر رہتی ہے۔ مذہب کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں پر انھوں نے زور دیا ہے۔ مثلاً معراج العاشقین اور شکار نامہ نیز خلاصتہ التوحید میں تصوف کے اسرار و غوامض بیان کیے گیے ہیں تو تمثیل نامہ اور تلاوت المعراج میں اخلاقی مسائل قلمبند کیے ہیں۔ رسالہ وجودیہ میں ایمان اور عقاید سے بحث کی گئی ہے۔

خواجہ صاحب کے اکثر رسالوں اور خاص طور پر اُن کی بعض نظموں جیسے چکی نامہ وغیرہ کی مخاطب عموماً خواتین ہیں جس میں عورتوں کی سمجھ کے مطابق عام فہم اور آسان زبان اور عورتوں کی دلچسپی کی اصطلاحوں میں مذہب کے احکام سکھانے کی کوشش کی گئی اس قسم کی کتب کا سلسلہ سب سے پہلے ان کے والد راجہ قتال حسینی نے شروع کیا تھا۔ چنانچہ ان کی تصنیف سہاگن نامہ کا تذکرہ پچھلے صفحوں میں گزر چکا ہے۔

خواجہ صاحب کی زبان کے بارے میں بھی چند باتیں کہنی ضروری معلوم ہوتی ہیں جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کی ابتدائی زندگی کے کچھ سال دکن میں گزرے۔ اس کے بعد دہلی گیے۔ دہلی میں ان کا قیام ساٹھ برس رہا۔ یہ فطری بات ہے کہ بچپن میں اطراف کی بول چال کا اثر ان پر کافی پڑا تھا۔ چنانچہ جب وہ ساٹھ برس میں دکن لوٹ آئے اور جیسا کہ مولوی عبدالحق کا خیال ہے۔ دکن میں ارشاد و ہدایت کے لیے اُردو میں رسالے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔[2] انھوں نے زیادہ تر دکن کی بول چال کی زبان کو اپنے رسالوں میں استعمال کیا ہے تاہم شمالی ہند کی بول چال کی زبان کا اثر بھی ان پر کافی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم کو خواجہ صاحب کے رسالوں کا مقابلہ بعد کے رسالوں جیسے شاہ میراں جی کے رسالوں کے کرنے سے ہوتا ہے۔

---

[1] "معراج العاشقین"، صفحہ ۲۴ [2] اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ ۲۳

میران جی کے رسالوں کی زبان پر دکھنی کا اثر اور بھی زیادہ گہرا دکھائی دیتا ہے۔

خواجہ صاحب کی زبان میں بھی جملوں کی ساخت کے لحاظ سے وہ خصوصیت موجود ہے جو دکن میں اُردو کے ابتدائی نشو نما کے دور کا وصف ہے۔ چنانچہ وہ جملوں کو راست (Direct) ساخت کے ساتھ استعمال کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے جملے میں فعل متعدی کی ان خاص صورتوں کے موقع پر جب کہ موجودہ ادبی اُردو میں جملے کے فاعل کے ساتھ علامت فاعل "نے" لائی جاتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر جملے کی ساخت مجہول (Passive) ہو جاتی ہے۔ اور فعل کی مطابقت فاعل کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ مفعول کے ساتھ ہوتی ہے دکھنی میں جملے کی ساخت راست ہوتی ہے اور فعل متعدی افعال کی ان خاص صورتوں میں بھی فعل فاعل کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ "معراج العاشقین" کے یہ چند جملے اس کی تائید میں پیش کیے جاتے ہیں: [1]

۱۔ اس کا معنا خدا کہیا

خواجہ صاحب قدیم دور کے اکثر مصنفین کی طرح عموماً حرف ربط کو حذف کر دیتے ہیں:

÷ جیکوئی ساقی ہات سوں ÷ (ساقی کے ہاتھ سے)

میرؔ اور سوداؔ بلکہ غالبؔ کے دور تک بھی حرف ربط کے حذف کی مثالیں ہم کو دستیاب ہوتی ہیں مثلاً:

÷ جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو ÷ غالبؔ

حرف تخصیص و تاکید کی صورت میں دکھنی کے دوسرے مصنفین کی طرح "ج" لاحقے کے طور پر خواجہ صاحب کے یہاں بھی آتا ہے جس کی مثالیں یہ ہیں:

(۱) سب آزار دکوں ایکچ دارو دینا سو اوسی طبیب کم عقل نادان ہے۔

---

[1] اس بحث کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "دکھنی کے چند لسانی پہلو" رسالہ سب رس حیدرآباد دکن جلد ۱۸ شمارہ (۷)

(۲) یعنی دیکھنا پنا سوچ "نور" دتا پنا سوچ "شاہد"

(۳) دستے پنے میں دسیا سوچ روح الروح مقیم

(۴) اپنا چہ عکس دسیا سوچ روح مقیم

شماہر کی قدیم شکلیں بھی وہی ہیں جو دکھنی کے اکثر مصنفین کے ہاں ملتی ہیں مثلاً:-

شخصی

غیر فاعلی	فاعلی
منج (مجھ)	میں
ہمنا۔ہمن۔ہمیں	ہمنا۔ہمن۔ہمین (ہم)
تج (تجھ)	توں (تو)
ان	او وو (وہ)
انون	انون (انھوں)

اعداد سب وہی ہیں جو معیاری اُردو میں استعمال ہوتے ہیں لیکن اعداد ترتیبی خاص طور پر دوسرا تیسرا کی جگہ دسرا اور تسرا استعمال ہوتا ہے۔

کچھ لفظ ایسے ہیں جو اب اُردو میں متروک ہوگیے ہیں جیسے اچھنا (رہنا) دسنا (دکھائی دینا) انپڑنا وغیرہ۔

ماضی مطلق کی صورت میں "ا" سے قبل ایک مختصر "ی" بھی آتی ہے۔ جیسے "چلیا (چلا) "بولیا" (بولا) کہیا (کہا) وغیرہ۔

یعنی الفاظ کا املا عوامی بول چال کے مطابق لکھا گیا ہے، جیسے:

نقا۔ نفع ۔ طرہ ۔ طرح ۔ فام ۔ فہم

اس طرح کی املاکی عوامی شکلیں میر تقی میرؔ اور سوداؔ کے عہد تک بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ میرؔ کے ایک شعر میں مسجد کے بجائے "مسیت" باندھ دیے ہیں:

"ایک اینچ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت"

بندہ نواز کا اثر متاخرین پر

بندہ نواز کے رسالوں نے حقیقت میں اُردو نثر کے لیے نمونے (Model) چھوڑے جس کو ان کے بعد کے لکھنے والوں نے اپنا مطمع نظر بنایا۔ اور کم از کم مذہب اخلاق اور تصوّف پر لکھنے والوں پر خواجہ صاحب کے اسلوب بیان اور زبان کا عرصہ تک گہرا اثر رہا۔

خواجہ صاحب نے جن موضوعات پر لکھا متاخرین میں سے بہتوں نے اس پر طبع آزمائی کی مثلاً ایک موضوع "معراج" ہی پر خواجہ صاحب کے بعد مندرجہ ذیل کئی معراج نامے نظم و نثر میں لکھے گیے۔ مشہور "معراج نامے" جن کا ابھی تک پتہ چل سکا یہ ہیں۔ [۱]

(۱) معراج نامہ بلاقی (منظوم)

(۲) معراج نامہ مختار (منظوم)

(۳) معراج نامہ ابوالحسن قربی (منظوم)

(۴) معراج نامہ ضمیر

(۵) واقعات معراج از رافت

اس طرح تعلیم نسواں کی مبادیات بھی خواجہ صاحب ہی کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ "چکّی نامے" اور "ہند نامے" کے نام سے انھوں نے عورتوں کو آسان زبان میں دینی مسایل بتائے ہیں۔ ان کے بعد شمس العشاق میراں جی [۲] میراں جی خدا نما [۳] نے اس طرف توجہ کی چنانچہ کئی "چکی نامے" ان کے تتبع میں لکھے گیے جن میں دو چکی ناموں کے مخطوطے ادارۂ ادبیات اُردو میں بھی محفوظ ہیں مجھے بیجاپور کے سرکاری میوزیم میں بھی ایک "چکی نامہ" اور ایک "پند نامہ" دستیاب ہوا ہے۔ اس کی بھی مخاطب خواتین ہیں۔

بندہ نواز کے معاصرین اور متقلدین

بندہ نواز نے چھوٹے چھوٹے رسالوں کے ذریعے عوام کے لیے ارشاد و ہدایت کا جو سلسلہ شروع کیا

---

[۱] ان معراج ناموں کے مخطوطے کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہیں۔ [۲] فہرست اُردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۶۸
[۳] فہرست اُردو مخطوطات صفحہ ۶۲

تھا اس کو اس سلسلے کے دوسرے بزرگوں اور خاص طور پر ان کے بیٹے اور پوتے اکبر حسینی اور عبداللہ حسینی نے جاری رکھا۔

اکبر حسینی سنہ ۷۴۳ھ - سنہ ۸۲۳ھ

خواجہ بندہ نواز کے فرزند اکبر بڑے عالم وفاضل تھے۔ ان کے کمالات ظاہری وباطنی کے متعلق خود ان کے والد بزرگوار نے اپنی تصنیف "حظائر القدس" میں اشارہ کیا ہے [1]۔

سنہ ۸۱۱ھ میں بندہ نواز نے انھیں اپنا خلیفہ بنایا لیکن اس کے سات ماہ بعد ہی وہ رحلت کر گیے۔ باپ نے اپنے ہاتھ سے بیٹے کو غسل دیا۔ انھوں نے فارسی عربی اور اردو میں کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) شرح تبصرۃ الاصطلاحات الصوفیہ اس کو خواجہ صاحب کی اجازت سے لکھنا شروع کیا۔ اسے انھوں نے اپنے والد کی کتاب "اسمار الاسرار" کی شرح کے طور پر لکھا تھا لیکن ترجمہ نہ ہو سکی۔ صرف چند اسمار کی شرح کی ہے۔ ساتھ ہی کتاب کے متفرق اور مشکل مضامین کی تشریح کی ہے۔

(۲) کتاب العقاید خواجہ صاحب عقاید اہل سنت میں خود ایک رسالہ تصنیف کرنا چاہتے تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ اکبر حسینی نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے تو ارادہ ترک فرما دیا اور ارشاد فرمایا "محمد اکبر حسینی کی کتاب کافی ہوگی" [2]۔

اردو میں بھی ایک کتاب کا تذکرہ مولوی عمر یافعی [3]۔ نصیر الدین ہاشمی [4] نے کیا ہے۔ عمر یافعی صاحب نے "مجلہ مکتبہ" میں اسے اپنے تعارف کے ساتھ شایع کیا ہے جس کا نمونہ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب دکن میں اردو (طبع چہارم) میں نقل کیا ہے۔

حضرت سید اکبر حسینی کی یہ کتاب بھی اپنے والد کی تصانیف کی طرح متصوفانہ مضامین پر

---

[1]۔ "سیرت بندہ نواز" مصنفہ عطا حسین صفحہ (۱۰)
[2]۔ "سیرت بندہ نواز" مصنفہ عطا حسین صفحہ (۲۹)
[3]۔ مجلہ مکتبہ نمبر ۱ جلد ۱ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء
[4]۔ دکن میں اردو طبع چہارم صفحہ (۳۱)

Hanif Raza

حاوی ہے۔ اس کا نمونہ حسب ذیل ہے:

٭ سنو اے مسلمانون طالب خدا کے بوجھو زندگی سہل ہے جیون کا بھروسہ نہیں۔ موجب حکم حضرت علی کے عمل کرو قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم عجلوا بالصلوٰۃ قبل الفوت عجلوا بالتوبہ قبل الموت۔ یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سون آگے ہور شتابی کرو توبہ مرنے سون آگے یعنی مرید ہو کر توبہ کرنا ہور کفر و ضلالت سون آپس کو پاک کرنا ایک کے تابع ہو کر خدا طلبی میں عافیت کی راہ سنوارنا ٭

عبداللہ حسینی [illegible]

مولوی سید محمد اپنی کتاب "ارباب نثر اردو" میں عبداللہ حسینی کو خواجہ صاحب کا نواسہ اور حکیم شمس اللہ قادری نے "اردو قدیم" میں اور ڈاکٹر زورؔ اردو کے اسالیب بیان نیز "اردو شہ پارے"[1] میں انھیں خواجہ صاحب کا پوتا بتایا ہے لیکن "سیر محمدی" میں حضرت گیسو دراز کا جو شجرہ دیا گیا ہے اس میں عبداللہ حسینی کا نام خواجہ صاحب کی نواسی کے شوہر کی حیثیت سے بتایا گیا ہے۔ اور عبداللہ حسینی سید ابو المعالی کے فرزند بتائے گیے ہیں[2]۔

عبداللہ حسینی اپنے معتقدین کی ہدایت کے لیے حضرت عبدالقادر جیلانی کی تصنیف "نشاط العشق" کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ اس کا ایک مخطوطہ ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اس کا ذکر اسٹوارٹ اپنے کیٹلاگ میں کرتا ہے لیکن علماء کا خیال یہ ہے کہ یہ ترجمہ ناپید ہے۔ اس لیے اس کا نمونہ پیش نہیں کیا گیا۔

مذکورہ بالا دو بزرگوں کے علاوہ مجھے اس مقالے کی تدوین کے سلسلے میں مواد کی چھان بین کرتے ہوئے مزید تین حسب ذیل کارناموں کا پتہ چلا ہے۔ جو اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) "کشف الوجود" مصنفہ شاہ داول

(۲) "رسالہ شاہ قلندر" مصنفہ شاہ قلندر

---

[1] "اردو شہ پارے" صفحہ (۲۰) نیز دیکھو دکن میں اردو صفحہ (۳۹)

[2] "سیر محمدی" (اردو ترجمہ) صفحہ ( )

Hanif Razvi

(۳۰) "ارشاد نامہ کمال الدین شاہ" از خواجہ کمال الدین

شاہ داول

شاہ داول کا رسالہ "کشف الوجود" کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں محفوظ ہے۔ یہ چودہ ورق کا ایک رسالہ ہے جس کا موضوع تصوّف ہے۔ اور لوح پر "رسالہ شاہ داول" مرقوم ہے۔

حالات زندگی

ان کا نام داور الملک اور عرف "شاہ داول" ہے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے بڑے خدا رسیدہ بزرگوں میں ہوتا تھا۔ صاحب "برکات الاولیا" نے ان کے حالات لکھے ہیں۔ اور انھیں مخدوم شاہ عالم کا مرید اور خلیفہ بتایا ہے۔ شاہ داور الملک گجرات کے حکمران سلطان محمود کے امرا میں تھے۔ مخدوم شاہ عالم سے ان کو بڑی عقیدت تھی اور ہر روز ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ بڑے صاحب کرامت تھے۔ "خزینۃ الاصفیا" اور "برکات الاولیا" میں ایک قصہ مذکور ہے کہ ایک روز مخدوم شاہ عالم وضو کر رہے تھے اور داور الملک اپنے ہاتھ سے پانی ڈال رہے تھے اسی وقت "شاہزادہ ملک دکن" جو برص کے مرض میں مبتلا تھا، شاہ عالم کے پاس آیا۔ اور شفا کے لیے درخواست کی۔ وضو سے فراغت کے بعد شاہ عالم نے پانی کے چند قطرے شاہزادے پر چھڑکے، کہتے ہیں اس سے شاہزادے کا مرض جاتا رہا۔ پھر داور الملک سے فرمایا یہ غیبی علم حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو ملا تھا اس کے بعد مخدوم سالار کے ذمہ ہوا اور اب مجھے عطا کیا گیا ہے "

دوسرے بزرگ جن کا نام شاہ داول تھا محمود غزنوی کی فوج میں تھے جس وقت سلطان محمود نے تھانہ (بمبئی) پر لشکر کشی کی یہ بھی اسی کے ہمراہ تھے اور آخر اسی جنگ میں مارے گیے۔ ان کا مزار گجرات میں ہے۔ سنہ وفات ۴۰۹ھ تحریر ہے۔ لیکن یہ تصنیف اول الذکر بزرگ کی معلوم ہوتی ہے۔

"کشف الوجود" کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔:

٭ تمام حمد سزاوار ہے حق سبحانہٗ تعالیٰ کوں ہور صفت اس کا لانہایت ہے ہور صفت محمد کا لاشمار ہے۔ کہاں لگ بولیگا ہور کہاں تلک سکے گا ایتال مذکور سن یو جو دل پر ہور نفس مرید کا سوال ہور جواب ہور لکھیا ہے۔ جو خدا کے دوست دیکھ کر خو ہووین ہور سالک دیکھ کر راہ راست آویں ہور نیکی سون یاد کرین

سوال : طالب مرید ہوتا سو کون ہور مرید ہوتا سو کون ہور مرید کسے کہنا ہور پیر کسے کہنا۔

جواب : مرشد ہوتا سو طلب ہور مرید کرتا سو مطلوب ہور معرفت ربّانی لاثانی بخشنا سو پیر ہور معرفت ربّانی لاثانی پایا سو مرید مرشد کامل اسے کہے جو سہی بتا دے طالب صادق سو سہی۔

پچھارسی قرآن کے لیاس سوان موجود ہے ہور اکہ گرم و خشک ہے ہور باد اگرم و تر ہے۔ ہور پانی سرد و تر ہے ہور ماٹی سرد و خنک ہے یو سب صفتاں ہو اکہاں ہیں۔ ہور ماٹی میں پانچ صفت ہے۔ لمس میں آنا ہور رنگ ہور لذت ہور بوی ہور خالی ہو پانی میں

شاہ داول ہی کے ساتھ اسی دور کے دو اور بزرگوں سید محمد جونپوری اور شیخ بہاؤالدین باجن کے بھی نام ملتے ہیں جنھوں نے اُردو کو تقریر و تحریر کے لیے استعمال کیا۔

سید محمد جونپوری ۸۴۷ھ ۔ ۹۱۰ھ یہ بہت بڑے بزرگ اور صاحب تصرف تھے انھوں نے فرقہ مہدویہ کی بنیاد ڈالی۔ لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے بہت سا زمانہ وطن سے دور سیاحت میں گزارا ان کے بعض اقوال اُردو میں ملتے ہیں مولوی عبدالحق نے تاریخ سلیمانی کے حوالے سے ان کا مندرجہ ذیل جملہ درج کیا ہے جو انھوں نے مشہور بزرگ شیخ احمد کھٹو کی نسبت فرمایا تھا۔ لکھتے ہیں :

"رو پیٹنے خدا کون بوپنچے" [۱]

خُراسان کے سفر میں سلطان حسین کی فوج نے ان کے ساتھیوں کو بہت تکلیف دی جب سلطان کو اس کی خبر پہنچی تو معذرت کی اس وقت انھوں نے سلطان کے سفیر کے سامنے یہ جملہ کہا :

"شہ کی چوٹ شکر کی پوٹ"

ان جملوں کے علاوہ "شواہد الولایت" میں ان کے چند اور بھی دوہرے ملے ہیں۔

---

[۱] ۔ اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ (۳۱)

Hanif Razvi

بہاؤالدین باجن ۷۹۰ھ تا ۹۰۲ھ [1]

شاہ باجن معزالدین کے فرزند تھے جو گجرات کے بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے۔ معزالدین نے سات مرتبہ حج کیا تھا معزالدین کے دوسرے فرزند یعنی باجن کے بھائی شاہ بینان بھی بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔ باجن پہلے عزیز اللہ متوکل کے مرید ہوئے۔ عرب و ایران کی سیاحت کے بعد ہندوستان واپس آئے تو عزیز اللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لیے ان کے بیٹے رحمت اللہ متوکل کے ہاتھ پر بیعت کی۔ باجن نے ایک کتاب "خزانہ رحمت" کے نام سے لکھی جس میں اپنے مرشد کے ملفوظات اور ارشادات جمع کیے ہیں خزانہ رحمت کے ایک بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باجن نے شمال میں خراسان اور جنوب میں سیلون تک سفر کیا تھا۔

شاہ کمال الدین

پروفیسر عبدالقادر سروری کے کتب خانہ کی بیاض میں جس کا ذکر سابق میں گذر چکا ہے خواجہ صاحب کے رسالے "خلاصتہ التوحید" اور شاہ میراں جی "شمس العشاق" کے رسالہ تصوف کی کچھ عبارت کے ساتھ خواجہ کمال الدین کا ایک رسالہ "ارشاد نامہ"، خواجہ کمال الدین بھی منقول ہے۔ سرنامہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔:

"ارشاد نامہ کمال الدین شاہ صاحب قدس سرہٗ العزیز"

اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

" کلمہ طیبہ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ
لاَ اِلٰہَ نہیں کوئی اللہ بندگی لینے کی اور خدائی کی لایق "

اختتام مندرجہ ذیل فارسی عبارت پر ہوتا ہے:

: آنگاہ مقراض راند بر موی پیشانی سہ موی ببرد و بجائے آن
تخم سعادت بہ نشاند :

ان چند جملوں سے بڑھ کر اس رسالے کی کچھ عبارت منقول نہیں ہے۔

---

[1] سنہ وفات میں اختلاف ہے پروفیسر ابراہیم ڈار اپنے مقالہ گوجری اور اُردو میں اہل گجرات کے قصہ میں ۹۰۲ھ لکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے صوفیائے کرام میں ۹۱۲ھ درج کیا ہے۔

Hanif Raza

خواجہ کمال الدین شاہ میران جی کے پیر تھے جن کو خرقہ خلافت خواجہ بندہ نواز کے خلیفہ جمال الدین مغربی سے عطا ہوا تھا۔[۱] یہ بڑے باخدا بزرگ تھے۔ شاہ میران جی نے ان کی مدح میں جو اشعار لکھے ہیں ان سے ان کی روحانی عظمت اور علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اشعار ان کی مثنوی "شہادت التحقیق" میں لکھے گیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

اس کمالیت کا سنگ — اس خاندان کا رنگ
ان گمائے اپنا حال — تو ہوئے پیر کمال
کچھ تھے نصیب میرے — یگ دیکھے تو ان کیرے

رسالہ شاہ قلندر

سالار جنگ کے کتب خانہ میں "چہاردہ رسائل" کا مجموعہ موجود ہے اس میں ایک رسالہ "رسالہ شاہ قلندر"[۲] بھی ہے۔ اس رسالے کے ترقیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ قلندر خواجہ بندہ نواز کے نبیرہ شاہ یداللہ حسینی کے مرید تھے۔ ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:

"نظر میں پایا موتی۔ شاہ یداللہ دستا جوتی۔ دیکھا جوت دستا موں میں کیا تھا دستا کون۔ تب قلندر دل کے اندر ظاہر ہے۔ شاہ یداللہ ہمامی ہے بخت او نچے نامی ہے"

اس رسالے کی عبارت وجہی کی "سب رس" کی طرح مسجع و مقفی ہے لیکن وجہی کا اسلوب زیادہ فنکارانہ اور ترقی یافتہ ہے۔ یہ مسجع اور مقفی عبارت کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے۔ اس میں کہیں کہیں ابہام بھی ہے۔ اکثر محققین کو "سب رس" کے اسلوب بیان کی رنگینی کے مد نظر یہ خیال تھا کہ ایسا ادبی شاہکار یکایک پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے پہلے بھی یہ طرز نگارش رائج رہ چکا ہوگا۔ شاہ قلندر کے اس رسالے کی دریافت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محققین کا اندازہ غلط نہیں تھا اور یہ رسالہ اور "تاج الحقایق" اسی گمشدہ سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ شاہ یداللہ۔ بندہ نواز کے چھوٹے بیٹے اصغر حسینی عرف میاں لہرہ کے فرزند اکبر تھے۔

---

[۱] ان کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔ بیجاپور میں شاہ میران جی کے پائین ان کا مزار ہے۔ خدام کو خواجہ بندہ نواز کا خلیفہ اور خسر بتلاتے ہیں۔ ان کی صاحبزادی بی بی رضا خاتون سے بندہ نواز نے عقد کیا تھا۔

[۲] ملاحظہ ہو مقالہ ہذا صفحہ (   )

Hanif Razvi

تذکرہ نگاروں نے ان کے علم وفضل اور معجزہ وکمال کے متعلق بہت سی روایات بیان کی جاتی ہیں[1]۔ ان کے ملفوظات "محبت نامہ" کے نام سے مدون کیے گیے ہیں اور کتب خانہ روضتین میں مخطوطے کی شکل میں ہیں۔ خواجہ صاحب نے ان کی تعلیم وتربیت میں خاص دلچسپی لی تھی۔ لکھا ہے کہ اس زمانے کے مشہور علما قاضی بہاؤالدین۔ قاضی سراج الدین وغیرہ سے علوم متداولہ کی تکمیل کرائی۔ تذکروں میں یہ بھی منقول ہے کہ خواجہ صاحب نے ان کو اپنی زندگی میں ہی اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔

شاہ ید اللہ حسینی نے بھی اپنے دادا کی طرح دعوت حق اور ارشاد وہدایت کا کام جاری رکھا۔ ان کا مزار خواجہ صاحب کی گنبد سے چند گز کے فاصلے پر واقع اور "چھوٹے روضہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تاریخ وفات ۸۵۲ھ "شہنشاہ یقینی" سے برآمد ہوتی ہے۔

شاہ قلندر جن کا رسالہ مجھ کو ملا ہے ان ہی ید اللہ کے مرید تھے۔ اس رسالہ کا اقتباس حسب ذیل ہے :

عشق بلند ہے۔ واز عشق معشوق عاشق را زعشق قدیم آرائش عشق دکھاوے۔ بدانش عشق ہے دستیا۔ لذت ہے محبوب عشق دیکھا عشق سب کا لذت لیا۔

عشق حالت سب مغلوب۔ طلب طالب وہیں مطلوب عشق نور ہنوز ظہور عشق۔ نظر میں پایا موتی شاہ یداللہ دستا جوتی دیکھا جوت دستا موں میں کیا تھا۔ دستا کون تب قلندر دل کے اندر ظاہر ہے۔ شاہ حامی ہے بخت اونچے نامی ہے۔

عرض میرا ہوا تمام۔ فرض تھا میرا کام۔ یقین رہبر یقین جان۔ یقین ثابت وہی ایمان ہے۔ عاشق درود بولیا یک ایمان پر رسول خدا ؏

---

[1] تاریخ خورشید جاہی و"مراۃ الاسرار" عبدالرحمن چشتی قلمی مخطوط روضتین گلبرگہ۔

Hanif Razvi

لغات — "آداتُ الفضلا" اور "شرف نامہ" جن کا سرسری ذکر پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے یہ بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لغتوں میں بھی اُردو کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ لغات اور ان میں مندرج الفاظ نثر کے دائرے میں نہیں آتے تاہم ان سے زبان کے اس زمانے تک نشو نما اور اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"آداتُ الفضلا" کا نمونہ پروفیسر محمود شیرانی نے دیا ہے۔ اس کو بدرالدین محمد دہلوی نے ۸۲۲ھ میں لکھا تھا۔ اس میں چھت۔ مور۔ السی۔ گرگٹ۔ ہانڈی۔ تنبول۔ مامہ۔ ملکنی۔ گھنٹی۔ اور بہت سے اُردو کے لفظ ملتے ہیں۔ مثلاً:

ہندی مرادف	اصل لغت
چھت	اشکوب
گھنٹی	درائے
گرگٹ	آفتاب پرست

شرف نامہ — اس لغت کا تذکرہ محمود شیرانی اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ اس کے مصنف ابراہیم قوام فاروقی بنگالے کے رہنے اور شرف یحییٰ منیری کے مرید تھے۔ انھوں نے رکن الدین باربک شاہ کی فرمائش پر یہ لغت لکھی تھی۔ اس کی تدوین میں انھوں نے اس سے پہلے کی ساری لغات سے مدد لی تھی۔ اس میں بھی بہت سے فارسی الفاظ کے مترادفات اُردو میں دیے گیے ہیں جن میں سے چند "پنجاب میں اُردو" سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں: [1]

ہندی مرادف	اصل لغت
کراہی (کڑھائی)	پاتلہ
راکھ	خاکستر

---

[1] اس کے علاوہ پروفیسر محمود شیرانی نے فارسی "گزر" کا مرادف اُردو لفظ گاجر بھی لکھا ہے لیکن حقیقت میں "گزر"، گاجر کا مفرس روپ ہے۔

Hanif Razvi

اصل لغت	ہندی مرادف
شب تاب	جگنی
طلق	ابر
خردل	رائی
خرفہ	لونگٹ

Hanif Razvi

۵

شاہ میران جی کی نثری تصانیف

میران جی کا عہد

سلاطین بیجاپور کی علم دوستی

میران جی کی عظمت

حالات زندگی

سنہ وفات و پیدائش اور جائے پیدائش
کے بارے میں اختلافات

تصانیف:۔ نظم - گنج عرفان -

"شہادت التحقیق"

"خوش نامہ" - خوش نغز

نثر:۔

"گلباس"

"جل ترنگ"

شرح مرغوب القلوب

"سب رس" کا اصل نام "تاج الحقایق"

تاج الحقایق کے مصنف وجیہہ الدین علوی

وجیہہ الدین کے حالات زندگی

تصانیف: دیگر معاصرین

میران جی کے فن کی خصوصیات

Hanif Razvi

شاہ میران جی کے نثری کارنامے

تاریخی پس منظر

اُردو نثر کی تاریخ میں آٹھویں صدی ہجری کا ربع اول سید شاہ راجو اور ان کے خاندان کی خدمات کا عہد تھا۔ سید شاہ راجو نے نثر کی بنیاد رکھی اس پر ان کے فرزند سید محمد حسینی گیسو دراز نے عمارت اٹھانی شروع کی گیسو دراز کے پوتے عبداللہ حسینی اور ان کے دوسرے معاصرین نے اس عمارت کو اور اونچا اٹھایا۔ نویں صدی کا نصف آخر شاہ میرانجی شمس العشاق اور ان کے خاندان کی خدمت کا عہد کہلا سکتا ہے۔

شاہ میرانجی بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں کے ابتدائی دور میں بیجاپور تشریف لائے۔ انھوں نے اور ان کے فرزند اور پوتے نے عادل شاہی حکومت کے تقریباً سارے دور میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ عادل شاہی حکومت بہمنی حکومت کے انقراض کے بعد قایم ہوئی تھی۔ اس کا بانی یوسف عادل شاہ (۸۹۵ھ تا ۹۱۶ھ) سلاطین عثمانیہ کے خاندان سے تھا۔[۱] جو محمود گاواں کے عہد میں دکن آیا۔ محمود گاواں نے اس کی قابلیت اور ذہانت دیکھ کر اسے بادشاہ کے "امیران صدہ" میں شامل کروا دیا۔ محمود شاہ بہمنی (۸۸۷ھ تا ۹۲۴ھ) کے زمانے میں سلطنت بہمنی کا خاتمہ ہوا تو بیجاپور آکر اس نے اپنی سلطنت قایم کرلی۔ اور "سلطان" کا لقب بھی اختیار کرلیا اس کی اولاد میں حسب ذیل نو حکمران گزرے ہیں۔ اس خاندان میں دو سو برس کے لگ بھگ حکومت رہی۔:

(۱) یوسف عادل شاہ ۸۹۵ھ تا ۹۱۶ھ

---

[۱] ۔ "بساتین السلاطین" (دبستان اول) صفحہ ۵

Hanif Razvi

(۲)	اسمٰعیل عادل شاہ	سنہ ۹۱۶ھ تا سنہ ۹۴۱ھ
(۳)	ملو عادل شاہ	سنہ ۹۴۱ھ
(۴)	ابراہیم عادل شاہ	سنہ ۹۴۱ھ تا سنہ ۹۶۵ھ
(۵)	علی عادل شاہ اول	سنہ ۹۶۵ھ تا سنہ ۹۸۸ھ
(۶)	ابراہیم عادل شاہ ثانی	سنہ ۹۸۸ھ تا سنہ ۱۰۳۳ھ
(۷)	محمد عادل شاہ	سنہ ۱۰۳۳ھ تا سنہ ۱۰۶۷ھ
(۸)	علی عادل شاہ ثانی	سنہ ۱۰۶۷ھ تا سنہ ۱۰۸۳ھ
(۹)	سکندر عادل شاہ	سنہ ۱۰۸۳ھ تا سنہ ۱۰۹۷ھ

دو سو سال کے اس عرصہ میں بیجاپور میں اُردو کے کئی مشہور شاعر اور مصنف گزرے جن میں قابل ذکر یہ ہیں:

شمس العشاق میراں جی۔ برہان الدین جانم۔ شاہ امین الدین اعلیٰ۔ عبدل۔ آتشی۔ مقیمی۔ امین۔ شوقی۔ صنعتی۔ علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی۔ ملک خوشنود۔ اشمی۔ دولت۔ نصرتی۔ شاہ ملک۔ ایاغی۔ معظم۔ قادر۔ مومن۔ قدرتی۔ سیوا۔ ہاشمی۔ قادر[1]۔

دوسری طرف گولکنڈہ کے قطب شاہی حکمران بھی ان ہی کے معاصر تھے۔ علم و ادب کی ترقی میں کوشاں تھے۔ دونوں حکومتوں نے اردو شعر و ادب کی سرپرستی کے سلسلے میں ہمیشہ ان روایات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جو ان کے پیش رو بہمنی حکمرانوں نے قایم کیے تھے۔ عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں میں معاصر ہونے کے باعث ثقافت و تہذیب اور شعر و ادب کی روایات کے تبادلے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کبھی وہ آپس میں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے تو کبھی شادی بیاہ کے بندھنوں سے رشتۂ محبت استوار کیا۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں درباروں اور ان کے متوسل شاعروں اور ادیبوں میں بھی مسابقت کی یہ روح کارفرما رہی جس نے فنونِ لطیفہ مثلاً شاعری۔ موسیقی۔ مصوری اور تعمیر وغیرہ کو کافی مالا مال کیا۔

---

[1] "اردوئے قدیم" صفحہ ۱۸ تا ۹۲ (طبع سوم) نیز "اردو شہ پارے" صفحہ ۲۳ تا ۶۷ اور "دکن میں اردو" صفحہ ۱۳۲ تا ۲۱۷ طبع چہارم۔

Hanif Razvi

ادیب اور شاعروں نے جس طرح ایک دوسرے کو متاثر کیا اس کا ثبوت ان کے کلام میں بعض اشاروں سے ملتا ہے۔ چنانچہ "چندر بدن ماہ یار" کا مصنف مقیمی بیجاپوری صاف طور پر اعتراف کرتا ہے کہ اس نے مثنوی کے فن کو غواصی کے نمونوں سے سیکھا تو دوسری طرف نصرتی اسی غواصی پر لطیف پیرایہ میں تعریض کرتا ہے۔

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ عادل شاہی حکمرانوں نے اردو ادیبوں کی دل کھول کر سرپرستی کی ان میں سے بعض کو خود بھی تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کی جو "جگت گرو" کے نام سے موسوم تھا۔ ہندوستانی موسیقی کے موضوع پر ایک کتاب "نورس" مشہور ہے جس کا دیباچہ فارسی کے مشہور شاعر ملا ظہوری نے لکھا تھا۔ علی عادل شاہ ثانی بھی اچھا شاعر تھا اور شاہی تخلص کرتا تھا۔ اس کا دیوان اس کی یادگار ہے۔ اس خاندان کے نہ صرف حکمرانوں ہی کو ادب کا ذوق تھا بلکہ خواتین نے بھی اردو شعرا اور مصنفین کی سرپرستی کی۔ اسی سازگار ماحول میں شاہ میراں جی نے اردو تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا ان کو اپنے اسلاف سے نثر کے جو نمونے بہم پہنچے تھے۔ ان کو انھوں نے اپنا رہنما بنایا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ نثر کو زیادہ عوامی بنانے کی بھی کوشش کی۔ تاکہ ان پڑھ اور جاہل لوگ بھی ان کے دینی ملفوظات اور متصوفانہ ارشادات کو سمجھ سکیں۔ اور ان سے فایدہ اٹھا سکیں خواجہ بندہ نواز کے مخاطب پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے جس کے سبب وہ باریک متصوفانہ، اخلاقی اور عرفانی مسایل کو زیادہ عالمانہ انداز میں پیش کر سکتے تھے۔ اس کے برخلاف شاہ میراں جی کے رسالوں میں عوام اور ان پڑھ لوگوں اور خاص کر خواتین کی سمجھ بوجھ کی رعایت زیادہ نظر آتی ہے۔ اسی لیے خواجہ بندہ نواز کے رسالوں کے اسلوب کے مقابلے میں شاہ میراں جی ان کے فرزند اور خلیفہ شاہ برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ کی عبارتیں بول چال کی زبان سے زیادہ قریب اور نویں صدی ہجری کی گفتگو کی زبان کے نمونے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ارتقاء کے فطری اصول کی کارفرمائی کی بدولت شاہ میراں جی کے رسالوں کے مقابلے میں شاہ برہان الدین اور ان کے فرزند امین الدین اعلیٰ کے اسلوب تحریر میں رفعت زیادہ جھلکتی ہے۔ تاہم عوام کے قلوب کی گہرائیوں تک پہنچنے کی سعی ان کی تحریروں سے بھی ظاہر ہے۔

شاہ میراں جی کی ہستی حقیقت میں اپنے عہد کی بڑی برگزیدہ ہستی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب

Hanif Razvi

کا خیال تو یہ ہے کہ دکن میں اُردو کا نشو نما انھیں کے روحانی فیض کی بدولت تھا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

"شاہ میراں جی بڑے بابرکت بزرگ تھے۔ انھوں نے بیجاپور میں ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے جانشین یکے بعد دیگرے کئی پشت تک بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق ہوئے۔ اور انھوں نے اسی کو اپنی زبان سمجھا۔ اور اسی زبان میں سلوک و معرفت پر متعدد رسالے اور نظمیں لکھیں۔ اس خاندان کے مریدوں اور معتقدوں نے بھی اپنے مرشدوں کی پیروی میں اسی زبان کو اپنی تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا۔ یہ اسی مبارک خاندان کا اثر تھا کہ بیجاپور میں زبان کو اسقدر فروغ حاصل ہوا۔ اور وہاں ایسے خوش بیان اور بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جن کی نظیر اردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے"[1]

اس ہیرے کی تابش پر جو گھورے پر پڑا تھا۔ پہلے سید شاہ راجو کی پھر گیسو دراز اور پھر میراں جی کی نظریں پڑیں اور انھوں نے اسے بادشاہوں اور امیروں کے تاج کی زینت بنا دیا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں کہ اہلِ علم کی نظروں میں اس زبان کی وقعت نہیں تھی۔ لیکن اس کی مثال ایسی ہے جیسے "گھورے پر کا ہیرا"۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی پرکھنے والا آدمی ہیرے کو پتھر سمجھ کر پھینک نہیں سکتا تھا۔

"شہادت التحقیق" ان کی ایک طویل نظم ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"یو دیکھت ہندی بول ۔۔۔ پن معنے ہے نپ انمول
کرڑوے پن سو رس ۔۔۔ پھل پا کے جوں پھنس
جیسے مغز میٹھا لاگے ۔۔۔ تو کیوں من اس تھے بھاگے
ہے کڑوا ان کیرا ہیرا ۔۔۔ گھورا اوپر پڑیا ہے ہیرا"[2]

اس ہیرے کی ضیا کو انھوں نے عوام کے گھروں تک پہونچانے کی کوشش کی اور اپنی تصانیف کے ذریعہ ان کی ذہنی تاریکیوں کو دور کرنے کی جہد بلیغ کی۔

---

[1] "اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۵۰ (طبع اول)
[2] " " " " صفحہ ۵۴ (طبع اول)

حالات زندگی

شاہ میراں جی جو "شمس العشاق" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ارشاد و ہدایت کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ "خزینۃ الاصفیا" کے مصنف نے ان کا نام "میاں جی" بتایا ہے [۱]۔ لیکن "تذکرہ اولیائے دکن" و "برکات الاولیا" میں ان کا نام میراں جی اور لقب "شمس العشاق" [۲] بتایا گیا ہے۔ سخاوت مرزا صاحب اپنے ایک مضمون "قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض" [۳] میں ان کا نام امیر الدین میراں جی بتاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے

ڈاکٹر عبد الحق اپنی تصنیف "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں لکھتے ہیں:

"آپ مکہ میں پیدا ہوئے اور کچھ دنوں بعد ہندوستان آئے" [۴]

مصنف "برکات الاولیا" [۵] مصنف "تذکرہ اولیائے دکن" [۶] اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "ارشاد نامہ" کے دیباچے میں ان کا مولد بیجاپور بتاتے ہیں [۷]۔

مصنف اولیائے دکن لکھتے ہیں:

اوائل میں جب محبت الٰہی غالب ہوئی دنیوی تعلقات سے دستبردار ہو کر حرمین شریفین کی زیارت کو روانہ ہوئے

"برکات الاولیا" میں لکھا ہے:

آپ مشاہیر مشائخین کرام بیجاپور سے ہیں

حکیم شمس اللہ قادری بھی اپنی کتاب "اُردوئے قدیم" میں اس کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن مصنف "خزینۃ الاصفیا" آپ کی جائے پیدائش مانڈو (مندو) یعنے شادی آباد مالوہ بتاتے ہیں۔

---

[۱] "خزینۃ الاصفیا" جلد اول صفحہ (۴۰۱)

[۲] "تذکرہ اولیائے دکن" صفحہ ۸۴۳ و برکات الاولیا صفحہ ۱۱۵

[۳] "رسالہ اُردو" اکتوبر ۱۹۵۰ء جلد ۲۹ نمبر ۴ صفحہ ۲۹

[۴] "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۴۹ (طبع اول)

[۵] "برکات الاولیا" صفحہ (۱۱۵)

[۶] "تذکرہ اولیائے دکن" صفحہ (۸۴۳)

[۷] دیباچہ "ارشاد نامہ" سلسلہ مجلس دکنی مخطوطات

"خزینۃ الاصفیا" کی عبارت حسب ذیل ہے :

* شاہ میاں جی بیک واسطہ مرید محمد گیسو دراز است و درویش کامل و اکمل بود در زمان وے در ولایت منڈو کسے از وے بزرگ تر نہ بودے * [1]

اسی طرح سنہ ولادت اور وفات دونوں کے بارے میں بھی علما میں اختلافات ہیں اور "برکات الاولیا" میں سنہ وفات ۸۰۱ھ ہجری درج ہے۔ "خزینۃ الاصفیا" میں ۹۰۸ھ لکھا ہے۔ اس کے مولف نے ان کی تاریخ وفات ذیل کے اشعار سے نکالی ہے :

میاں جی شاہ شاہنشاہ عالی — چو رفت از دار دنیا سوئے جنّت
رقم کن کاشف ممتاز سالش — وگر فرمان دہی بدر کرامت [2]

"روضۃ الاولیائے بیجاپور" اور "تاریخ خورشید جاہی" میں سنہ وفات ۹۰۲ھ بتایا گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے بھی اس کو مستند مانا ہے۔ تاریخ وفات ۲۵۔ شوال اور ۹۰۲ھ بتایا ہے۔ ڈاکٹر زور اس تاریخ کو مستند نہیں مانتے۔ ڈاکٹر زور صاحب کا خیال ہے کہ ۹۰۲ھ شاہ میراں جی کا سنہ پیدائش ہے اور ۹۷۰ھ سنہ وفات، اس خیال کی تائید میں انھوں نے حسب ذیل وجوہات پیش کی ہیں [3]۔

* تمام تذکرے اس امر کے اظہار میں متفق ہیں کہ شاہ میراں جی بیجاپور کو علی عادل شاہ کے عہد میں تشریف لائے علی عادل شاہ ۹۶۵ھ میں تخت نشین ہوا اور ۹۸۸ھ میں فوت ہوا۔ اس طرح شاہ میراں جی کا ورود بیجاپور میں ۹۶۵ھ کے بعد ہوا۔ اور انھوں نے چند ہی سال قیام کیا تھا کہ وفات پائی تذکروں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مقیم ہونے کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا *

۲۔ تمام تذکرے اس امر میں بھی متفق ہیں کہ شاہ صاحب نے عربستان سے واپسی پر

---

[1] "خزینۃ الاصفیا" جلد اول صفحہ ۴۰۱

[2] " " " ۴۰۶

[3] دیباچہ "ارشاد نامہ" مطبوعہ انجمن دکھنی مخطوطات حیدرآباد صفحہ ۶

Hanif Razvi

قلعہ بیجاپور کے حصار کے باہر قیام کیا اور یہ قلعہ ۹۱۸ھ میں تعمیر پایا۔ عبدالحق صاحب نے شاہ صاحب کی تاریخ پیدائش کو تاریخ وفات فرض کر کے قدیم تذکروں کے اس بیان کو کہ علی عادل شاہ کے عہد میں شاہ میراں جی بیجاپور آئے غلط بتا کر یہ قرار دیا کہ شاہ صاحب یوسف عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور آئے ہوں گے۔ حالانکہ یوسف عادل شاہ ۹۱۵ھ میں انتقال کر چکا تھا۔ اور حصار ۹۱۸ھ میں تعمیر ہوا۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب جب حصار کے بننے کے بعد بیجاپور آئے تو ۹۰۲ھ ان کا سنہ وفات کس طرح قرار پا سکتا ہے؟

۳۔ ایک اہم اور قابل غور دلیل ۹۰۲ھ شمس العشاق کے سنہ وفات کے بجائے سنہ پیدائش ہونے کی یہ بھی ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے اس سنہ کو صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاہ میراں جی کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کی وفات سو سال سے زیادہ عمر میں ہوئی خود مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ "اردو" میں اپریل سنہ ۱۰۶۸ء تحریر فرمایا:

٭ شاہ برہان کا ایک رسالہ ۹۹۰ھ کی تصنیف ہے اور چونکہ یہ سنہ خود انھوں نے اپنی نظم میں لکھ دیا ہے۔ اس لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ہمارے خیال میں یہ ان کی آخری تصنیف تھی۔ اس کے علاوہ ان کی ایک نظم "نکتہ واحد" کے نیچے ان کی زبانی دو فرمان لکھے ہیں جن میں سے ایک کی تاریخ ۲ صفر ۹۶۷ھ ہے اور دوسرے کی ۹۷۷ھ درج ہے اس سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان سنین میں زندہ تھے ٭

غرض ۹۹۰ھ میں اگر شاہ برہان نے وفات پائی تو گویا اپنے والد کی وفات کے ۸۸ سال بعد فوت ہوئے اور والد کی وفات کے وقت ان کی عمر ۲۰ سال سے کم نہ ہوگی۔ کیونکہ تمام تذکروں میں یہ درج ہے کہ وہ اپنے والد کے نہ صرف مرید بلکہ خلیفہ بھی تھے ٭

Hanif Raza

اس لحاظ سے اکثر تذکروں میں آپ کی جو عمر بتائی گئی ہے اس میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔ "برکات الاولیا" کے مصنف کے خیال کے مطابق انھوں نے ۱۲۰ سال کی عمر پائی لیکن عبدالجبار خان ملکاپوری مصنف "تذکرہ اولیائے دکن" کی تواریخ کے اعتبار سے جس کو ڈاکٹر زور نے بھی مستند مانا ہے۔ شاہ میرانجی کی عمر وفات کے وقت ۶۸ برس کی ہونی چاہیے۔

مصنف "تذکرہ اولیائے دکن" کے خیال کے مطابق ان کا قیام مدینہ منورہ میں بارہ سال تک رہا اور ہر سال وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوتے رہے۔ آپکے زہد و اتقا کے بارے میں بہت سے تذکرہ نگار متفق ہیں۔ عبدالجبار خان ملکاپوری لکھتے ہیں کہ جب تک وہ مکہ معظمہ میں رہے، ساری مدت حرم نبوی کے سامنے ایک ہی پہلو پر سویا کرتے تھے۔ تاکہ حرم نبوی کی طرف پیٹھ نہ ہو سکے۔ یہیں ان کو دکن جانے کی ہدایت ملی۔ شاہ میرانجی کو یہ خیال ہوا کہ میں دکن کی زبان سے ناواقف ہوں وہاں کس طرح خدمت انجام دے سکوں گا۔ اس پر شریف مکہ کے توسط سے یہ بشارت دی گئی کہ انھیں وہ زبان آجائے گی۔

مصنف "اولیائے دکن" لکھتے ہیں کہ شریف مکہ کو عالم رویا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے میرانجی کو اپنے سلاح خانہ سے ایک علم بھی دینے کی ہدایت کی تھی نیز یہ بھی ارشاد ہوا تھا وہ علم لیکر دکن جائیں کیونکہ ہم نے ان کا حصہ وہیں محفوظ رکھا ہے" اور جس مقام پر یہ علم قایم ہوگا۔ وہی ان کا مدفن بنے گا۔ چنانچہ وہ علی الصباح علم لیکر روانہ ہوئے۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد وہ دکن تشریف لائے اور بیجاپور میں قیام کیا۔ ان کی آمد کا زمانہ ڈاکٹر زور صاحب نے عہد علی عادل شاہ (۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ) بتایا ہے۔ دکن میں شاہ میرانجی کا قیام تھوڑے ہی دن رہا۔ یہاں انھوں نے خواجہ کمال الدین بیابانی سے بیعت کی اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ خواجہ کمال الدین، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے خلیفہ تھے۔ انھوں نے خرقہ خلافت خواجہ جمال الدین سے حاصل کیا تھا۔

شاہ میرانجی بڑے زاہد مرتاض بزرگ تھے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی اپنی تصنیف "اخبار الاخبار" میں لکھتے ہیں، وہ رجب سے یوم عاشورہ تک مسلسل معتکف رہتے تھے "خزینۃ الاصفیا" میں ایک اور واقعہ مذکور ہے کہ[1] وہ چھ ماہ تک بغیر آب و دانہ کمرے میں بند رہتے تھے

[1] خزینۃ الاصفیا صفحہ نمبر (۴۰۱)

Hamid Razvi

جب باہر نکلتے تو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی متنفس موجود نہ ہو اگر اتفاق سے اس وقت کوئی ہوتا تو شیخ کی نظروں کی تاب نہ لاکر وہ دو دن تک بے ہوش رہتا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اس شہر کا قاضی ان کا منکر تھا۔ چنانچہ وہ عمداً ایک دن شیخ کے حجرے سے برآمد ہونے تک ٹھہرا رہا۔ شیخ کی نظر پڑتے ہی بیہوش ہو گیا۔

اسی کتاب میں ایک دوسرا واقعہ یہ بھی درج ہے کہ مذکورہ بالا قاضی ایک مرتبہ احتساب کی نیت سے "درہ" لیکر شیخ کے ہاں گیا شیخ کو خبر ہوئی اور انھوں نے بام سے قاضی کے چوڈول (پالکی) پر نظر ڈالی۔ اسی وقت کھاروں کے پیر زمین میں گڑھ گیے۔ اس پر بھی قاضی اپنے ارادے سے باز نہ آیا اور درہ لیکر شیخ کی طرف بڑھا شیخ نیچے آیے اور قاضی کو ساتھ لیکر بام پر گئے۔ وہاں اس نے ایک شراب سے بھری ہوئی صراحی رکھی تھی۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ شیخ نے جواب دیا۔ شراب ہے آپ بھی نوش فرمایئے قاضی آپکے حکم کی خلاف ورزی نہ کر سکا، ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن ہاتھ نہ اٹھ سکے۔ آخر پھر بغیر کچھ کہے وہ واپس آگیا۔

عبدالجبار خاں ملکاپوری نے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ جس سے میراں جی کے عرفان کی صحت بخش نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خدا کو مسجد یا مندر میں نہیں انسان میں مستور دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک طالب علم ان کے پاس آیا اور ان سے سوال کیا کہ خدا کہاں ہے؟ انھوں نے جواب دیا ؛ تمھارے پاس ؛ اور اس سے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ طالب علم کشیدہ خاطر ہو کر جانے لگا تھا کہ آپ کے صاحبزادے شاہ برہان الدین نے اُسے گھر لا کر مہمان رکھا۔ اور عرفانِ الٰہی سے آگاہ کیا۔ [1]

بیجاپور کے قیام کے دوران میں لاکھوں آدمی ان کے ارشاد و ہدایت سے مستفید ہوئے ان کے مریدوں میں مرزا فصیح الدین خاکسار عرف بابا سنجبل بہت مشہور ہیں جو بقول حکیم شمس اللہ قادری،

؛ تصوف اور شعر و سخن میں سرآمد روزگار اور دکن کے امیر خسرو تھے ؛ [2]

---

[1] "تذکرۂ ادبائے دکن" صفحہ ۸۳۵

[2] "اردوئے قدیم" صفحہ ۸۱ (طبع ثانی)

شاہ میراں جی جتنا عرصہ بیجاپور میں رہے ارشاد و ہدایت کا فرض انجام دیتے رہے۔ اس کیلئے انھوں نے تحریر و تقریر دونوں سے کام لیا ہے۔ اور کئی رسالے بھی اسی مقصد سے تحریر فرمائے۔

تصانیف

تاریخوں اور تذکروں میں شاہ میراں جی کی کئی تصانیف کا ذکر ملتا ہے اور یہ تصانیف نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں ان کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں :

(۱) "شہادت الحقیقت" (۲) "خوش نامہ" (۳) "خوش نغز" (۴) "گنج عرفاں"

وہ لکھتے ہیں :

"گنج عرفان" چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں نو باب ہیں اور ان میں عرفان کے اہم مسایل مثلاً روح کی حقیقت مراقبہ عقل و عشق کا مناظرہ وحدو ملحد کا فرق اور اسی نوعیت کے دیگر مضامین ہیں [۱]

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ یہ مثنوی شاہ نور متی ام (مدراس) کے مطبع سے بھی طبع ہو چکی ہے [۲] مجھے اس کا نسخہ اور کہیں نہیں ملا۔

گنج عرفان نام کی ایک مثنوی کا مخطوطہ جو ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن میں ہے۔ امام الدین حسینی عارف سے منسوب ہے [۳]۔

شہادت التحقیق

یہ شاہ میراں جی کی ایک طویل نظم ہے اس کا ذکر ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور دونوں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاصی طویل نظم ہے اور شاہ میراں کی دوسری نظموں کے مقابلے میں زیادہ سلیس بھی ہے [۴]۔ اس میں انھوں نے اپنے مرشد کمال الدین بیابانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ سب سے بڑی خوبی اس نظم کی یہ ہے کہ وہ نظم کو اُردو زبان میں لکھنے کی معذرت کرتے اور لکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو عربی جانتے ہیں نہ فارسی ان

---

[۱] "اُردوئے قدیم" صفحہ ۲۸۶ (جلد اول)

[۲] "تذکرہ اُردو مخطوطات" صفحہ ۲۸۶ (جلد اول)

[۳] ″ ۲۸۶ (″ ″)

[۴] "اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۵۱

Hanif Razvi

کے لیے ہندی میں یہ باتیں لکھی گئی ہیں :

اشعار یہ ہیں :

یو دیکھت ہندی بول — پن معنے ہے نپ تول
کڑوے پن سو رس — پھل پاکے جو پھنس
جیسے مغز میٹھا لاگے — تو کیوں من اس تھے بھاگے
ہے کڑواں کیرا ہیرا — گھوڑا اوپر پڑیا ہیرا

خوش نغز یا خوش نامہ

اس نظم کا ذکر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کیا ہے اور وہ اس نظم کو دور قدیم کی دلکش ترین نظموں میں شمار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ یہ ہیں:-

"یہ نظم بہ اعتبار زبان جذبات اور بیان دورِ قدیم کی چند دلکش ترین نظموں میں سے ہے"[1]

اس نظم میں معرفت الٰہی کے مطالب کو ایک تمثالیہ (Allegory) کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ تمثالیہ قصہ ایک لڑکی "خوشی" کے اطراف گھومتا ہے۔ "خوشی" گو ایک لڑکی ہے لیکن تمثالیہ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سالک کو معرفت الٰہی کے حصول سے جو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اسے استعارتاً "خوشی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قدیم ادب میں نظم کے ساتھ قصے کو جوڑنے کی شاید پہلی مثال ہے۔ اور تمثالیہ کے اعتبار سے یہ سیدھی سادی نظم ابتدائی خاکہ ہے۔ "خوشی" کا کردار مصنف نے اشاروں میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ ایک بھولی بھالی لڑکی ہے اور اسے خدا کی لگن لگی ہوئی ہے۔ اس لیے وہ میراں جی سے عرض کرتی ہے کہ میرے حال پر رحم کیجیے۔ مجھے دنیا اور اس کی ندرتوں سے کچھ غرض نہیں۔ میں تمہاری محبت کی بھوکی ہوں۔ تب وہ اسے دین اور معرفت کی باتیں بتلاتے ہیں بالآخر اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ہاتف خوش خبری دیتا

---

[1] "اردوئے قدیم" صفحہ ۸۱

Hanif Razvi

ہے۔ فرشتے ادب سے حاضر ہوتے ہیں اور آسمان سے نور کے طبق آتے ہیں۔ یہ خوشنودی کا آخر وقت ہے۔ وہ اس دنیا سے چلی جاتی ہے۔ اس منظر کو میراں جی نے بڑے موثر طریقے سے بیان کیا ہے۔ یہ منظر بڑا دلکش اور دل گداز ہے۔

خوش نغز یہ طویل مثنوی تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ایک مثال لیکے کے پیرائے میں معرفت کے نکات بیان کیے گیے ہیں۔ یہاں بھی "شہادت التحقیق" کی طرح ایک لڑکی "خوش نغز" ہے وہ اپنے پیر "میراں جی سے معرفت کے بارے میں سوالات کرتی ہے او پیر اسے وضاحت سے سمجھاتے ہیں۔ یہ اہم دینی یا علمی باتوں کو عوام کے لیے قابل فہم بنانے کا ایک پرانا طریقہ تھا چنانچہ سنسکرت میں کئی کتابیں اسی طرح سوال و جواب کی صورت میں لکھی گئی ہیں اور اردو میں بھی عرصہ تک یہ طریقہ جاری رہا۔ یہ مباحث معرفت، روح، مراقبہ، عقل، عشق، توحید اور الحاد جیسے اہم مسائل پر حاوی ہیں۔

شاہ میراں جی کی نثری تصانیف کئی بیان کی جاتی ہیں ان میں سے حسب ذیل مشہور ہیں:
(۱) گل باس (۲) جل ترنگ (۳) سب رس (۴) شرح مرغوب القلوب " رسالہ تصوف

"گلباس" اور "جل ترنگ" ان رسایل کا تذکرہ ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زور کی تصانیف میں نہیں ملتا۔ صرف حکیم شمس اللہ قادری نے ان کا حال لکھا ہے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں :

: حضرت میراں جی شمس العشاق نے نثر اردو میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ منجملہ ان کے دو رسالے ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ ایک کا نام "جل ترنگ" اور دوسرے کا "گلباس" ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں اور شاہ صاحب نے ان میں تصوف کے اسرار و نکات تمثیل کے پیرائے میں بیان کیے ہیں [۱]

مجھے اس کا کوئی نسخہ نہیں مل سکا۔ پتہ نہیں کہ حکیم صاحب کو یہ رسالے کہاں دیکھنے کو ملے تھے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو "اردوئے قدیم" صفحہ ۱۱۶

انھوں نے اس کا کچھ پتہ نہیں بتایا۔

شرح مرغوب القلوب میراں جی کی نثری تصانیف میں "شرح مرغوب القلوب" خاصی اہم ہے اس کا تذکرہ کئی علماء نے کیا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے کتب خانے میں اس کے دو نسخے تھے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں :

"یہ چھوٹا سا رسالہ نثر میں ہے اس کے بھی میرے پاس دو نسخے ہیں اور دونوں میں یہ حضرت میراں جی کی تصنیف بتایا گیا ہے"

مولوی عبدالحق صاحب نے اس کے مطالب کی تفصیل بھی لکھ دی ہے :

"شرع میں حمد و نعت اور متفرق حدیث و آیات کے ترجمے اور مختصر سی تفسیر کے بعد اسے دس باب میں تقسیم کیا ہے جس کے عنوان یہ ہیں :

پہلے باب میں توبہ۔ دوسرا باب طریقت کا۔ پچھانت کرنا نفس۔ دل۔ روح۔ سرذات۔ شریعت۔ حقیقت۔ معرفت، دسواں باب سفر کا۔

ان بابوں میں یہ التزام رکھا ہے کہ پہلے وہ قرآن کی آیتیں مگر زیادہ تر حدیث نبوی لکھتے ہیں اس کے بعد ترجمہ اور مختصر تشریح کرتے ہیں مضمون کے لحاظ سے یہ کتاب بہت معمولی ہے۔ اور کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ البتہ زبان کی تاریخ کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔[1]

ڈاکٹر زور نے مولوی عبدالحق صاحب کے برخلاف اس کے نو باب بتائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

"یہ کتاب نثر میں ہے۔ ایک قدیم ترین دکھنی نثر ہونے کے باعث اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لمبی چوڑی تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو نو ابواب پر منقسم ہے اس میں صوفیوں کے مختلف مذہبی فرائض کا ذکر کیا گیا ہے"[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ "اردو" ۱۹۲۷ء اپریل۔ "اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۶۱

[2] "اردو شہ پارے" صفحہ ۲۶

Hanif Razvi

لیکن حکیم شمس اللہ قادری کو اس بارے میں ان دونوں محققین سے اختلاف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تصنیف میراں جی شمس العشاق کی نہیں بلکہ میراں جی خدا نما کی ہے۔ یہ نتیجہ انھوں نے حکیم محمد قاسم ماہر سمیات کے کتب خانہ والے مخطوطے سے نکالا۔ جیسا کہ ان کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے :

: ہمارے مخدوم مولانا عبدالحق صاحب نے اسے حضرت میراں جی شمس العشاق کی تصنیف بتایا ہے : جن کا سنہ ۹۰۲ھ میں انتقال ہوا ہے۔ اس کا ایک نسخہ ہم نے ڈاکٹر محمد قاسم ماہر سمیات کے کتب خانہ میں دیکھا ہے۔ اس کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت میراں جی خدا نما کی تصنیف ہے۔ یہ بزرگ عبداللہ قطب شاہ کے مصاحب تھے۔ ۱۰۸۰ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ انھوں نے تمہیدات "عین القضاۃ ہمدانی" کی شرح بھی لکھی ہے : [1]

حکیم صاحب نے اس کتاب سے تھوڑا سا اقتباس بھی دیا ہے۔ اور بظاہر وہ ڈاکٹر عبدالحق کی کتاب ہی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں دستیاب ہوا ہے۔ [2]

کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطے میں اس کتاب کا نام ترجمہ مرغوب القلوب درج ہے اس کے صفحات کی تعداد (۱۴) ہے۔ اس کے مطالعے سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کے دس باب ہیں۔ ابواب کی تفصیل حسب ذیل ہے :

پہلا باب : توبہ کا بیان ہے بقول مصنف :

توبہ یوں کرے رو رو کر خدا کے فراق میں، تو یوں رو ہور انکھیاں کی پانی سون ندیاں بہا ہور توبہ کر ہور خدا کا ہو۔ اس کے معنی ہیں کہ جیکوئی روتا ہے خدا کی بدل اور رونا ریاست ہے بندگی تھے۔ خدا کے نزدیک ....

خدا کہیا ایک روتا ہے دوسرا ہنستا ہے بھوت ہنسی سے دل مرتا ہے ہر دم مین

---

[1] "اردوئے قدیم" طبع سوم صفحہ ۶۹

[2] ملاحظہ ہو مخطوطہ نمبر ۶۱۲ فن تصوف

توبہ کر بعد ازاں بندگی کر ؛

دوسرا باب ؛ پہچانت کرنا نفس ۔ دل ۔ روح ۔ سر ۔ نور ۔ ذات ۔ شریعت ۔ طریقت حقیقت ۔ معرفت اپر بولیا گیا ہے سوای معنی ہر ایک آدمی کے وجود میں ای چھ چیز ہے ۔ یون خدائے تعالیٰ ہر یکس کون یو نچہ پیدا کیا ۔ یک دل ۔ یک روح ۔ یک سر ۔ یک نور ۔ یک ذات ۔ ای سب یک اچھکر ولی اپنی صفت پر جدا جدا نادان ہوتے ہیں ۔ سو پیر تھی سمجھتا ہے ۔

خدا کہیا تحقیق آدمی کے تن میں دل ہے ۔ ہور دل میں عارف الوجود ہے ۔ ہور عارف الوجود میں روح ہے ہور روح میں سر ہے ۔ ہور سر میں نور ہے ۔ ہور نور میں خدا میں ہون کہیا ہے ۔ یون خدائے تعالیٰ ہر یکس کو یو نچہ پیدا کیا ہے ۔ ایک نفس ایک دل ۔ ایک روح یک سر ۔ یک نور ؛

تیسرا باب ؛ وضو کا ای تشریف پیغمبر تھی ہے وضو کرنے مین نماز حاصل ہوتا ہے ۔ ؛

چوتھا باب ؛ دنیا کون ترک کردینا سو کہی دنیا کون چھوڑیں گے بدل خدا تی خدا کی مدت سون ؛

پانچواں باب ؛ تجرید ہور تفرید ہونی کا بولی ہیں ۔ خدا کون پانی کون سالک اس بات مین تجرید ہور تفرید ہووی خدا کون پاوی

چھٹا باب ؛ اپنی پچھانت سو نور محمد ؐ کا اس پچھانت مین بیناجون غواصی دریا میں بیکر موتی لیتا ہے ۔ یون اپنی پچھانت مین بیکر اس میں کی موتی لیاوی پرہیزگاریکا ہور توکّل کا کسوت کری باج تون خدا کی پچھانت کا شربت کیون پی سکیے گا ۔

ساتواں باب ؛ عشق کا جان کہ عشق قدیم ہے ۔ دل میں جو کلیجا سب لہو سون بھریا ہے یون جان ہور عشق مین تین ہیں ۔ عشق صغیر ۔ ہور عشق کبیر ۔ ہور عشق اوسط ۔ عشق حقیر سو بندیا نکا خدا سون محبت رکھنی کا ہور عشق کبیر

سو خدا کا بندیاں میں محبت رکھیا ہور منگیا۔ عشق اوسط میانہ دو کی میانیکا رازہے

دومیکا لطافت اس کا انت نہین اس کا بیان نہ کہیا جاسی۔ ؁

آٹھواں باب ؁ معشوق کا یاد کرنا سو بولی میں عاشق معشوق کی یاد میں یوں اچھے

دوسرا کوئی اسے یاد نا آدی ؁

نواں باب ؁ فنا ہور بقا ہوئے کا کہے ہین ؁

دسواں باب ؁ سفر کا تمام کتاب سفر دایم چلتا اچہ اس بات میں اونچا نیچا خوب

برادیک ای بات بہوت دور ہے کہیں اپنے کون توجا کا چہ یقین

تون تصدیق کا توشہ کر خدا کی مدت سون ؁

میرا خیال یہ ہے کہ یہ کتاب وہی ہے جس کا ذکر مولوی عبدالحق اور حکیم شمس اللہ قادری نے شرح مرغوب القلوب کے نام سے کیا ہے۔ کیونکہ جو اقتباس ڈاکٹر عبدالحق نے دیا ہے وہ کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطے "ترجمہ مرغوب القلوب" میں موجود ہے۔

"شرح مرغوب القلوب" کا ایک مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں بھی موجود ہے۔[2]

لیکن اس کو پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے شاہ امین الدین اعلیٰ کے رسائل میں شمار کیا ہے۔ اور اس غلط فہمی کا سبب غالباً یہ تھا کہ یہ رسالہ شاہ امین الدین اعلیٰ کے رسائل میں لکھا ہوا ہے جس کا مجموعہ کتب خانہ میں موجود ہے[3]۔ اس رسالے کے بارے میں پروفیسر صاحب نے لکھا ہے۔

یہ رسالہ حضرت خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" سے ملتا جلتا ہے بعض ابتدائی اور درمیانی حصے بالکل مطابق ہیں اکثر مقامات مختلف بھی ہیں بہت ممکن ہے اس رسالے اور "معراج العاشقین" کا ایک ہی فارسی ماخذ ہو ؁

واقعہ یہ ہے کہ یہ رسالہ نہ تو خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" سے ملتا جلتا ہے اور نہ اس

---

[1] ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۳۰ - ۳۱

[2]

[3] ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۲۶

رسالے اور "معراج العاشقین" کا ایک ہی ماخذ ہے۔ بلکہ یہ رسالہ "شرح مرغوب القلوب" ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے جو اقتباسات نقل کیے ہیں وہ سب "شرح مرغوب القلوب" کے ہیں۔ ابواب کی تفصیل بھی نہیں ہے۔

سب رس میراں جی کی اس تصنیف کا ذکر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی تصنیف کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اسے میراں جی کی نثری تصانیف میں شامل کیا ہے اور لکھتے ہیں :

" یہ کتاب دکھنی نثر میں ہے اور شاہ وجیہہ الدین کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اس کا ایک مخطوطہ ۱۱۱۸ھ آغا حیدر صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے کل ۱۸۸ ورق ہیں ہر ورق میں ۲۶ سطر۔ زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس ہے چونکہ اردو کی ابتدائی نثری کتابوں میں ہے اس لیے یہ مخطوطہ خاص طور پر قابل قدر ہے " [1]

حامد حسن قادری نے بھی غالباً "داستان تاریخ اردو" میں مصنف "اردو شہ پارے" ہی سے اس کتاب کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے ان ہی تفصیلات کو درج کیا ہے۔ جو "اردو شہ پارے" میں موجود ہیں وہ لکھتے ہیں :

" سب رس " نام کا ایک رسالہ شاہ میراں جی نے ملا وجہی کی " سب رس " سے پہلے لکھا ہے [2] "

حامد حسن قادری کے " اردو شہ پارے " سے مواد اخذ کرنے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے وہی اقتباس دیا ہے جو " اردو شہ پارے " میں موجود ہے ۔

مجھے " سب رس " کا جو نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں دستیاب ہوا ہے وہ خاصہ ضخیم ہے یہ مخطوطہ (۳۱۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں ایک ترقیمہ بھی ہے جس سے اس کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں روشنی پڑتی ہے۔ ترقیمہ حسب ذیل ہے :

---

[1] " اردو شہ پارے " صفحہ ۲۶
[2] " داستان تاریخ اردو " صفحہ ۳۶

٭ المسمی بہ "سب رس" تصنیف شاہ میراں جی شمس العشاق فرمودہ عصمت بلقیس زمان مریم زمانی خدیجہ سلطانہ ٭

نسخے کے سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے :

٭ کلام میراں جی شمس العشاق کہ کلام شاہ وجیہہ الدین بزبان دکھنی ترجمہ نمودہ اند و "سب رس" نام کردہ اند ٭

متن کے آغاز پر یہ لکھا ہوا ہے :

٭ کلام میراں جی شمس العشاق ٭

آغاز اس طرح ہوتا ہے :

٭ اللّٰھم صلی علی محمد ۔ جنو کی بات خدا کی بات میں سند کتاب تاج الحقایق ، رواج الحقایق ، سراج الحقایق ، معراج الحقایق بجن کتاب ، کون مطالعہ کرنی خدا بیک پایا جائے ۔ عشق مرد اہے عشق خلاصہ موجودات ہے ۔ عشق صاحب کا نشان ہے ۔ جان بی عشق ہے وہ عشق کے باٹ ہے ...... راگ عشق کا راز ۔ ریجہ عشق کا راحت کیسا عشق کی جھکور خوشبوئی عشق کے باس حسن عشق کا اس سات گنج تے جو کوئی مرکراو عشق نہیں بلکہ آدم نہیں وہ بلا توبہ استغفر اللہ جکوئی اس دنیا میں یو سات ...... خوش نہیں کنا اس چھوتا میں ہے ۔ تالایق مرے تو خوب ہے ۔

جو کوئی عاشق کون اس سات چیز تے منع کرے خدائے تعالیٰ اس دنیا میں اسے فنا کرے خوبصورت دیکھ ۔ راگ سین نہ بجہ خوش بوی خوش کر کیف کھائی پرواچہ اور شعر پر خدا کون بھوت یاد کر ۔ محبت دن پدھار اپنی کام میں مشغول رہ ۔ کس سون نکو چیکر یہاں ارام یاں کام یاں مال یاں وصال یا یو گھر میں باقی جو کچھ تو دیکھے گا سنئے گا سود رد ہے ۔

مشاہدے مراقبے میں پرکتیا سیر طبیر میں تمن ہی رہے گا ۔ اس زمانے میں کشف و کرامات کسی ہوا جو تجھے ہو دیئے گا ۔ یو جون کیمیا کرے گا دھندا نہیں ہوتا

Hanif Razvi

اور ہو آئینچہ کا گردل بر آتا ہے۔ سیدھی بات پکڑ گھر کو آ توں کوں زبان میں کا ہی کوں جاتا۔

ارے طالب طالب کامل او تجہ میچہ کیا تج تے جدا ہے۔ خدائے تعالیٰ کہتا ہے یومنوں بالغیب یعنی مومن وہی کہ غیب پر ایمان لیاوے اس غیب میں موں اس حد لگ جا کہ تجھے خدائے تعالیٰ حاضر دس آوے عالم غیب میں توں سیر کر.........

ارے طالب تجہ میں یو تمام عالم ہے یو تمام عالم تج مین دس آتا اور اگر تج میں یو تمام عالم نا اچھی تو اتیا عالم یو تجہ مین کاں دیکھیا جاتا ہے۔ جو کچھ ہے سو تو تجہ ہے۔ جیکچہ ہے سو جیکچہ توں منگتا سو تج مینجہ دیکھ توں تجے نئیں پایا ہے۔ اور بھی نئیں پایا ہے کہ تجہ مین بھی ایک ہے۔ ایکوں پانا اور آپس مین ہے۔ ادس بھی پانان اس دونوں کوں پانا بہوتہ مشکل کام ہے۔ جو عارف عاشق اس دونوں کوں پایا ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس حد کوں آیا وہ تمام ہے اس عالم میں تی لجا کر کیوں پیدا کریگا۔ سو وہیچ جانی اس کی خوشی وہ صاحب اختیار ہے۔ وی یو انسان بھلا برا سمجھتا اسی کو خدا کا یاد اور فعل نیک درکار ہے ؂

رسالے کی وجہ تصنیف پر ذیل کی عبارت سے روشنی پڑتی ہے:

؂ اس رسالے میں ہمیں کئیں عشق کے عالم کی بات کہتے ہیں کئیں عقل کے عالم عالم کی بات کہتے ہیں۔ جن عالم کی بات کہتے ہیں اس عالم سوں اس بات کوں پانا اگر سمجھے تو خوب واگر نین سمجھی تو ٹک اندیشا ٹک فکر کرنا یعنے جا کا وقت درکار ولی کچہ خاطر میں نا لینا اس کلام کوں پرتی اس کلام کی مقصود کوں اپنڑنے ہر بی فہم کوں کان فہم ہے۔ جکوئی جانب اللہ ہے وو سمجھے گا تحقیق جانے گا کہ یو جانب اللہ کا کلام ہے۔

اس رسالے میں فصاحت بلاغت باٹ (بات) کا مانا ناز نیاز اسرار

سب بھرپور ہے اگر ہمارے کلام کون کوی نا سمجی تو ہمارا تقصیر نیئں اس کی سمجھ مین قصور ہے پاؤ آدھی کو سمجھتا ہے ادھایون کون سمجھتا ہے۔ پونا پوری کون سمجھتا ہے۔ پورا برا لبنی کوان سمجھتا ہے یان سمجھنا کام ہے۔ ہر کسی کی سمجھ اپنی مقدار ہے بات بولنا ہے۔

ہر ٹھارایک مراتب ایکہ مقام ہے نادان کی باٹ دانایان کے آگی اعتبار نیئں دھرتی ولی...... بچارے بہتی تو ہونا سب پھول چہ تو کانتی کون بیچنا... لہ

اختتام کی عبارت یہ ہے :

⁂ اگر تمنا خدا فرصت دے تو ہر مہینی کون چودوین رات کی چندنی مین ہمارے دوستی سب دوستان مل کر ایک مجلس کرو چاند کی رات سو چودوین رات ہے کہ اس رات چاند کمالیت کون اپرا تلہ ہے۔ چاند کی مبارک باری اس رات کون کرنان کہ بھوتیجہ روشن ہوکر چودہ کلا پر جرتلہ ہے۔ آنند کی رات ہے چودوین رات بہت بڑی رات ہے۔ بھوت فیض کی رات ہے۔ اس رات جاگنا ایک کام ہے اس رات البتہ خدا کی یاد سون گذارنا خوشی سون گذرانا جلکو اس بات کون نہ انپڑے اس کا سہل نام ہے عام لوکان کون بھلی چاند کی رات ہے ہور عاشق لوکاں کون چودوین چاند' چاند کی رات ہے چاند دیکھ کر جس رات سب راتاں تھی چندنا زیاد پرے چندنا ئین لوکان کی چاندرات یو کیا بات۔

چاند آیا سون دکھلایا ولی چاند کی رات نیئں آئی چاند کی رات ہور عالم میں اندھارا یو کیسی چاندرات ری بھائی جو کیف خوش سو کیف کھاؤ پھول پہنو خوشبوی لگاؤ راگ سنو خرچ کون خدا دینے ہارا ہے۔ اعتقاد درست رکھو نکو اور

لہ ملاحظہ ہو مطبوعہ "تاج الحقائق" صفحہ (۱۴۳) - اس میں بھی یہی عبارت درج ہے۔

Hanif Razvi

اگر ہر مہینے مین کون میسر نہ ہوئے تو سال کون ربیع الاول کے مہینی میں اکبار تو جیون ھمین فرمای تیون سب مل کر خوشحال کرو کتیا جفا ہور محنت سون عمر گذارنے کی بہی تو بھی غم کون میں سے خالی کرو ایک ساعت بفراغ دل خدا کون یاد کرنا تمام عمر کا دل کو ہلاک نکو کرو برے مردہ دل ہوی گے۔

جکچہ ہے سو یو ہے جس وقت اس خوش حالی ہین بیٹھیگی تو ہمنان سنگین کے آتنان غم کون دل پر نکو آنی دیو۔ خدا کی محبّت سون مشغول اچھیو عیش عشرت کے چھپر لاو غم کا کالا مون کرو۔ جانی دیو خوش حالی کرنا پھر یون کرنا جو غم کا دیان گذرنا نہ تھا بلکہ احسان جو کر اچھنا ہور آتنان مخطوط ہونا جو اپنے آپس کون صبر ہووی خوشی رہی کتی سو خوش حالی اسے نن تو باقی خوش حالی گھر میں گھر۔

جکوئی خدا کا یار ہے اسی خدا کی یاری واجب ہے۔ باری مہینی میں ایک بار تو بھی عاشقان کو شب بیداری واجب ہے۔ ارے دیوانے ہور بھی تمین ...... (کرم خوردہ)

کان ہور خدا کا یاد کان جو لگ فرصت ہے تو لگ غنیمت جانو دیکھو تمنان جیسے لوکان تمھاری حضور کیوں جاتی ہیں۔ دسریان کی حال تھی اس کا حال پچھانو جیون دنیا کی لوک جھو کر جیو کہ مرتے ہیں

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ڈاکٹر زور صاحب نے "سب رس" سے ذیل کا اقتباس بھی دیا ہے:

جکوئی عاشق کون اس سات چیز تے منع کرے خدائے تعالیٰ اسے دنیا سون فنا کرے خوبصورت دیکہ لاک سن ریجہ خوش بوئی خوش کہ کیف کیا بے پرواہ چہ شعر بر خدا کون بہوت یاد کر محبت سون بدھا اپنے کام میں مشغول رہ کس سون نکو چیکریان آرام یان کام یان حال یان وصال یان یو کھرے بالے جو کچہ تون دیکھیگا سو تو بنگا سو سب درد سر ہے۔ مشاہدے مراقبے ہیں پر کھتیا سیر طیرین تون رھیگا [1]

---

[1] "اردو شہ پارے" صفحہ ۳۲۱

Hanif Razvi

"سب رس" یا "تاج الحقایق"؟

پروفیسر عبدالقادر سرفراز نے بمبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات مرتب کی تھی۔ اس میں وجہی (مصنف "سب رس") سے ایک اور تصنیف "تاج الحقایق" منسوب کی ہے[1]۔ اور اس کا اقتباس بھی دیا ہے۔ اور یہ میرے اقتباس "سب رس" ہی کا ایک حصہ ہے[2]۔

فہرست میں حسب ذیل اقتباس منقول ہے :

" کلام مولانا وجیہہ الدین اللّٰھم صلی علی محمد۔ " تاج الحقایق " معراج الحقایق " رواج الحقایق " سراج الحقایق " جن کتاب کو مطالعہ کرنی تھی "

اس کے علاوہ " تاج الحقایق " کی جو خصوصیات فہرست میں بیان کی گئی ہیں وہ سب اس " سب رس " میں موجود ہیں۔ سرفراز صاحب لکھتے ہیں :

" یہ دکھنی زبان میں ایک نثری تصنیف ہے جو انسان کے اخلاقی اور روحانی مسائل سے بحث کرتی ہے اس کے مصنف وجیہہ الدین سب رس کے مشہور مصنف ہیں " خصوصیت جو انھوں نے بتائی ہے یہ ہے کہ اس کے ابواب " اے طالب " سے شروع ہوتے ہیں جو " سب رس " کی بھی خصوصیت ہے۔ "

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتاب " تاج الحقایق " کے نام سے کیسے موسوم ہوئی۔ اور وجہی کے نام سے کیسے منسوب ہوئی۔ ایک بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ " سب رس " کے نام کی وجہ سے یہ کسی مرحلے میں وجہی کے نام سے منسوب کردی گئی۔ کیونکہ وجہی کی ایک کتاب " سب رس " نامی موجود ہے۔

---

[1] ڈاکٹر عبدالحق نے بھی دیباچہ "قطب مشتری" اور دیباچہ "سب رس" میں وجہی کی تیسری تصنیف "تاج الحقایق" کا ذکر کیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو مقالہ ھٰذا صفحہ (   )

Hanif Razvi

اس طرح اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں کافی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اس میں مزید اضافہ اس طرح بھی ہو گیا ہے کہ اسی "سب رس" کو "تاج الحقایق" کے نام سے مجلس دکھنی مخطوطات حیدرآباد دکن کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اور غالباً اسے ڈاکٹر زور صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کے (۴۸) مطبوعہ صفحات، مجھے بڑی کوشش کے بعد دستیاب ہوئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہی "سب رس" ہے۔ آغاز سے لیکر ۴۸ صفحے تک عبارت لفظ بہ لفظ ایک ہی ہے۔ اس لیے اس کے نام اور مصنف دونوں کے بارے میں کافی شبہات کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے مثلاً یہ کہ :

۱۔ آیا اس کتاب کا نام "سب رس" ہے یا "تاج الحقایق"؟

۲۔ اس کتاب کے مصنف "شاہ میران جی شمس العشاق" ہیں یا "وجہی" یا کوئی اور ـــ؟

۱۔ ڈاکٹر زور کے "اردو شہ پارے" کے بیان کے مطابق یہ "سب رس" ہے اور شاہ میران جی کی تصنیف[1] جس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ وجیہہ الدین کی کسی تصنیف کا ترجمہ ہے مجلس دکھنی مخطوطات کی زیر طبع کتاب میں اس کا مطبوعہ نام تو ظاہر نہ ہو سکا لیکن مطبوعہ صفحات کے سرنامے پر سرخی ہے "تاج الحقایق" لکھا ہوا ہے۔

۲۔ پروفیسر عبدالقادر سرفراز کا خیال ہے کہ یہ "تاج الحقایق" ہے اور وجہی (مصنف سب رس) کی تصنیف ہے۔

اس طرح اس ایک ہی کتاب کے بارے میں اتنی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ یہ "سب رس" بھی ہے اور "تاج الحقایق" بھی، نیز یہ میران جی کی تصنیف بھی ہے اور وجہی مصنف "سب رس" کی بھی۔

ظاہر ہے کہ ایک ہی کتاب کے دو نام نہیں ہو سکتے اور ایک ہی کتاب کے دو مصنف ہیں جن کے زمانے میں تقریباً ایک سو سال کا فرق ہے۔

---

[1] اردو شہ پارے صفحہ ۲۶

Hanif Raza

واقعہ یہ ہے کہ یہ نہ تو "سب رس" ہے اور نہ وجہی کی تصنیف اس طرح اسے شاہ میراں جی سے بھی کوئی تعلق نہیں بلکہ میرا قیاس یہ ہے کہ یہ "تاج الحقایق" ہے اور شاہ وجیہہ الدین (۹۱۰ھ - ۹۹۸ھ) اس کے مصنف ہیں۔ اس قیاس کے اسباب حسب ذیل ہیں :

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شاہ میراں جی کی "سب رس" کا کسی نے سوائے ڈاکٹر زور کے تذکرہ نہیں کیا اور ابھی مجلس دکھنی مخطوطات کی زیر طبع "تاج الحقایق" کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں ڈاکٹر زور صاحب کا خیال کتاب کے نام کے بارے میں بدل گیا اور "تاج الحقایق" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حالانکہ "اردو شہ پارے" میں اسی کتاب کا اقتباس وہ "سب رس کے اقتباس" کے نام سے دے چکے تھے۔

(۲) اس غلط فہمی میں قطع نظر اس کے کہ "سب رس" کے نام کی وجہ سے وجہی کا نام بھی آگیا ہو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کتب خانہ سالار جنگ کے نسخے کے سرنامہ کی یا اسی طرح کی کسی اور "عبارت" سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہو چنانچہ کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطہ کے سرنامے کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے وہ کافی مبہم ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "سب رس" میراں جی کا کلام ہے جس کا وجیہہ الدین کے کلام سے دکھنی میں ترجمہ کیا گیا۔ اور "سب رس" نام رکھا گیا۔ یہ عبارت نہ تو خود جزو کتاب ہے نہ اس کی اہمیت ترقیمہ کی سی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے شاہ وجیہہ الدین کے کلام کو "وجیہہ" کے جز کی مناسبت کی وجہ سے وجہی سمجھ لیا اور چونکہ وجہی کی تصنیف "سب رس" ہے۔ اس لیے اس کا نام "سب رس" رکھ دیا۔ حالانکہ "سب رس" نام کا پتہ سوائے اس الحاقی عبارت کے متن کتاب سے کہیں نہیں چلتا۔ حالانکہ وجہی مصنف "سب رس" نے "سب رس" کے نام کا تذکرہ سبب تالیف کے سلسلے میں واضح طور پر کر دیا ہے۔

اقتباس کا ایک اور سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وجیہہ الدین کا لقب بھی "میاں جی" تھا۔ میاں جی اور میراں جی میں التباس کی جو گنجائش ہے وہ واضح ہے۔ شمس العشاق لقب کا الحاق لکھنے والے کی طرف سے میاں جی کو میراں جی پڑھ کر ہوا ہے اسی مناسبت سے "ایجاد بندہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔

Hanif Razvi

(۱) کتاب کے سرنامے پر جو عبارت درج ہے اس میں وجیہہ الدین کا کلام ہونے کی صراحت ہے۔ جس کے بارے میں التباس کی گنجایش نہیں۔

(۲) ہم کو یہ معلوم ہے کہ وجیہہ الدین کا لقب بھی میاں جی تھا جسے بعض وقت میراں جی بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے شمس العشاق اور وجیہہ الدین میراں جی میں فرق نہ کر سکنے کی وجہ سے میراں جی کے ساتھ جو لقب شمس العشاق مشہور تھا۔ اضافہ بڑھا دیا۔

وجیہہ الدین نامی دو بزرگ گزرے ہیں۔

(۱) وجیہہ الدین یوسف

(۱) ایک وجیہہ الدین یوسف، شیخ نظام الدین بدایونی کے معاصر تھے لیکن کسی بھی تذکرے سے ان کا صاحب تصنیف ہونا نہیں پایا جاتا۔

(۲) وجیہہ الدین علوی گجراتی

(۲) دوسرے وجیہہ الدین علوی گجراتی میراں جی کے معاصر تھے۔ اس لیے یہ قیاس بھی ٹھیک نہیں ہوتا کہ میراں جی نے وجیہہ الدین کی کسی تصنیف کا اُردو ترجمہ کیا ہوگا۔ اس کے برخلاف اس عہد کی تائید میں بہت سے دلایل ملتے ہیں کہ وجیہہ الدین اس کتاب کے مصنف ہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری۔ ڈاکٹر عبدالحق[1]۔ پروفیسر حسن عسکری[2] سب نے وجیہہ الدین کے اُردو میں صاحب تصنیف ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں :

" آپ کے مریدوں نے : بحر الحقایق : کے نام سے آپ کے ہندی ملفوظات جمع کیے ہیں "[1]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

" آپ کے مریدوں نے آپ کے ملفوظات کتاب کی صورت میں جمع کیے ہیں۔

---

[1] " اُردوئے قدیم " طبع ثانی صفحہ ۲۴

[2] " اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام " صفحہ ۳۰

[3] " مطبوعہ رودیداد ہسٹری کانگریس " منعقدہ ناگپور سنہ ۱۹۵۰ء

جس کا نام "بحر الحقایق" ہے۔ اس میں جگہ جگہ ان کے ہندی اقوال درج ہیں شیخ کے مریدوں سے سوال کرتے ہیں اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ سوال تو فارسی میں کہے ہیں لیکن جواب خود شیخ ہی کے الفاظ میں ہندی میں تحریر کیے ہیں" ۔[۱]

پروفیسر حسن عسکری نے اپنے ایک مضمون "پندرھویں صدی کے شمالی بہار کے ایک شطاری صوفی (امام الدین راجگیری)[۲] میں ان کے اُردو میں تصنیف و تالیف کرنے کا ذکر کیا ہے۔ "وہ گلزار ابرار"[۳] کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"انھوں نے بہت سی مشہور کتابوں پر حواشی لکھے بہت سی اعلیٰ پایہ کتابیں بھی لکھیں جو ابتدائی اُردو کے اچھے نمونے ہیں"

کتاب (سب رس) کے آغاز کی عبارت سے کتاب کے نام "تاج الحقایق" کا پتہ چلتا ہے میرانجی شمس العشاق کی تصانیف "خوش نامہ"، "خوش نغز"، یا اسی دور کے بعض دوسرے مصنفین کی کتابوں کے ناموں میں مشابہت کے التزام کے نمونے پر، وجیہہ الدین کی تصانیف کے ناموں "بحر الحقایق" اور "تاج الحقایق" کی مناسبت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ترقیمہ میں لفظ "فرمودہ" بہت با معنی لفظ ہے۔ کیونکہ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس کتاب کی تصنیف خدیجہ سلطانہ کی فرمائش پر ہوئی تھی۔ خدیجہ سلطانہ نام کی دو خواتین بیجاپور میں گزری ہیں۔

(۱) خدیجہ سلطانہ حیات بخشی بیگم[۴] اور محمد قطب شاہ کی بیٹی عبداللہ قطب شاہ کی بہن اور محمد عادل شاہ (۱۰۳۳ھ - ۱۰۶۷ھ) کی بیوی تھی۔ اور بیجاپور میں حاجی بڑے صاحب کے نام سے موسوم تھی۔

---

[۱]

[۲] مطبوعہ روئیداد ہسٹری کانگریس منعقدہ ناگپور سنہ ۱۹۵۰ء

[۳] مخطوطہ حبیب گنج

[۴] یہ ملکہ گولکنڈہ کی تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ یہ اُردو کے پہلے شاعر محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی تھی۔

(۲) خدیجہ سلطانہ ابراہیم عادل شاہ (۹۴۱ھ - ۹۶۵ھ) کی بہن اور میراں حسین نظام شاہ (۹۹۶ھ) کی بیوی تھی۔ قیاس یہ ہے کہ ان دوسری خدیجہ سلطانہ کی فرمائش پر "تاج الحقایق" لکھی گئی تھی۔

خدیجہ سلطانہ کی زندگی کا بیشتر حصہ احمد آباد میں گزرا اور وجیہہ الدین کا وطن بھی احمد آباد ہی تھا۔ خدیجہ سلطانہ کو علم وادب سے دلچسپی عادل شاہی خاندان سے ورثہ میں ملی تھی۔ اس لیے غالباً شاہ وجیہہ الدین نے شاہ میراں جی شمس العشاق کی بعض کتابوں کی طرح جو خاص طور پر خواتین کو احکام سکھانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ اس خاتون کے لیے یہ کتاب لکھی ہوگی۔ اگر خود تصنیف نہ بھی کی ہو تو یہ تو یقینی ہے کہ اس کے استفادہ کے لیے یہ کتاب لکھوائی گئی۔

بہر حال ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ علماء نے "سب رس" اور "تاج الحقایق" کو جو دو علحدہ علحدہ کتابیں بتایا ہے وہ صحیح نہیں بلکہ اس کا نام "تاج الحقایق" اور یہ شاہ وجیہہ الدین گجراتی کی تصنیف ہے۔

وجیہہ الدین علوی گجراتی ـ حالاتِ زندگی

وجیہہ الدین کا نام سید احمد تھا اور میاں جی کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے والد سید نصر اللہ گجرات کے بڑے عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ وجیہہ الدین اور برہان الدین۔ برہان الدین کے بیٹے شاہ ہاشم حسینی العلوی[۱] بھی اردو کے بڑے شاعر اور مصنف ہوئے ہیں۔ وجیہہ الدین ۹۱۱ھ[۲] میں چنپانیر (محمد آباد) میں پیدا ہوئے اور ملا عماد الدین سے درس تدریس کی تکمیل کی۔ محمد غوث گوالیاری کے خلیفہ تھے۔ ۱۹ صفر ۹۹۸ھ[۳] میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے تفسیر۔ حدیث فقہ۔ کلام۔ منطق۔ فلسفہ بیان ومعنی وغیرہ میں جس قدر مشہور ومتداول کتابیں تھیں ان سب پر حواشی لکھے تھے۔

ان کی تصنیفات کی تفصیل مولانا آزاد بلگرامی نے "سجتہ المرجان"[۴] میں لکھی ہے مولانا حبیب اللہ

۱؎ ملاحظہ کیجیے صفحہ مقالہ ہذا (   ) ۲؎ ڈاکٹر عبد الحق نے سنہ ولادت ۹۱۰ھ لکھا ہے۔
۳؎ "برکات الاولیا" میں ۹۹۸ھ، لیکن "اخبار الاخیار" میں ۹۹۵ھ درج ہے۔
۴؎ "سجتہ المرجان" صفحہ (۵۰)۔

Hanif Razvi

اپنے ملفوظ میں لکھتے ہیں کہ ان کے چودہ سو خلفا تھے۔ ان کا مزار احمد آباد (گجرات) محلہ خان پورہ میں ہے اور کافی مشہور ہے [۱]۔

ان کے فرزند مولانا عبداللہ بھی صاحب تصنیف و تالیف ہوئے ہیں۔ (ان کی تصنیفات پر آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی)۔

مولانا محمد حسین آزاد مصنف "آب حیات" اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ مشہور شاعر ولی اورنگ آبادی ان ہی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی تصدیق مولوی عبدالحی رعنا مصنف "تذکرہ گل رعنا" نے بھی کی ہے۔ شاہ ہاشم علوی ان کے بھتیجے تھے۔ جو قدیم اردو کے اچھے شاعر گزرے ہیں۔

تصانیف | ان کی ایک تصنیف "تاج الحقائق" کا تذکرہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے دوسری تصنیف "بحر الحقائق" کے نام سے موسوم ہے۔

یہ کتاب سوال و جواب کی شکل میں مرتب کی گئی ہے۔ مرید فارسی میں سوال کرتے ہیں اور شاہ صاحب (وجیہہ الدین) ان کے جواب اردو میں دیتے ہیں۔ کچھ اقتباسات نیچے درج کیے جاتے ہیں۔ مجھے اس کتاب کے دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔

لیکن حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر عبدالحق نے اس کے الگ الگ اقتباسات اپنی تصانیف "اردوئے قدیم" و "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کے کام" میں درج کیے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو بزرگوں نے اس تصنیف کو دیکھا تھا۔

ؔ لفظ فرمودند کہ جس چیز میں ذوق و شوق پاوے اسے ترک نہ دیوے۔
یعنی در آں چیز یکہ صوفی ذوق و شوق یابد آں را ترک نہ دھد شخص گفت
اگر آں چیز متفق الحرمت باشد چہ کند از و اعراض نمود و فرمودند

---

[۱] : برکات الاولیا : میں سے بھی حالات زندگی اخذ کیے گیے ہیں
[۲] : اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ (۲۲)

؎ بھونڈا ہووے سونا کرے ؎

لفظ عزیزے عرض کرد بخانہ دنیاداران نروم فرمودند

: کاہے دنیادار بھی اپیچ : یعنی اہل دنیا نیز از ما اند

لفظ می فرمودند طالب کشف نہ باید شد

اپنوں کون کا کشف ہووے یا نہ ہووے کام اس کا ہے

در حکایت فرمودند :

کیا ہوا جو بھوکوں موا بھوکوں موئے تیں کیا خدا کون انپڑیا خدا کو انپڑنے کی استعداد ہور لفظ کسے [1]

میں کہاں یا کدھاں ریاضت کیتی

لفظ فرمودند : جیسی تجلی پکڑے تیسا ارادہ دیوے اگر عبد کی تجلی پکڑے عبدیت ارادہ دیوے

اور

(۱) کسے گفت کہ میاں جی شیخ فضل اللہ ترک درس کردند [2]۔

فرمودند : جب ترقی پکڑیں گے تب آپیں درس کہیں گے۔

(۲) عزیزے التماس کرد اگر اجازت شود اربعین نشینم

فرمودند : اس سیں ہور کیا خوب ہے اس دنیا میں کہ دل خداسوں مشغول ہووے

(۳) شخصے عرض کرد کہ عارف کرا گویند

فرمودند : عارف اسے کہویں جو خدا سوں بھریا ہووے

(۴) آپ کا ایک مقولہ ہے۔ ؎

---

[1] یہی جملہ حکیم شمس اللہ قادری نے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ اردوئے قدیم صفحہ ۲۳۔ یہ اقتباس اردوئے قدیم میں درج ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵

[2] یہ اقتباس "اردوئے قدیم" میں درج ہے ملاحظہ کیجیے صفحہ ۲۵۔

Hanif Raavi

اگر کسی کوں تھوڑی بھی صفا ہووے جو حرام لقمہ کھاوے یا حرام فعل کرے تو

پہنچ پاوے دوجے بار بھی پاوے تیجے بار بھی پاوے
دوسرے تیسرے

اس سے ظاہر ہو گیا کہ "سب رس" جسے ابھی تک شاہ میراں جی سے منسوب کیا جاتا تھا۔ درحقیقت شاہ میراں جی کی تصنیف نہیں، چونکہ نثر کے تعلق اس کا تذکرہ بھی ضروری تھا۔ اس لیے اس تصنیف کا ذکر یہاں کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس عہد کی تصنیف ہے۔

شاہ میراں جی اور وجیہہ الدین علوی گجراتی کے علاوہ شاہ علی محمد جیو گام دھنی۔ شیخ خوب محمد چشتی اور شیخ بہاؤ الدین برناوی خاتم التارکین بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ گو فی الحال ان بزرگوں کا کوئی نثری کارنامہ ہماری دسترس میں نہیں لیکن ان کا منظوم کلام دستیاب ہوتا ہے۔

Hanif Razvi

شاہ علی محمد جیو گام دھنی وفات ۹۷۳ھ

سید احمد کبیر کی اولاد میں سے تھے۔ شاہ علی جیو نے اردو میں بہت سے دوہرے لکھے۔ پروفیسر محمود شیرانی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"جب مخدوم بہاؤ الدین برناوی خاتم التارکین بہ سبیل سیاحت گجرات تشریف لے گئے۔ شاہ علی جیو کے مہمان رہے۔ اس قیام کے زمانے میں میزبان نے اپنا ہندی کلام جو عجیب و غریب اور لذت بحور میں لکھا تھا سنایا اور اپنا ایک رسالہ جو نکات دوقایق موحدانہ پر مشتمل تھا ہدیہ دیا" [1]

شاہ علی جیو کا کلام ان کے مرید شیخ حبیب اللہ نے ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ مدون کر کے اس کا نام "جواہر اسرار اللہ" رکھا ہے۔

ان کا اسلوب بیان "میران جی" سے ملتا جلتا ہے۔ مثلاً

نکتہ نہم: کھیں جدھیا بھرپا کھیلے ۔ ہنس تل بھی کھیں نہ میلے
آپین ناچے آپین گاوے ۔ آپین آپیں بہار دکھاوے [2]

اور

نکتہ دہم: ایک سمندر رہ سات کھاوے ۔ دھنوس بادل مینہ ہو آوے
وہی سمندر کر بوند کھاوے ۔ ندیاں نالے ہو کر چالے [3]

شیخ خوب محمد چشتی

گجرات کے رہنے والے اور شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے۔ انھوں نے تصوف میں ایک مثنوی "خوب ترنگ" لکھی۔ پھر اس کی شرح فارسی زبان میں کی۔ فارسی شرح کا نام "امواج خوبی" رکھا۔

مخدوم بہاؤ الدین برناوی خاتم التارکین

نویں صدی کی یہ بھی بڑی عظیم الشان شخصیت ہیں۔ ان کو فن موسیقی سے بیحد دلچسپی تھی۔

پروفیسر محمود شیرانی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

---

[1] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۲۲۱ - [2] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۲۲۰ - [3] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۲۲۰

صرف دو شخص فنِ موسیقی میں یگانۂ روزگار مانے گئے ہیں۔ امیر خسرو اور مخدوم بہاؤالدین[1]۔

کلبری۔ خیال۔ چٹکلہ۔ قوالی۔ ترانہ۔ دھرپد وغیرہ میں اشعار کہے۔ زبان کا نمونہ درج ذیل ہے:

ان نینن کا یہی بیسکھ ۔ ہوں تج دیکھوں توں نج دیکھ

میران جی کا فن

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ میران جی کا طرزِ بیان اپنے مذکورہ بالا معاصرین سے زیادہ سلیس ہے۔ میراں جی کے معاصرین نے ٹھیٹ گجراتی لفظ استعمال کیے ہیں۔

مثلاً

ہون (میں) اونڈا (گہرا) (پپوٹے) فوفوٹے، وغیرہ۔

میرآن جی ان کے بیٹے اور پوتے شاہ برہان اور شاہ امین الدین اعلےٰ کے ہاں گجراتی کا اثر اتنا گہرا نہیں گو انھوں نے بار بار اپنی زبان کو گجراتی کہا ہے۔

میرآن جی کی تصانیف کے مطالعے سے ان کی حسب ذیل خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میرآن جی نے نہ صرف ہندوستانی زبان اختیار کی ہے بلکہ ان کے فن کی خصوصیات بھی ہندوستانی ہیں۔ تصوف کی باتیں بیان کرتے ہوئے وہ ہندی شاعری کی تکنیک سے کام لیتے ہیں مثلاً عورتوں کی اصطلاحات میں سارے نکات بیان کرتے ہیں جیسے یہ کہ دنیا سسرال ہے آخرت پیکہ ہے وغیرہ۔ اپنی نظموں، "خوش نغز" اور "خوش نامہ" میں بھی انھوں نے یہی نہج اختیار کیا۔

میرآن جی سے پہلے عموماً فلسفیانہ مباحث صرف مذہب کے اطراف گھومتے تھے۔ لیکن میرآن جی نے دوسرے موضوعات جیسے عشق، عقل کے بنیادی مسائل پر بھی اچھی بحثیں لکھیں، شرح

[1] پنجاب میں اردو : صفحہ ۲۳۵

مرغوب القلوب ؛ میں ؛ عشق ؛ کا بیان اس طرح کرتے ہیں :

: جان کہ عشق قدیم ہے عشق حقیر عشق کبیر ہور عشق اوسط عشق حقیر سو بندیا کا خدا سوں محبت رکھنے کا ہور عشق کبیر سو خدا کا بندیاں ہیں محبت رکھیا ہور منکیا عشق اوسط دوئی میٹا نیکا راز ہے :

اس طرح کے مباحث سے انھوں نے زبان میں وسعت اور زور پیدا کیا انھوں نے ہندوستانی اشیا اور ماحول کی تصویریں بڑی خوبی سے کھینچی ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہندوستان کا دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے۔

؛ بیان ؛ سے قطع نظر ان کی ؛ زبان ؛ کی چند خصوصیات بھی قابل ذکر ہیں عجیب بات ہے کہ میراں جی اپنی زبان کو جگہ جگہ ہندی لکھتے ہیں لیکن ان کے فرزند نے اسے گجری بھی لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اردو ہی کے نام ہیں۔ جیسا کہ میر حسن ؛ سخن آفرینیان ہندی ؛ میں اس کی توجیہ کی۔

: جب یہ زبان دکن آئی تو اس میں دکنی نقطہ اور لہجہ داخل ہو کر دکھنی کہلائی گجرات میں پہنچی تو اس خصوصیت کی وجہ سے گجری یا گجراتی کہی جانے لگی :

خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے ان کا مقصد جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحق نے بھی لکھا ہے یہ ہے کہ :

: وہ زبان جس میں ان کا کلام ہے ہندی ہے لیکن گجری ہندی ہے[1]

میراں جی کی تحریروں کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجرات کا اثر ہے۔ غالباً اسی بنا پر ڈاکٹر عبدالحق نے ان کی زبان کو گجرات سے وابستہ کیا ہے۔ اور ان کی حسب ذیل گجراتی خصوصیات گنائی ہیں جو درج ذیل ہیں :

۱۔ : اچھنا : اور اس کے مشتقات میں گجراتی : چھے : کا اثر ہے۔

۲۔ : ہمن ۔ ہمنا : گجراتی : ہمنے : کا اثر ہے۔ : سمینا : کی طرح : سیکھنے : بھی گجراتی ہیں۔ فاعل و مفعول دونوں حالتوں میں استعمال ہوتا ہے۔

---

[1] رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۶ء

hanif raza

۳۔ "اپن" "ہم" کے معنوں میں گجراتی ہے۔

۴۔ "المنا" (وقت گزارنا) "سونا" (برداشت کرنا) "البھال" (بادل) "ایلڈر" (ورے) "ہیلاڈ" (پرے) "انجھو" (آنسو) "اندرا" (نیند) گجراتی کے الفاظ ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مولوی صاحب جس چیز کو گجرات کا اثر کہتے ہیں اس سے موجودہ زبان جو گجراتی کہلاتی ہے، وہ نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ "سینتی کمار چیٹرجی" نے "انڈو آرین اور ہندی" میں بتایا ہے۔ اس سے (گوجروں) کی زبان مراد ہے۔ جو پنجاب سے آکر گجرات پر حکومت کر رہے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب ان کے اسلوب کی خصوصیات کے بارے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ ان فارسی عربی الفاظ کی جو بگڑ بگڑا کر عوام کی زبان پر چڑھ گیے تھے، صحت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے گویا انھوں نے اس کو ہندی بنا لیا تھا۔ اور یہ اردو کے مزاج کے مطابق بن گیے تھے۔ جو بول چال نیز تحریر میں آتی تھی مثلاً

"دنیاں کو چھوڑ دیں گے بدل خدا تھی خدا کی مدت (مدد) سوں [۱]"

انھوں نے عربی فارسی الفاظ کو بجائے اپنی اصل کی طرف لوٹانے کے عوامی بول چال کے استعمال پر برقرار رکھنے کی کوشش کی

Hanif Razvi

(۶)

شاہ برہان اور شاہ امین کے نثری کارنامے

نویں صدی میں اُردو نظم و نثر کی تصانیف کی کثرت ۔ دکھنی درباروں کی سرپرستی ۔
شاہ برہان کی پیدائش و وفات ۔ تصانیف نظم :۔ ارشاد نامہ ۔ منفعت الایمان ۔
سک سہیلا ۔ حجۃ البقاء ۔ نعیم الکلام ۔ رموز الواصلین ۔ بشارت الذکر ۔ وصیت الہادی
نکتہ واحد ۔ پنج گنج ۔ کفر نامہ ۔

نثری تصانیف :۔ کلمۃ الحقایق ۔ مقصود ابتدائی ۔ ذکر جلی ۔ کلمۃ الاسرار ۔ معرفت القلوب
ہشت مسایل ۔ رسالہ تصوف ۔ تصانیف نثر پر تبصرہ ۔ شاہ برہان کے طرزِ بیان
کی خصوصیات ۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کے حالات زندگی ۔

منظوم تصانیف :۔ رموز السالکین ۔ محبت نامہ ۔ مفتاح التوحید ۔ قربیہ ۔ وجودیہ ۔
مدح شاہ برہان ۔ کشف الانوار ۔ رسالہ نظم و نثر ۔ رسالہ منظوم ۔ کرسی نامہ ۔

نثری تصانیف :۔ گنج مخفی ۔ گفتار شاہ امین ۔ نور نامہ ۔ ارشادات ۔ نکات المعرفت
رسالہ نظم و نثر ۔ عشق نامہ ۔ شرح کلمہ طیب ۔ ذکر نامہ ۔ ارشاد نامہ ۔ وجودیہ ۔

امین الدین اعلیٰ کا اسلوب ۔

Hanif Raza

۶

شاہ برہان اور شاہ امین کے نثری کارنامے

نویں صدی ہجری میں شاہ میراں جی کے علاوہ کبیر[1]۔ نانک[2]۔ خوب محمد چشتی[3]۔ شاہ علی جیوگام دھنی[4]۔ عبدالقدوس گنگوہی[5]۔ بہاؤالدین برناوی[6] اور گولکنڈہ کے اشرف[7]۔ اور فیروز[8] وغیرہ کے کارناموں میں بھی اُردو کے ابتدائی آثار دستیاب ہوتے ہیں۔ گو ان کے کارنامے منظوم ہیں۔ تاہم ان کی تخلیقات سے زبان کے ارتقاء کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس زمانے میں جن بزرگوں نے اردو کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہو گئی تھیں اور طوائف الملوکی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی بنیادیں بڑی حد تک مستقل ہو چکیں تھیں۔ ہندوستانیوں کو جنگ و پیکار سے فرصت ملی تو مذہب اور ثقافت کی طرف توجہ ہوئی۔ یوں بھی ہندستانی عوام پر ابتداء سے مذہب کا تسلط رہا۔ لیکن فرصت کے دور میں اس رجحان نے اور بھی شدت اختیار کر لی اس لیے اس زمانے کے عوامی ادب پر بھی مذہب کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ہندی میں یہ بھی دور "بھگتی کال" کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے کہنے والوں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔

---

[1] کبیر کے کلام کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔
[2] نانک کا کلام گرنتھ میں محفوظ ہے۔
[3] خوب محمد چشتی کی "خوب ترنگ" مشہور متصوفانہ مثنوی ہے۔
[4]
[5] "ارشاد نامہ" مشہور مثنوی ہے۔
[6] انھوں نے موسیقی پر ایک کتاب یادگار چھوڑی۔
[7] اشرف کی مثنوی "نوسرھار" ادارہ ادبیات اُردو میں ہے۔
[8] فیروز کا کچھ کلام بھی دستیاب ہوا ہے۔

Hanif Razvi

ان (Delete) کی تحریروں سے ایک قسم کے مشترکہ ہند لمانی کلچر اور تصورات و خیالات کو عام کرنے کی کوشش ظاہر ہوتی ہے۔ اس ہند لمانی کلچر کو عام کرنے اور پھیلانے میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتیں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ زبان کلچر کا سب سے اہم جز ہے اور اس زبان کی سرپرستی دونوں درباروں نے دل کھول کر کی۔ اور خود بادشاہوں نے عملی طور پر اس کی ترقی میں حصہ لیا۔ گولکنڈہ کا پانچواں بادشاہ محمد قلی (۹۸۸ہجری۔ ۱۵۸۰ء) جو میراں جی کے اٹھارہ سال بعد تخت نشین ہوا۔ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ گولکنڈہ میں شعر و سخن کا چرچا ابتدا ہی سے رہا تو بیجاپور میں نثر کی داغ بیل ڈالی اور وہیں اس کی نشو و نما ہوئی۔ میراں جی کے بعد ان کے بیٹے شاہ برہان الدین جانم اور پوتے امین الدین اعلیٰ نے اردو نثر کو بڑی وسعت دی اور کئی مستقل تصانیف یادگار چھوڑیں۔ شاہ برہان الدین کے متعلق ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

> لسانیاتی نقطہ نظر سے شاہ برہان الدین کے کارنامے محققین کے لیے کافی مواد پیش کرتے ہیں۔[1]

یہ صحیح ہے کہ قدیم دور میں شاہ برہان ہی وہ خوش قسمت ہستی ہیں جن کی اکثر تصانیف دستبرد اور تصرف زمانہ سے بچ رہیں اور جو قدیم ادب کے محققین کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے نثر کی کئی تصانیف کے علاوہ آٹھ ہزار اشعار کا سرمایہ چھوڑا ہے جس سے اس زمانے کے لسانی سماجی اور تہذیبی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔ شاہ برہان کا شاعرانہ آرٹ بھی شاہ میراں جی کے مقابلے میں زیادہ نشو و نما یافتہ ہے۔ شاہ برہان نے جس وقت لکھنا شروع کیا بیجاپور میں ہر طرف علم و ادب کا چرچا تھا۔ شاہ برہان علی عادل شاہ اول کے عہد حکومت ارشاد و ہدایت کا کام کرتے تھے۔ علی عادل شاہ ثانی خود بھی بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے ملک کے علماء و فضلا کی سرپرستی کی بلکہ دوسرے ممالک کے علماء کی بھی قدر دانی کی اور انہیں بیجاپور آنے کی دعوت دی چنانچہ مشہور عالم ملا فتح اللہ شیرازی اسی کی دعوت پر شیراز سے ہندوستان آئے تھے۔ دربار میں ہر ہفتہ تین بار شاہی

---

[1] اردو شہ پارے: صفحہ ۲۳

علماء فضلا جمع ہوتے اور بادشاہ کے روبرو مباحثے اور مناظرے کیا کرتے[1]۔ یہ شاہ برہان الدین کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں ایسا سازگار ماحول ملا۔

حالاتِ زندگی

شاہ برہان الدین "جانم"[2] اپنے والد کے نہ صرف خلیفہ بلکہ ان کے اصول کے بھی سچے پیرو تھے۔ اور باپ کے مستند ارشاد اور علم و فضل کے بھی صحیح وارث ثابت ہوئے۔ ان کو اپنے والد سے بڑی محبت تھی جس کا اندازہ اُن اشعار سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے والد کی مدح میں لکھے ہیں۔

ان کی ولادت سنہ ۹۵۰ھ میں بیجاپور میں ہوئی۔ صاحب "اولیائے دکن" لکھتے ہیں کہ سنہ ۹۵۰ھ ان کا سنہ وفات ہے[3]۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی "فہرست اُردو مخطوطات" جامعہ عثمانیہ میں اس سنہ کو مستند مانا ہے[4]۔ لیکن "اُردو مثنوی کا ارتقا" میں موصوف ہی نے سنہ وفات سنہ ۹۹۹ھ درج کیا ہے[5]۔ ڈاکٹر عبدالحق[6]، ڈاکٹر زور اور حامد حسن قادری، شاہ برہان کا سنہ وفات سنہ ۹۹۰ھ کے بعد قرار دیتے ہیں۔ اور اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ شاہ برہان نے خود اپنی نظم "نکتہ واحد" ۹۶۷ھ اور "منفعت الایمان" کے نیچے سنہ ۹۹۰ھ اپنے قلم سے درج کیا ہے۔ اس بناء پر مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ شاہ برہان کا سنہ وفات سنہ ۹۶۸ھ ہے[7]۔ ڈاکٹر زور کو اس سے اتفاق نہیں۔ وہ سنہ وفات سنہ ۹۹۰ھ بتاتے ہیں[8]۔ بعض اہم شواہد کی بناء پر جن کا ذکر آگے آئے گا یہی سنہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] "اُردوئے قدیم" صفحہ ، "بساتین السلاطین" اور "فتوحات عادل شاہیہ" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

[2] اِنکی وجہ کسی تذکرے میں مذکور نہیں۔ "جانم" کو بعض اوقات "جانِ من" بھی لکھا گیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر عبدالقادر سروری کی مقبوضہ بیاض میں "جانمن" درج ہے۔ یہ غالباً انکے والد کا دیا ہوا خطاب ہے۔

[3] "تذکرہ اولیائے دکن" صفحہ ۲۰۶

[4] "فہرست اُردو مخطوطات" جامعہ عثمانیہ صفحہ (۶۸)

[5] "اُردو مثنوی کا ارتقا" صفحہ ( )

[6] "رسالہ اُردو" جولائی سنہ ۱۹۲۷ء

[7]

Hanif Razvi

شاہ برہان نے علوم ظاہری و باطنی اپنے والد سے حاصل کیے۔ اور ان میں کمال حاصل کیا چنانچہ "اولیائے دکن" کے مصنف لکھتے ہیں۔:

"تصوف و سلوک میں متعدد رسائل تالیف کیے ہیں۔ توحید و تصوف کے دقایق و حقایق کو خوب شرح و بسط سے بیان فرمایا ہے"[1]

شاہ برہان نہایت نیک سیرت پاک باطن اور ہمدرد بنی نوع انسان بزرگ تھے۔ طالب علم والے واقعہ سے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کا دل دکھانا ان کے مسلک میں روا نہ تھا۔ چنانچہ جب ان کے والد ماجد نے طالب علم کو مایوس لوٹایا تو شاہ برہان کو اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اسے گھر لے آئے۔ اور خود تعلیم دی مصنف "برکات الاولیا" ان کے طرز ہدایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"علم طریقت اور سلوک راہ مولیٰ تعالیٰ میں ایک تازہ ڈھنگ اور اچھا طریقہ ایجاد کئے تھے۔"[2]

تصانیف

حکیم شمس اللہ قادری کو ان کی تصانیف میں صرف ایک "حجۃ البقا"[3] کا سراغ مل سکا تھا۔ لیکن ڈاکٹر عبدالحق نے ان کی تصانیف کی تعداد دس[4] بتائی ہے۔ حامد حسین قادری نے بھی ایک نثری رسالہ کا حال لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ان کی نو تصانیف[5] بتائی ہیں۔ مجھے مواد کی جستجو کے دوران میں برہان الدین جانم کی (۱۷) تصانیف کا پتہ چلا ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ان کی منظوم تصانیف یہ ہیں:

۱۔ ارشاد نامہ ۲۔ منفعت ایمان ۳۔ سک سہیلا ۴۔ حجۃ البقاء
۵۔ نسیم الکلام ۶۔ رموز الواصلین ۷۔ بشارت الذکر ۸۔ وصیت الہادی۔ ۹۔ نکتہ واحد

---

[1] تذکرہ اولیائے دکن صفحہ ( ) [2] برکات الاولیا صفحہ ( ) [3] اردوئے قدیم صفحہ (۴۵)
[4] رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۲۶ء
[5] تذکرہ اردو مخطوطات (جلد اول) صفحہ ۲۰ و دیباچہ "ارشاد نامہ" زیر طبع

Hanif Razvi

۱۰۔ کفر نامہ

۱۔ ارشاد نامہ: ان کی سب سے طویل نظم ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی میں تصوف کے مسایل سوال و جواب کے پیرائے میں سمجھائے گیے ہیں۔ اس کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اپنے والد اور مرشد شاہ میراں جی کی مدح میں کچھ اشعار لکھے ہیں۔ ایک جگہ ہندی میں لکھنے کی معذرت بھی کی ہے۔ "ارشاد نامہ" اور شاہ برہان کی دوسری نظموں کو ڈاکٹر زور مرتب کر کے شایع کر رہے ہیں

۲۔ منفعت الایمان: اس نظم میں ملحدوں کے عقاید بیان کیے گئے ہیں اور پھر ان کی تردید بھی کی گئی ہے

۳۔ سکھ سہیلا: یعنی "سکھ کا گیت" اسے ڈاکٹر حفیظ سید نے حواشی کے ساتھ شایع بھی کیا ہے۔ (۵۶) اشعار پر مشتمل اس نظم کے ہر بند کے آخر میں یہ شعر ٹیپ کے شعر کی طرح دھرایا جاتا ہے:

لوکاں یہ مت کچ الا دھی

جس بوجھ بختوں لا دھی

۴۔ حجتہ البقا: اس نظم میں جا بجا توحید اور اس کی ذات و صفات کی تلقین ہے۔ یہ سارے مطالب ایک ولی اور اس کے معتقد کے مکالمہ کے پیرائے میں بیان کیے گیے ہیں۔ یہ نظم بھی "ارشاد نامہ" کے ساتھ ڈاکٹر زور شایع کر رہے ہیں۔

۵۔ نسیم الکلام: (۴۵) اشعار کی اس نظم میں مذہب کے احکام و مسایل بیان کیے گیے ہیں۔ پہلے قرآن کی آیت دی گئی ہے۔ پھر اس کا مطلب اپنی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ گویا قرآن کی بعض آیتوں کی منظوم تفسیر ہے۔ اس نظم کا تذکرہ ڈاکٹر عبدالحق نے بھی کیا ہے[۱]۔ ڈاکٹر زور اس نظم کو بھی "ارشاد نامہ" کے ساتھ شایع کر رہے ہیں۔

۶۔ بشارت الذکر: شاہ برہان نے اس میں اپنے نثری رسالہ "ذکر جلی" کے مسایل منظوم کیے ہیں۔ یہ نظم (ساٹھ) اشعار پر مشتمل ہے۔ اور اس میں مختلف اذکار جیسے جلی خفی۔ قلبی اور روحی کی تشریح کی ہے۔ یہ نظم بھی "ارشاد نامہ" کے مجموعہ میں شامل ہے۔

---

[۱] "اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۶۵)

۷۔ رموز الواصلین :۔ نظم معرفت الٰہی کے نکات پر مشتمل ہے جس میں نور، روح، دل، نفس کی شناخت کا ذکر ہے۔ اس نظم کو بھی ڈاکٹر زور "ارشاد نامہ" کے شائع کر رہے ہیں۔

۸۔ وصیت الہادی :۔ اس میں بھی معرفت کے مسایل بیان کیے گیے ہیں کہیں کہیں "نسیم الکلام" کی طرح قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کی تفسیر بھی کی ہے۔ یہ نظم بھی "ارشاد نامہ" کے ساتھ چھپ رہی ہے۔

۹۔ نکتہ واحد :۔ اس کے کل ۲۹ شعر ہیں۔ توحید کی تلقین حرف ابجد سے کوئی لفظ بنا کر کی جاتی ہے ڈاکٹر زور اس کے متعلق لکھتے ہیں :

:۔ اس قسم کی دو نظمیں ہیں ایک (۱۲) شعر کی اور دوسری (۲۹) شعر کی لہ :۔

۱۰۔ کفر نامہ :۔ اس نظم کا تذکرہ کسی نے نہیں کیا ہے۔ مجھے اپنی تحقیقات کے دوران میں اس مثنوی کا ایک مخطوطہ کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں دستیاب ہوا۔ یہ نظم بڑی اہم ہے۔ اس میں اشعار فارسی اور اُردو دونوں میں لکھے ہیں۔ ایک بند فارسی میں ہے اور دوسرا بند اُردو یا ہندی ہیں۔ ہندی بندوں میں زیادہ تر ہندی شاعری کے لوازم کی پیروی کی گئی ہے۔ نظم میں سالک کی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ شاہ برہان کا صوفیانہ مسلک بہت ہمہ گیر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سالک خواہ مسجد میں بیٹھے خواہ کنشت میں، سالک ہی رہتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ہر جگہ خدا کو یاد رکھے۔ کیونکہ دونوں جگہ اسی کا جلوہ ہے۔ ابتدائی دور کے اکثر بزرگ اسی قسم کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ دین کے فیضان کو محدود کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ عالمگیر اخوت اور آپس میں بھائی چارہ بڑھانا ان کی تحریر اور تقریر کا اولین مقصد تھا۔ اس نظم میں جگہ جگہ شاہ برہان کا نام آتا ہے۔ جیسے اس شعر میں :۔

:۔ خدا تدعاء کم برہان چہ فرمود   ترا برہان گزیدن کرد بس سود :۔

ابتداء میں یہ اشعار ہیں :

:۔ کنم سر داستان کفر نامہ   ز اسلام مجازی کفر نامہ
بگو با من کہ ایں را ز جوید   ہمہ با سوز اندر ساز جوید

لہ۔ "اُردو شہ پارے" صفحہ ۳۲

Hanif Razvi

بیا گو کل خود خوان حکایت | کہ از عشق آمد این روایت
بتان ہند را ایں درجہ کار اند | ہنوز آن عشق کشن دارند
یکی از کشن میخواند حکایت | یکی دارد زوی شیریں حکایت
یکی خنداں یکی گریاں نہ دانم | چہ آمد ایشان شادی و غم
اگرچہ کشن از خلق است پنہاں | ولے باشد عیاں نزدیک ایشاں
چو می کردند مست از کثرت نوش | ہمی گویند پیش کشن مدہوش

اس کے بعد ہندی اشعار دیئے گیے ہیں جو درج ذیل ہیں :-

ہمیں کوئی رہین بسین سوہن جہاں نہان
تمہیں کن کہ جگائیں ہند ما نہان
تمہاری بانسری تے ہم جگائیں
تمہاری بند کارن یہ جگائیں
تمہاری بانس بنت جو بانسری ہے
ہماری بانسری یہ سانسری ہے

رسالہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

چو ایں ابیات را بنگاشت خانہ
نہادم نام آن با "کفر نامہ"

اس کے کچھ اور ہندی اشعار یہ ہیں :

ہمیں پورب دسا کی بات لائی | کتھانے پورب کہنے جو آئے
اپورب بات پورب کے نہ کہنی | سنبھوں کی بات سن سکے موندرہیئے
سنادیں وہاں چیری پورے کون | نہیں جو پوری جیری اُسنی کیوں

آخر میں پھر فارسی اشعار میں جن میں سے ایک میں شاہ برہان کا نام آتا ہے :

نشہ در امت عیسی گذارت | کہ برہان محمد کرد کارت

نثری تصانیف شاہ صاحب کی نثری تصانیف حسب ذیل ہیں :-

(۱) کلمۃ الحقایق (۲) مقصود ابتدائی (۳) ذکر جلی (۴) کلمۃ الاسرار (۵) معرفت القلوب (۶) ہشت مسایل (۷) رسالہ تصوف۔

۱۔ کلمۃ الحقایق : اس کے مخطوطے جامعہ عثمانیہ، آصفیہ اور ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زور نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق اس کے متعلق لکھتے ہیں :-

" یہ رسالہ اچھا بڑا ہے اور اس میں تصوف کے مسایل سوال وجواب کی طرز پر بیان کیے گیے ہیں " ۱؎

ڈاکٹر زور نے اس رسالہ کو اس لیے اہم بتایا ہے کہ

" دکھنی زبان کی تحقیق کرنے والوں کو اس سے بہت بڑی مدد ملتی ہے " ۲؎

پروفیسر عبدالقادر سروری نے جامعہ عثمانیہ کے مخطوطات کی فہرست میں اس کتاب کا تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔ اس میں شاہ برہان نے اپنی زبان کو " گجری " کا نام دیا ہے۔ اس میں خدا کائنات اور مسئلہ جبر و قدر پر فلسفیانہ بحثیں ہیں اور ان مسایل کو سوال وجواب کی صورت میں سمجھایا گیا ہے۔ سوال وجواب کا یہ طریقہ سنسکرت کی قدیم کتابوں میں بھی اختیار کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کے کلاسکی ادب میں مثلاً افلاطون وغیرہ کا نتیجہ فکر بھی مکالموں یعنے سوال جواب کی صورت میں ہی ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تفہیم کا ایک اچھا طریقہ ہے۔ شاہ برہان نے " کلمۃ الحقایق " میں بھی طریقہ اپنایا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اس رسالے کی ضخامت (۴۴) صفحات بتائی ہے۔ لیکن میری نظر میں مخطوط کی ضخامت (۵۶) صفحات ہے۔ ان مخطوطوں کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں کہیں کہیں حذف و اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے " کلمۃ الحقایق " کا جو اقتباس دیا ہے۔ وہ

۱؎ " اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام " صفحہ (۶۸)

۲؎ " تذکرہ اُردو مخطوطات " جلد اول صفحہ (۵۱) و " اُردو شہ پارے " صفحہ (۳۳)

۳؎ اس مخطوطے کو حال میں میں نے اپنے مقدمہ کے ساتھ چھپایا ہے۔ جس میں موجودہ تمام نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔

Hanif Razvi

اس مخطوط میں نہیں مل سکا۔ ان مخطوطوں کی عبارت میں جگہ جگہ اُردو اشعار بھی آئے ہیں۔ ساتھ ہی بیچ بیچ میں کہیں فارسی اور کہیں عربی عبارتیں بھی درج ہیں۔ ایک جگہ ذات باری تعالیٰ کے عرفان کی تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذات باری فہم سے جدا ہے۔ کیونکہ وہ ذات کامل اور انسانی عقل ناقص ہے۔ اس حقیقت کو شاہ برہان قرآن حدیث اور روایات کی اسناد کے ساتھ اس طرح واضح کرتے ہیں۔:

: قال اللہ تعالیٰ

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر

ایسا کس کا مجال ہوئے گا کہ پچھان ذات کا کرے گا۔

: قال نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تفکروا فی صفات اللہ ولا تفکروا فی ذاتہ

ولیکن جسے خدا پوری اسے راہ دیوی اپس ہیں کہ " یھدی من یشاء " امید دکھایا وہ مدد کیا کہ الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ تو جہد کوشش کرے خدا میں تے کہ قال علی صلوات اللہ علیہ کہ عرفت ربی بربی۔ تو سوال کر کہ " خدائے تعالیٰ اول تھے کون تھا :۔

جواب۔ بیچون وبیچگونہ تھا۔ (چون وچرا نا یدگفتنی ولیکن ہستی باقی لاشک وشبہ)۔

سوال۔ او کہاں تھا کہیں تو تعلقات جاگا سون دھرتا تھا بھی۔

جواب۔ تیرے وقت سون تعلق دھرتا ہے۔ تو ہر شے کا آفریدگار او ہے۔ ہور اس جاگا کا سب کا آفریدگار او ہے پچھان اس تی اول واول کا ہے۔ اول و آخر قدیم وجدید سب اتے زبان ہوتا اس تھے بول ہیں آیا کہ اول تی ہے۔ جملہ مخلوقات سرلامکان ہے :۔

قرآن وحدیث کے شواہد کے علاوہ مطالب کو سمجھاتے ہوئے مشہور صوفیا مولانا رومی اور ابوبکر شبلی کے خیالات اور اقوال بیان کرتے ہیں۔ جیسے کہ مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوگا۔:

: خواجہ روم از خواجہ شبلی پرسید.....

Hanif Razvi

سوال: پس سمجھ نہیں کیوں قرار دینا وتحقیق کفر کون انپڑنا کہ کچھ نہیں۔ پس کیوں۔

جواب: ای عارف تو نہ مخلوق ہے۔ تیرا تعلق ورہتا ایک جا گا۔ سو نے تعلق دھرتا ہے کہ تون بندہ عاجز ہے۔

سوال: قدرت کیا

جواب: خدا پنا کہ من خدا دندیم الی انا اللہ جسے فرمایا کہ آن مینے باشد بر ہمہ مینے۔

سوال: در قدرت وخدا چہ فرق باشد

جواب: کہ قدرت تعلق بانفعل دارد کہ اپنی فعل پر نمودار شاہد باشد۔

جبر وقدر کے مسئلہ کو اس طرح سمجھایا ہے:۔

" یہ تن ایک موس ہے اس میں جیو اس اوٹ کرلیا "۔

سوال: موس ایک ہے یا دو

جواب: موس ایک

سوال: کافر ومسلمان سمج کیوں

جواب: یہ تن موس کا تن کیری وخصلت سو اصلی موس اوتی کے اس خصلت جیو اس جیون اوتیا کیا۔"

بعض بعض جگہ ویدانت کی بھی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ جیسے " آکار " " نر آکار " وغیرہ۔ بعض اوقات عبارت میں ادبی خوبی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً ذیل کی عبارت میں ادبی شان پیدا کی گئی ہے:۔

" سوال: جکر کچھ نہیں کیا تھا۔ آپین آپ تھا پس نور نبی کیا کیوں ظہور۔

جواب: سن کہ اللہ تعالیٰ المخفی گنج تھا درامن امنیت درخودی خود نہ پنہاں نہ اظہار۔ نہ آکار نہ نراکار۔ نہ جلال نہ جمال نہ شوق نہ ذوق نہ یاد نہ فراموش نہ رانج نہ گنج ...."

شاہ برہان کی تحریروں میں ان کے پیش رو مصنفین کے مقابلے میں ادبیت زیادہ جھلکتی ہے۔ جس کی طرف اکثر اصحاب نے اشارہ کیا ہے۔ شاہ برہان کی زبان پر گجراتی کا بھی نمایاں اثر ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے ہندی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ جو ان سے پہلے کے مصنفین کے ہاں نہیں

ملتے ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو:

- یہ تن الادھا دستا۔ ولیکن جیتا بکار۔ ٹوٹنے نہیں بلکہ سنتتر بکار روپ دستا ہے۔ یک تل قرار نہیں جیوں مرکٹ روپ۔[1]

اوپر کے اقتباس میں الادھا (علحدہ)، بکار (متحرک) سنتتر (بدلنے والا) روپ (بھیس) اور مرکٹ (بندر) کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اسی لیے حامد حسن قادری نے شاہ برہان کی زبان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

- دکن میں اُردو زبان دہلی سے پہنچی تھی لیکن دکنی زبان کی اس قدر آمیزش ہو گئی کہ سمجھنا دشوار ہے۔[2]

لیکن قادری صاحب کی رائے شاہ برہان کی تمام تصانیف پر صادق نہیں آتی۔

۲۔ <u>مقصود ابتدائی</u>: اس رسالہ کا مخطوطہ ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں مصنف اور کتاب کا نام درج نہیں لیکن چونکہ یہ رسالہ شاہ برہان کے رسالے "کلمۃ الحقایق" کے ساتھ منسلک اور اسی ڈھنگ پر لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اسے شاہ برہان ہی کی تصنیف مانا ہے۔[3] اس رسالہ میں خدا اور کائینات کی ماہیت اور آغاز وغیرہ سے متعلق تصوف کے مسایل سوال و جواب کے پیرائے میں بتائے گئے ہیں۔ "کلمۃ الحقایق" کی طرح اس رسالے میں بھی آسمان۔ عرش کرسی اور لوح و قلم وغیرہ کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

- سوال۔ اول تھے اول کیا تھا۔ جواب: اول حق ہی ہچ تھا
- سوال۔ کیوں تھا جواب: بولیا آپ سین آپ تھا۔

سوال و جواب کے بیچ بیچ میں کہیں کہیں اشعار بھی آجاتے ہیں جن سے مطالب کی وضاحت کی جاتی ہے۔ رسالہ کا اختتام بھی ایک شعر ہی پر ہوا ہے جو حسب ذیل ہے:

---

[1] "یہ جسم علحدہ نظر آتا ہے لیکن زندہ متحرک ہے۔ ٹوٹتا نہیں بلکہ بدلتا رہتا ہے۔ متحرک حالت میں نظر آتا ہے۔ ذرا سی دیر کو قرار نہیں گویا بندر ہے"۔

[2] "داستان تاریخ اُردو" صفحہ (۲۷)

[3] فہرست اُردو مخطوطات جلد اول صفحہ (۵۴)

Hanif Razvi

؛ یوں دیکھے آپ ڈھونڈول
ست کر کیرے سانچے بول ؛

۳۔ کلمۃ الاسرار : اس کے دو مخطوط مجھے دستیاب ہو سکے ہیں۔ ایک مخطوط کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ[1] ہے۔ اور دوسرا کتب خانہ آصفیہ[2] میں آصفیہ والے مخطوطے کے حاشیہ پر واضح طور پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے :

؛ رسالہ حضرت شاہ برہان الدین جانم قدس اللہ برہانہ ؛

اس رسالہ میں ؛ کلمہ ؛ کی تشریح کی گئی ہے۔ یوں تو قدیم ادب میں ؛ کلمہ ؛ کی تشریح و تفسیر ؛ شرح کلمہ طیب ؛ اور ؛ کلمہ طیب ؛ کے نام سے بہتوں نے کی ہے۔ لیکن ؛ کلمۃ الاسرار ؛ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ؛ کلمہ ؛ کی محض صرفی و نحوی تشریح نہیں بلکہ عارفانہ شرح ہے اور تصوف کے نکات سمجھائے گیے۔ اس طرح یہ کتاب شاہ صاحب کی تصانیف میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔

اس رسالے کی دوسری بڑی خوبی اس کی ادبیت ہے۔ شاہ برہان کے دیگر رسالوں کی بہ نسبت اس کی زبان بہت سلیس ہے۔ اس میں وجود باری کا بیان بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا گیا ہے۔ خدا اور بندے کے تعلق کی توضیح مچھلی اور پانی کی خیال انگیز تشبیہ سے کی ہے۔
کلمہ کے باطنی معنی کی تشریح کرتے ہوئے آنحضرتؐ کی شہادت اس طرح دی ہے :

؛ کلمہ کا باطن معنا ہور ہے۔ جب تلک اس باطنی معنی کو نیں سمجھیا تب تلک مسلمان نہیں ہوا۔ مثال اس کی یو ہے کہ سورج کی دھوپ دیکھ کر معلوم کیا کہ سورج ہے، تب دھوپ نکلی ہے۔ اگر سورج نہ ہوتا تو دھوپ نا نکلتی ولیکن سورج کون دیکھا نہیں یو محمد صاحب کے معجزے دیکھ کر معلوم کیا کہ اللہ ایک ہے تب محمد صاحب کے معجزے ظاہر ہوئے ہیں۔ اگر اللہ نا ہوتا تو محمد صاحب کو نا بھیجتا

---

[1] کتب خانہ جامعہ عثمانیہ نمبر کیٹلاگ م ن ک ۶ ۲۹۷
[2] " " آصفیہ " ۶۲۳ فن تصوف

ہور محمد صاحب کے معجزے کہاں سے پیدا ہوئے ظاہر یو کلمہ کا معنا۔ بوجکر اتنا معلوم کیا کہ ولیکن خدا کون نیں دیکھا ہور محمد صاحب کون نہیں پچھانا کہ اللہ محمد بن کتنا تفاوت ہے۔ ہور اللہ کن کا ناون ہور محمد کس کا ناون یو رمز نہیں معلوم کیا و لیکن خدا کون نہیں دیکھا ہور محمد صاحب کون نہین پہچانا کہ اللہ محمد میں کتنا تفاوت ہے ہور اللہ کس کا ناوں ہے ہور محمد کس کا ناوں یو رمز نہیں معلوم کیا :

خدااور بندے کے وجود کوایک تمثیل کے ذریعے یوں سمجھاتے ہیں :

: ہور اس بیچوں بیچگونہ کون اپچھ دیک ہور یہ نکتہ اپنے دل پر یقین کر لیکھ لا الہ الا ھو الحی القیوم وھی نیچون بی چگونہ جسے لا کہتے ہیں۔ وہی چہ زندہ اپچھ قائم کنیرا ری بھائی انکھیاں جیا نکو نکو اس لاکون عین بیچوں بیچ کہ نہ بے شبیہ بے نمونہ ذات کو جان ہور یو بات ہماری جھوٹ اور خلاف کر نکو سمجھ کر ساپچ کرمان اگر کچھ تیرا ہی ہے۔ کیاں تو اسکون بھی لاچ سمجھ کر لا چہ دل میں سیکھ اس محل میں ایک حکایت یاد آئی۔

اس حکایت کو خوب دل سون سمجھ لا کی معنی دہیان میں لا ہور مچھلی ثمن لاکا دریا سب جا کا پانی نقل است۔ تب سب مچھلیاں نے آپس میں پانی بیچہ اچھکر فکران کیا کہ لوکاں کہتے میں مچھلیاں کا جیو مول سو پانی ہے ہور ہمیں پانی کیا ہے رہیکر دیکھیاں نہیں پانی کو دیکھنا پانی ہوا کیا ہور ہماری کتیک دا ٹھے ہو کدھر ہے آپس میں اپین فکراں کیاں ہور پانی کو بہوت ڈھونڈیاں ولیکن پانی ادنو کون نا دسیا پچھے ادو تین سون ایک مچھلی بولی کہ یو پانی ہمنا کون کہاں دس آئیگا۔ چلو فلانی بڑی مچھلی پاس او ہمنا کون پانی بتلائے گی ہور کہاں پانی کتیک دور ہے سو دکھلائے گی۔ تب اس مچھلی پاس سب مل کر گیاں ہور اپنی حقیقت بیان وار گیاں توں سب مچھلیاں سوں بڑی ہم سب مچھلیاں کی سردار ہے تجھے پانی معلوم اچھیگا۔ ہور توں پانی کو دیکھی اچھیگی خدا واسطے ہمنا کو پانی دکھلا کس

واسطے کہ لوکان کہتے ہیں پانی مچھلیاں کا ٹھاؤ ٹھکان ہے ہور پانی مچھلیاں کا جیو مول ہے۔ ہور مچھلی سدا دریا بیچ اچھتی ہے ہور پانی نہ ہووے تو مچھلی تڑپھڑا کر مرجاتی ہے۔ ہمیں تو پانی کیسا ہے دیکھیا نہیں ہور یو بات کیا ہے کہ اپنی جیو مول کو نا دیکھنا ہور جس مکان میں رہتے بستے ہیں اس مکان کو نا جاننا بڑی بیوقوفی ہور احمقی اور نادانی ہے بلکہ جو کوئی اپنے جیو کو نا پچھانے اس پر کھانا پینا حرام ہے پچھی اس بڑی مچھلی نے تعجب کر کے سینی ہور بولی کہ پانی تمنا کو کیوں دستا نیں تمہاری انکھیاں پر کہاں کا پردا ہے۔ ہور تمہارا دل کیدھر کون گیا ہے ہور تمنا کون کیسے غفلت نے گھیری ہے جو ایسا پانی تمنا کو دستا نہیں۔ اری بھائی دیوانیاں ہو پانی تمہارے نیچے اوپر دائیں بائیں ان کی پچھی تمارے موں میں حلق میں تماری کان انکھیاں میں تماری سینے دل جان میں بھریا ہے۔ ولیکن تمنا کون دستا نہیں۔ ایسا پانی کیوں نہیں دس آتا سو تعجب بات ہے۔ پچھی اس بڑی مچھلی نے یو سب کیفیت کہہ کر تلاتی تلاتی کیاری پاس مچھلیاں کون لی گئی ہور ایک جھکولا ایسا دے جو ساریاں مچھلیاں پانی میں سو ساریاں جا کر باہر پڑیاں ہور تڑپنے لگیاں پچھی بچاریاں کہیں سوں ہمنا کون کھینچ لے پانی میں وگرنیں تو ہمیں تڑپتہ کر مرجائیاں ہیں اب حقیقت پانی کی ہمنا معلوم ہوئی ۔۔

اس طرح مختلف تمثیلوں اور حکایتوں کے ذریعے خدا اور بندے کے تعلق کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایک حکایت سکندر و نوشابہ کی ہے کہ کس طرح سکندر ہرکارہ بنکر نوشابہ کے پاس گیا لیکن نوشابہ نے اسے پہچان لیا۔ اس حکایت سے آنحضرت کو اللہ کے رسول کی حیثیت سے پہچاننے کا درس دیا ہے۔ حکایت درج ذیل ہے :۔

:۔ پیغام سکندر بادشاہ کا پونچنا ہوں ہور کہتے ہیں نوشابہ بڑی صاحب عقل ہور صاحب فراست ہور دانہ تھی او تے بادشاہان کیاں تصویراں ہور سکندر بادشاہ نے اس کی تصویر لکھ کر اپنے پاس رکھی تھی سو معلوم کی کہ یہ رسول ہرکارہ نیں ۔

اس رسالہ کا تذکرہ کسی تاریخ یا تذکرہ میں نہیں ملتا۔

۳۳۔ ذکر جلی: ذکر جلی کا تذکرہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے اپنی فہرست مخطوطات میں کیا ہے۔ [۱] وہ لکھتے ہیں:

: یہ رسالہ بھی تصوف پر مگر نثر میں ہے :

اس رسالے میں مختلف اذکار اور تصوف کے اسرار بتائے گیے ہیں۔ رسالے کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی عورتوں کو دینی تعلیم دینے اور معرفت کے اسرار سکھانے لکھا گیا تھا۔ کیونکہ بہت سی باتیں اس میں عورتوں کی دلچسپی کی لکھتے ہیں۔ مثلاً سینا پرونا وغیرہ۔ اس کا ایک اقتباس نیچے دیا جاتا ہے:

: اللہ محمد کے راز رموز کیان باتاں کسی نامحرم کے انگے نا بولنا اگر بولے گا تو کافر ہووے گا نیا گا سو دیوانہ ہوئے گا کیسکون سنا کر دیوانہ نا کرنا ہور اپی بول کر کافر نہ ہونا اول طالب سون یوں شرط کرنا بعد از اتی اسکون ارشاد بولنا نظم ارشاد ہے یو ذکر بھی کا اس میں فیض ہے رحمت کا خاتمہ ہے اس فکر کا ختم ہے اس ذکر کا :

اس میں موقع بہ موقع اشعار بھی ہیں۔ مثلاً

جے کری سو ہووے خاص   اپنے پیر کا ہووے داس
یو ذکر جلی ہے کس کا نام   تس دن اسکون چین مدام

: ذکر جلی۔ کی تشریح اس طرح کی ہے :

: ذکر جلی کا ارشاد یوں ہے کہ اس زبان سون بولنا اللہ اللہ پلک سون پلک مارتے وقت بولنا اللہ اللہ آنک موندتی وقت بولنا اللہ اللہ آنک کھولتے وقت بولنا اللہ اللہ اسے منظر سون جو دستا ہے سو سب دیکھنا اللہ اللہ اس کانون میں آواز پہتی وقت سب سننا اللہ اللہ کھانے کے بھاندی میں ہات بھاتی وقت بولنا نوالہ باندتی وقت بولنا نوالا مون میں بھاتی وقت بولنا

---

[۱] فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ، ۷ نمبر مخطوط ۲۹۷۶۲

چابتی وقت بولنا نگلتی وقت بولنا پانی کے بھانڈی کو اٹھانے وقت بولنا کھت کھت پانی پیتے وقت بولنا سوتی وقت بولنا کروٹ بدلتے وقت بولنا پتی پکاتی وقت جھاڑتے جھوڑتے وقت سیتی پروتی وقت زور میلا کرتی وقت لکھتی پڑتی وقت اراخت فراخت کرتی وقت بھوک بھوکتی وقت رون رون رکی رگ سب اعضیاں سون بولنا یوں سب سنبھال کر برتی تو اسے : ذکر جلی : بولتے ہیں۔ سارا دن ساری رات اسی یاد میں اچھے جو کام کری سو اسے یاد میں کرے کوئی دم خالی نہ جاوے جو دم اسے یاد میں لازمی تو بہوت فایدہ ہے :۔

”عناصر“ کی تخلیق کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔ :

: ای عزیز تون وہاں انپر لگیا تو نور کی عناصراں ہور طبعتیاں کا دھات تجھے معلوم ہوے گا جو نکہ یو چار روز اکیاں طبعتیاں چار ہیں ماٹی۔ پانی۔ آگ بارا۔ ماٹی سب دنیا کی نسبت کیے ہیں دنیا کا پیدا ہونا اس تے ہے ہور یو عناصر ان ذاتی عناصراں تے پیدا ہیں۔ جو اول خدائے تعالیٰ اپنے کنج مخفی میں قرار تھا اپس سون اپیں ہور اس حال کا ناون ”ہوا“ کرد کھیا ہور ہوا کون بھی قرار نپا کر یوں خدائے تعالیٰ اپس سون اپس قرار پاتا ہے۔

شاہ برہان تشبیہ اور استعاروں کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں مثلاً :

: اس روحی عناصراں تے جسمانی عناصراں پیدا کیا ہے اس تن میں پانچ موذی ہیں چیل۔ سانپ۔ نیولا۔ کتا۔ بچھو۔

نظر سون چیل

کان سون سانپ

ناک سون ہنور

زبان سون کتا

شہوت سون بچھو

Hanif Razvi

ان پانچوں کو باندکر اللہ کی یاد میں اچھنا ہور اس تن میں پانچ چور ہیں ہو پانچ ساو ہیں۔

عقل کا چور	غصہ
علم کا چور	تکبری
نماز کا چور	کاہلی
روزہ کا چور	بھوک پیاس
ذکر کا چور	طمع۔ ہور اس تن میں آٹھ حب ہیں

اول حب ذات کا کہ میں سید ہوں یا شیخ ہوں کر یو حب پکڑیا ہی تو فنا ہے۔

دسرا حب قبیلی کا کہ میری بھایان ہور میری خویش بہوت بری۔

اسی طرح: حب: بقا کی تشریح کی ہے۔:

: اول حب اللہ کی یاد کا سو بقا ہے

دسرا حب جانات کا سو پیر کی جنت کا.... :

رسالے میں زیادہ تر تہذیب نفس پر زور دیا گیا ہے۔ زبان نسبتاً سلیس ہے۔

شاہ صاحب کے اسی رسالے کو ان کے ایک مرید شریف نے منظوم بھی کیا تھا[۱]

جس کا ایک مخطوطہ جامعہ بمبئی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس میں وہ اپنے مرشد شاہ برہان کا ذکر کرتا ہے۔ شاہ برہان نے خود بھی اسے منظوم کیا تھا اور: بشارت الذکر: نام رکھا ہے[۲]۔

۴۔ <u>معرفت القلوب</u>: اس رسالے میں شریعت، طریقت اور حقیقت کے راز اور طریقے بتائے گیے ہیں۔ اس رسالے کا ایک مخطوطہ آغا حیدر حسن صاحب سابق استاد اُردو نظام کالج حیدرآباد دکن کے کتب خانے میں ہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی بمبئی یونیورسٹی

[۲] ملاحظہ ہو مقالہ ہٰذا

رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

: بسم اللہ ناوں اللہ کا الرحمٰن مہربان الرحیم :
بخشنے ہارا اور بخشا ہنہارا ۔ سرانا نوازنا خدا کون
بہوت کہ اور پرورش کرنہارا تمام عالم کون :

جان اے سالک پچھانت کرنا شریعت کا ہور حقیقت کا ہور طریقت کا ہور معرفت کا اس ہیں بیان تمام ہے کہ نفع پانے کے بدل عالمان کون ہور عاشقان کون ہور واصلان کون اب تو سب کون تسلی دکھلاتا ہے ہور دل کون ان پر کر راحت پاتے ہیں :

۵ ۔ ہشت مسایل : اس نام کی ایک تصنیف کا تذکرہ مولوی عبدالحق نے خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کے سلسلے میں کیا ہے ۔ لیکن آغا حیدر حسن کے کتب خانے میں اس کا ایک مخطوطہ ہے اور یہ شاہ برہان سے منسوب ہے ۔ ہشت مسایل ، کائینات کے آغاز اور ذات باری تعالیٰ کی تشریح و تفسیر ہے اور معراج محمدی کا حال بھی اس میں بیان کیا گیا ہے ۔ جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے واضح ہوگا :

: پیغمبر صاحب صلی اللہ وعلیہ وسلم کون معراج ہوا تب محمد رسول اللہ علیہ السلام نے سوال کیے سات طبق آسمان اور سات طبق زمین کیا قدیم ہے یا جدید ۔

جواب : خدا کہیا اے حبیب من ایں ہمہ جدید آفریدہ شد ۔

سوال : تو کچھ نہ تھا تو کیا تھا

جواب : سنجہ سون میں تھا :

یہ پورا رسالہ اسی طرح سوال جواب کے پیرائے میں لکھا گیا ہے ۔

۶ ۔ رسالہ تصوف : شاہ برہان کے اس نثری رسالہ کا حوالہ مجھے پروفیسر عبدالقادر سروری کی اسی بیاض میں دستیاب ہوا ہے ۔ جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے ۔ رسالہ

پر یہ عبارت درج ہے :

"من کلام حضرت شمس المحققین شاہ برہان الدین جانمن بیجاپوری قدس اللہ سرہ"

اس کے نیچے "ارشاد نامہ" درج ہے جس سے غالباً آپ کے فرمودات مراد ہیں چنانچہ بیاض میں اس کے بعد ہی جس رسالے کا نوٹ درج ہے اس کے عنوان پر بھی "ارشاد نامہ" لکھا ہوا ہے اور یہ شاہ کمال الدین کی تصنیف ہے جو میراں جی کے مرشد اور استاد تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

"ظاہر کا تن واجب الوجود۔ اس کا دیکھ روح جاری۔ اس کا شاہد شہود"

اس رسالے کا اختتام نظم پر ہوتا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے :

"باناں سو قدر یر کر ہوا ناوں
وہ اسم مرید بیٹ اور پاوں"

شاہ برہان کا طرز بیان

شاہ برہان کے نثری رسالے مختصر ہیں۔ لیکن ان کی زبان اگلے مصنفین کے مقابلے میں زیادہ صاف اور سلیس ہے۔ ان میں بہت سی ادبی خوبیاں بھی ملتی ہیں۔ ان کے ادبی رسالوں کی ادبی خوبیوں اور شاعرانہ لطافتوں کی طرف اکثر محققین نے اشارہ کیا ہے چنانچہ ڈاکٹر مولوی عبد الحق لکھتے ہیں :

"ان کا کلام میراں جی کے لگ بھگ ہے۔ مگر اس سے کسی قدر صاف ہے اور اس میں شاعرانہ ذوق بھی کسی قدر صاف ہے"[1]

آگے چل کر ایک اور مقام پر مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ :

"شاہ برہان کا کلام اگرچہ سادہ ہے لیکن بعض مقامات پر شاعرانہ لطافت بھی پائی جاتی ہے"[2]

ڈاکٹر زور نے بھی شاہ برہان کے اسلوب کی ادبی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

---

[1] "اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۶۳

[2] " " " " " " " " ۶۷

وہ لکھتے ہیں :

" باپ کی طرح ان کی نظمیں بالکل صوفیانہ خیالات اور اعتقادات سے مملو نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے پڑھنے سے شاہ برہان کے ذوق شعری کا بھی پتہ چلتا ہے " ۔ ؎۱

واقعہ یہ ہے کہ شاہ برہان کا اسلوب اور زبان قدیم دور کے مصنفین میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کے لیے صرف اُردو کو منتخب کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندی زبان میں لکھنے میں کوئی عیب نہیں اور طالب حقیقت کو متنبہ کرتے ہیں کہ معنی کو دیکھنا چاہیئے۔ لفظوں پر خیال دھرنا بیکار ہے۔ کیونکہ سمندر کے موتی اگر کسی " ڈابر " (جوہڑ) میں بھی ملیں تو عقلمند آدمی انھیں کیوں نہ لے ؟ چنانچہ :

" ارشاد نامہ " میں صاف طور پر کہتے ہیں :

" یہ سب بولوں ہندی بول — پن تو انبھوتی گھول
عیب نہ راکھیں ہندی بول — معنی تو چک دیکھ ڈھنڈول
جو نکے موتی سمندر سات — ڈابر جے لاگیں ہات
کیوں نہ لیوے اس بھی کوے — سہانا چیز جو کوئی ہوئے
ہیں سمند کے موتی یو — گیان رتن کے جوتی یو " ؎۲

اور

" ہندی بولوں کیا بکھان — جے گر پرشاد تھا منج گیان "

۲۔ شاہ صاحب کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نظموں میں اکثر ہندی بحریں استعمال ہوئی ہیں۔ اور وہ ہندوستانی اور اسلامی دونوں روایات اور تلمیحات سے یکساں کام لیتے ہیں۔ مثلاً یوسف زلیخا وغیرہ کے ساتھ وہ سری کرشن جی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

؎۱ " اردو شہ پارے " صفحہ ۳۳

؎۲ " ارشاد نامہ " صفحہ ( ) مطبوعہ انجمن دکھنی مخطوطات

Hanif Razvi

۳۔ ان کی نظموں کی بحروں میں موسیقیت اور ترنم ہے تشبیہہ اور استعارے برجستہ ہوتے ہیں۔ فلسفیانہ مضامین کو وہ ہلکی پھلکی زبان سے بڑی عمدگی سے ادا کرتے ہیں مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں جس شخص میں "آدم" کے گن نہ ہوں اس کو انسان کیسے کہہ سکتے ہیں۔ صورت اعتبار کے لائق نہیں بلکہ اوصاف زیادہ اہم ہیں۔ شعر یہ ہے :

"جو آدم کے گن نہ راکھے   کیوں کہلائے انسان"

۴۔ شاہ برہان کے ارادت مندوں اور شاگردوں کا حلقہ کافی بڑا نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان کے بعد کے اکثر لکھنے والے ان سے گہری ارادت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف ایک اچھے عالم ہی نہیں تھے بلکہ ان کے ذاتی اوصاف اور ان کی سماجی حیثیت بھی مسلم تھی اپنی نوع انسان کی بھلائی اور اس کی روحانی اور اخلاقی رفعت کے لیے انھوں نے عمر بھر کام کیا اور نہ صرف خود کام کیا بلکہ دوسروں کو بھی کام کرنے پر ابھارا۔ شاہ صاحب کے ارادتمندوں کے دل میں ان کی جو عقیدت تھی اس کا اندازہ ان مدحیہ اشعار سے لگ سکتا ہے جو ان کے مریدوں نے ان کے متعلق لکھے۔

ان کا ایک مرید شریف تھا جس نے ان کی رسالہ "ذکر جلی" کو منظوم کیا اور "کشف الاذکار" نام رکھا تھا۔ اس نظم کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے وہ لکھتا ہے :

"تو آشنا برہان کی دار او پر
کہ او سالکاں کی جو ہے راہ بر"

ایک اور مرید نے جس کا نام معلوم نہ ہو سکا اور جس کی مثنوی "پنج گنج" کا مخطوطہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے اپنے پیر کے بارے میں اس طرح رطب اللسان ہے :

"دکن کے جو ہیں پیر شاہ برہان
کہے دو وزا سون ہر انگ کو بیان
اول توں یوں جان لے
دوم وجہ ترکس کیرا دھیان لے

Hanif Raza

شاہ امین الدین اپنے والد شاہ برہان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

سانچا حضرت شاہ برہان
سیرت ہو کر گیتی جہان [1]

اس مخطوطے کی تفصیل پروفیسر عبدالقادر سروری نے فہرست مخطوطات میں دی ہے

[1] فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۲۸

Hanif Razvi

شاہ امین الدین اعلیٰ

مذہبی تصنیفات و تالیفات کا یہ دور جس کی شروعات بندہ نواز سے ہوئی تھی دو سو سال تک یعنی شاہ امین الدین اعلیٰ کی وفات (۱۰۶۸ھ) تک جاری رہا۔ شاہ امین الدین اور ان کے معاصرین نے نثر کی طرف کافی توجہ کی۔ اس زمانے میں نہ صرف مذہب کے موضوع پر طبع زاد کتابیں لکھی گئیں بلکہ عربی فارسی کی مستند کتابوں کے ترجمے بھی اُردو میں کیے گئے جن میں سے : شرح تمہیدات[1] : شرح عوارف المعارف[2] : ترجمہ شمایل الاتقیا[3] : احکام الصلوٰۃ[4] : مفتاح الخیرات : وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اب اُردو میں اتنی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی کہ اس میں فقہ تفسیر حدیث اور قرآن کے دقیق مسایل کی افہام و تفہیم خوش اسلوبی سے کی جا سکتی تھی۔ اس سلسلے میں شاہ امین الدین اور ان کے خلفاء و تلامذہ کے نام یادگار رہیں گے۔

حالات زندگی

شاہ امین الدین اعلیٰ قدیم دور کی مذہبی تصنیف و تالیف کے سلسلے میں آخری بزرگ ہستی ہیں جنھوں نے اپنی ساری عمر عوام کو احکام دین کی تبلیغ کرنے اور ان کے کردار کو بلند کرنے میں گزار دی۔ جس طرح ان کے والد شاہ برہان کے سنہ وفات اور

---

[1] مصنف میران جی خدانما

[2] مصنف

[3] مصنف میران یعقوب

[4] مصنف مولانا عبداللہ

Hanif Razvi

ان کے دادا میران جی شمس العشاق کے سنین ولادت و وفات میں اختلاف ہے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کی بھی سنین وفات و پیدائش میں بھی علماء مختلف الرائے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر گریم بیلی لکھتے ہیں ؎۱ ۔

THE RELATIONS OF FATHER SON AND GRAND SON SAID ON PAGE 17 TO HAVE ESISTED BETWEEN NO: 5·6 'AND 8 (SHAH MIRANJI) SHAH BURHAN AND AMIN UDDIN ALA IS ACCORDING TO POPULAR REPORT OBWOIS BY ONE OR TWO GENERULIONS. HAVE DROPPED OUT.

یعنی ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ درمیان میں ایک آدھ پشت چھوٹ گئی ہونگی اور وہ ان ہی غلط سنین کی بدولت ہوا۔

شاہ امین الدین بیجاپور کے آخری چار تاجداروں ابراہیم عادل شاہ ثانی، محمد عادل شاہ علی ثانی اور سکندر عادل شاہ ثانی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ شاہ امین اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے اور شاہ برہان کے وفات کا سنہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق ۱۰۶۸ھ سنہ تسلیم کیا جائے تو شاہ امین الدین کی ولادت ۱۰۶۸ سنہ ہجری ہوتی ہے۔ اس سنہ کو حکیم شمس اللہ قادری بھی مستند مانتے ہیں۔ ؎۲

شاہ امین کا سنہ وفات مصنف اولیائے دکن نے ۱۱۱۶ سنہ ہجری لکھا ہے جس کو ڈاکٹر عبدالحق صحیح نہیں سمجھتے۔ انھوں نے رسالہ اُردو میں اُردو کے مصنفین کو روشناس کرانے کا سلسلہ قدیم اُردو کے سلسلے کے نام سے شروع کیا تھا۔ اس میں شاہ امین الدین اعلیٰ کے حالات لکھتے ہوئے ان کا سنہ وفات ۲۴ - رمضان ۱۰۸۶ سنہ ہجری بیان کرتے ہیں ؎۳ ۔

؎۱ مختصر تاریخ ادب اُردو صفحہ ۹ ؎۲ "اُردوئے قدیم" صفحہ ۸۸

؎۳ رسالہ اُردو سلسلہ "قدیم اُردو"

Hanif Razvi

یہ تاریخ وفات انھوں نے مندرجہ ذیل شعر سے نکالی :

تاریخ و اسم و خطاب از ہاکنم آمد ندا

شاہ امین الدین علی فرد قطب الاولیاء

مولوی صاحب نے مذکورہ بالا ماخذ نہیں بتایا۔ حکیم شمس اللہ قادری سنہ وفات ۱۰۸۳ھ بتلاتے ہیں۔ حامد حسن قادری بھی مولوی عبدالحق کے تتبع میں شاہ امین کا سنہ وفات ۱۰۸۶ھ ہی لکھتے ہیں۔ حامد حسن قادری نے مادہ تاریخ "ختم ولی" بتایا ہے۔ ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" میں ان کا سنہ وفات ۱۰۸۷ھ مانا ہے [1]۔ ساتھ ہی حاشیہ میں انھوں نے اس شبہ کا بھی اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں :

" راقم نے شاہ امین ان کے والد شاہ برہان اور دادا میران جی کے متعلق مواد انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کے ایک مضمون سے حاصل کیا ہے جنھوں نے ان کی تصانیف انجمن کے کتب خانہ کے لیے جمع کی ہیں۔ راقم کے پاس تحقیق کے لیے فی الحال سوائے اس کے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے کہ ان سنین کی تحقیق کرے اور ثبوت بہم پہنچائے۔ کیونکہ یہ بتلایا گیا ہے کہ دادا کا انتقال ۱۴۹۶ء میں ہوا اور شاہ امین کا ۱۶۷۶ء میں "

" روضۃ الاولیائے بیجاپور " میں سنہ وفات ۱۰۸۵ھ بتایا گیا ہے۔

اگر ۱۰۸۵ھ یا ۱۰۸۶ھ یا ۱۰۸۷ھ کو جو قریبی سنہ ہیں صحیح مانا جائے اور سنہ ولادت ۱۰۶۸ھ قرار دیا جائے تو شاہ امین کی عمر کل سترہ۔ اٹھارہ اور انیس سال ہی کی ہوتی ہے۔ اگر مصنف "تذکرہ اولیائے دکن" کے سنہ پر اعتبار کیا جائے تو عمر ۴۸ سال کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ لیکن ۱۱۱۶ھ یعنی مصنف "اولیائے دکن" کی تاریخ بھی صحیح نہیں سمجھی جا سکتی اس وجہ سے

---

[1] "اردو شہ پارے" صفحہ ۶۹

کہ وہ شاہ امین کے حالات زندگی میں لکھتے ہیں :

: عالمگیر آنے کے پیشتر آپ فوت ہو گیے : لہ

عالمگیر نے سنہ ۱۰۹۷ہجری میں بیجاپور کی عادل شاہیہ حکومت کا خاتمہ کیا۔ اس لیے ان کا سنہ وفات سنہ ۱۱۱۶ہجری نہیں ہو سکتا۔ اگر شاہ برہان کا سنہ وفات سنہ ۹۹۰ہجری مانا جائے تو شاہ امین کا سنہ پیدائش سنہ ۹۹۰ہجری اور سنہ وفات سنہ ۱۰۷۵ہجری قرار پاتا ہے۔ تمام تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ وہ مادر زاد ولی تھے کیونکہ شاہ برہان خود بھی بلند پایہ عالم اور صوفی تھے۔ ان کے امرا اور معتقدین کا بڑا حلقہ تھا۔ شاہ امین کی سب عزت کرتے تھے جو کوئی ان کے سامنے جاتا زمین پر سر رکھ دیتا تھا۔

شاہ امین کے علم و فضل خوارق عادات کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ اگر ان روایتوں کو صحیح نہ بھی مانا جائے تو کم سے کم اس سے ایک بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کے عقیدت مندوں کے دل میں اور عام طور پر ان کے زمانے کے لوگوں میں ان کا بڑا احترام تھا۔

محمود خوش دہان نے جو شاہ برہان کے محبوب خلیفہ تھے۔ ان کو ظاہری تعلیم اور خلافت کا خرقہ عطا کیا تھا۔ انھیں شاہ برہان کی کلاہ شاہ عطا اللہ چشتی نے اپنے ہاتھ سے پہنائی تھی شاہ امین بھی اپنے دادا : شمس العشاق : کی طرح مرتاض اور متقی بزرگ تھے۔ ان کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ ایک حجرہ میں بارہ سال تک چلہ نشین رہے۔ اس کے بعد ہدایت و ارشاد میں مشغول ہوئے۔ شاہ امین کی طبیعت کی افتاد کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتے تھے۔ ان کے سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مذہب کے احکام ظاہری کے زیادہ پابند نہیں تھے۔ اکثر اوقات حالت جذب میں مستغرق رہتے تھے۔ جب اس کیفیت کا غلبہ ہوتا تو نظم و نثر میں عرفان کے حقایق اور اسرار ارشاد فرماتے تھے۔ صاحب : تذکرہ اولیاے دکن : نے لکھا ہے کہ مذہب کے احکام ظاہر سے لاپروائی کے سبب ایک روز بیجاپور کے تمام علماء نے سکندر ثانی سے درخواست کی کہ وہ انھیں اپنے حکم

لہ : تذکرہ اولیاے دکن : صفحہ ۱۱۹

Hanif Razvi

کے ذریعہ احکام دین کی پابندی پر مجبور کرے۔ چنانچہ بادشاہ کی طرف سے یہ حکم آمین الدین کے پاس بھجوایا گیا کہ وہ نماز ادا کیا کریں ورنہ ان پر بھی شرع کی حد جاری کی جائے گی اور سماجی مقاطعہ کیا کیا جائے گا۔ یہ حکم سُن کر شاہ آمین نے فرمایا کہ سب سے کہو کہ میں کل شرع کی پیروی کروں گا سب کے سب تالاب کے کنارے موجود رہیں۔ مقررہ دن بادشاہ اور علما تالاب کے کنارے پر پہنچے شاہ صاحب بھی آئے اور خادموں کو حکم دیا کہ وہ مصلیٰ تالاب میں روئے آب پر بچھائیں سب نے اس کو مذاق سمجھا۔ لیکن جب خادموں نے حکم کی تعمیل کردی تو سارے علما اور حاضرین ششدر رہ گیے ۔ل۔ اسی واقعہ کو ڈاکٹر عبدالحق نے اس طرح بھی بیان کیا ہے کہ سید محمد بخاری جو اس زمانے کے بڑے عالم تھے جب انھیں اطلاع ملی کہ شاہ آمین ارکان شرعی اور صوم وصلواۃ کی پابندی نہیں کرتے تو وہ چند اور عالموں اور بزرگوں کے ساتھ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا بزرگان دین باوجود شہود و استغراق کے ارکان شرع کو ترک نہیں کرتے تھے۔ آپ کا یہ فعل مناسب اہل طریقت نہیں جس پر آپ نے اپنے ایک خلیفہ کو شاپور کے تالاب کے وسط میں مصلیٰ بچھانے کا حکم دیا۔ اور آواز دی کہ :" کوئی ہے جو مجھے نماز پڑھائے " لیکن کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ تب آپ نے خود مصلے پر جاکر نماز ادا کی۔ اور تالاب کے باہر آئے۔ اس خارقِ عادت واقعہ پر تمام علما ان کے قدموں پر گر پڑے اور ان کی کرامت کے قایل ہوگیے۔ شاہ صاحب نے سکندر عادل شاہ ثانی سے خطاب فرمایا تھا " ہم نے ان سیاہ رویوں کو نکالا او سفید رویوں کو بلایا " تھوڑے دن نہیں گزرے کہ عالمگیر بادشاہ بیجاپور میں آیا۔ اور بیجاپور کو تسخیر کرلیا۔ عالمگیر کے آنے سے پیشتر آپ کا انتقال ہوچکا تھا لیکن لوگوں نے عالمگیر کے آنے کو شاہ آمین کی مذکورہ بالا پیش گوئی پر محمول کیا۔

اولاد تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جب ان کے گھر لڑکا تولد ہوتا تو وہ اس کے جسم پر ہاتھ پھیر کر فرماتے :" آرام کرو " بچہ فی الفور فوت ہوجاتا۔ جب بابا حسینی پیدا ہوئے والدہ

ل : تذکرہ اولیائے دکن ، صفحہ ۱۱۹

نے بارہ برس تک انھیں حضرت سے چھپائے رکھا۔ وہ ایک دن انجانے پن میں حضرت کے سامنے آگیے۔ والدہ پریشان ہوئیں تو انھوں نے بیوی سے کہا کیوں غم کرتی ہو یہ بابا حسینی ہے اس کی نسل قایم رہے گی۔ پھر صاحبزادے کو خلافت کا خرقہ مرحمت فرمایا بابا حسینی بھی اپنے اسلاف کی طرح ارشاد و ہدایت کا فرض انجام دیتے تھے۔ ان کے بھی مریدین کا وسیع حلقہ تھا۔

خلفاء

"تذکرہ اولیائے دکن" میں مذکور ہے کہ شاہ امین کے خلفا کی تعداد کثیر تھی۔ مشہور خلفا شاہ میراں جی سید حسن خدا نما۔ سید خداوند خدا نما۔ اور قادر لنگا ہیں۔

تصانیف

شاہ امین نے اپنے والد اور دادا کی طرح نظم و نثر دونوں میں کارنامے چھوڑے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے شاہ صاحب کی تصانیف میں متعدد رسالوں کی نشان دہی کی ہے [۱]۔ ڈاکٹر زوران کی شاعری اور تصانیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شاہ امین فطری شاعر تھے اردو زبان میں انھوں نے کئی ایک کتابیں تصنیف کی ہیں" [۲]

شاہ صاحب کی جن منظوم تصانیف کا پتہ چل سکا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ رموز السالکین ۲۔ محبت نامہ ۳۔ مفتاح التوحید ۴۔ قربیہ ۵۔ وجودیہ ۶۔ بیج شہ برہان ۷۔ کشف انوار ۸۔ رسالہ نظم و نثر ۹۔ رسالہ منظوم ۱۰۔ کرسی نامہ

یہ تمام تصنیفیں ان کے دو مجموعوں (۱) "مجموعہ رسایل امین الدین اعلاٰ" اور (۲) "جواہر الاسرار" میں محفوظ ہیں۔ شاہ امین کی ساری نظمیں مختصر ہیں۔ ان میں شاہ برہان کی نظم "ارشاد نامہ" کی طرح کی طویل نظم ایک بھی نہیں ہے۔ کتب خانہ ویلکور میں جو مجموعہ "جواہر اسرار" کے نام سے موجود ہے اس میں نمبر (۱) تا (۵) نظمیں شامل ہیں۔ اس

---

[۱] "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۳۷

[۲] "اردو شہ پارے" صفحہ ۶۹

مجموعہ کا ذکر حکیم شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں کیا ہے۔ لیکن شاہ امین کی یہ نظمیں اور مختلف کتب خانوں میں بھی ملتی ہیں جن کا تذکرہ ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری نے کیا ہے۔

نمبر ۶ تا ۱۱ نظمیں کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے "رسایل امین الدین اعلیٰ" میں موجود ہیں جن کی تفصیل پروفیسر سروری نے اپنی مرتبہ فہرست میں لکھی ہے۔ ان نظموں کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱۔ "رموز السالکین": اس نظم کو پروفیسر سروری، ڈاکٹر زور اور حکیم شمس اللہ قادری سب نے شاہ امین الدین اعلیٰ کی تصنیف مانا ہے۔ اس میں ذات باری تعالیٰ کی صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس نظم کا آغاز ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے:

"اللہ پاک منزہ ذات | اس سوں صفاتاں قایم سات
علم ارادت قدرت بار | سنتا دیکھتا بوسن ہار
ہے صفت یہ جان حیات | اس کو ناہیں کد ممات
ایسی صفاتاں سوں ہے ذات | جو نکے چند نے چند سنگات" [۱]

لیکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ان اشعار کو "نسیم الکلام" کے اشعار بتایا ہے۔ جو شاہ برہان الدین کی تصنیف ہے۔ عبدالحق صاحب کی تحقیق سے ڈاکٹر زور کو اتفاق نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے شاہ برہان کی تصنیف "ارشاد نامہ" اور دیگر مثنویوں کے ساتھ اسے شامل نہیں کیا۔

۲۔ "محب نامہ یا محبت نامہ" کے متعلق مولوی عبدالحق[۲] اور ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ یہ ایک عشقیہ نظم ہے جو قصیدے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔

پروفیسر سروری لکھتے ہیں:

---

[۱] "فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ" صفحہ ۳۵
[۲] "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۷۰
[۳] "اردو شہ پارے" صفحہ ۶۹

: قدیم اُردو میں اس طرز کی نظمیں کم دستیاب ہوتی ہیں چنانچہ : محب نامہ : جو کافی طویل نظم ہے اس میں قافیہ اور ردیف کے التزام میں دشواری پیش نہیں آتی۔ تاہم ان کی پابندی اب بھی بہت زیادہ آسان چیز نہ تھی۔ اس لیے آپ نے عموماً ہر دو شعر کے بعد قافیہ تبدیل کر دیا ہے :

آگے چل کر پروفیسر سروری لکھتے ہیں :

: اس کا قافیہ ایک ہی ہے مگر ردیف کہیں کہیں بدلی ہوئی ہے۔ اس کا نمونہ درج ذیل ہے

قمر بن نین تیرے ساحر ہوے ہمن کو | گمراہ کر بلاوے قوس و قزح بھون کون
بچوں بھوباں زلف تج موجوں ڈبے بحر موں | ہر لہر پر کرشمہ عشاق کے بچن کون :

۳۔ مفتاح التوحید : مجھے کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ صرف حکیم شمس اللہ قادری کے بیان سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حکیم صاحب نے اس نظم کو شاہ امین الدین کی تصانیف میں شامل کیا ہے

۴ و ۵۔ : قربیہ : اور : وجودیہ : نظمیں : ویلور : کے مجموعہ : جواہر الاسرار : میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے مخطوطے مدیر رسالہ تاج کے کتب خانہ میں موجود تھے۔ جس کا حال پروفیسر سروری نے لکھا ہے۔

پروفیسر سروری کہتے ہیں :

: وجودیہ اور قربیہ کا پتہ مدیر رسالہ تاج کے کتب خانہ سے چلا ہے جن کی ابیات کی مجموعی تعداد تین سو بیالیس ہے :

اس وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ امین کی یہ کسی قدر طویل نظموں میں سے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے : وجودیہ : کا یہ اقتباس دیا ہے :

: نفس کا دوڑنا ہے اس ٹھار | یو تو آہے نفس بچار
نفس کو لیا د تو دم کی جاگا | لائیں ذکر تیں تو جاوے بھاگا

۶۔ مدح شاہ برہان : یہ ایک مختصر سی نظم ہے۔ جو قصیدے کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اور اس میں شاہ برہان کی مدح کی گئی ہے۔ اس نظم کا تذکرہ پروفیسر سروری اور ڈاکٹر زور دونوں نے کیا ہے۔

۷۔ کشف الانوار : اس نظم کا تذکرہ پروفیسر سروری نے : فہرست اُردو مخطوطات : میں کیا ہے [1]۔ اس کا موضوع بھی تصوف ہے اور اس میں ذات باری تعالیٰ کی تشریح کی گئی ہے شاہ امین : نور احدیت : اور : نور واحدیت : کی توضیح اس طرح کرتے ہیں :

: ابین نور اور کل کا ظہور — احمد نور اور واحد نور
ان بیچ وحدت وہ ہے نور — ذات صفات اور آسمان نور
یہ سب جملہ نور قدیم — وہ حق ابین آپ مقیم
وہ سکہ جس کون آب حیات — اس کو نائیں کد ممات :

۸۔ رسالہ منظوم : (رسایل شاہ امین اعلیٰ) میں کئی رسالے ایسے ہیں جن میں نظم و نثر دونوں شامل ہے۔ اس رسالہ کا حال بھی پروفیسر سروری نے لکھا ہے [2]۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے

: الٰہی کلیاں کھول حاجات کیان
بر آوے امید اس مناجات کیان
تیرا ناداں کیلی ہر ایک گنج کا
تیرا رحم مرہم ہر ایک رنج کا :

۹۔ رسالہ منظوم ۲ : (رسایل شاہ امین) اس کا مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں ہے :

: اسا قدرت کا ہے میں — قدر سون ہے مانڈیا کھیں
نہیں فرق اس دوجا کوئی — قدرت کا چھو صاحب ہوئی
نور محمد امین حال — ہر دم پیو سون ہاں کی وصال

اس کے علاوہ ان کی کئی غزلیں اور دوہرے بھی ملتے ہیں۔

---

[1] اُردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ ۔ صفحہ ۲۸

[2] فہرست اُردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ ۔ صفحہ ۲۹

Hanif Razvi

نثری تصانیف

شاہ امین کے حسب ذیل نثری رسالے اب تک دستیاب ہوئے ہیں۔ رسالوں کے نام یہ ہیں :

۱۔ گنج مخفی
۲۔ گفتار شاہ امین
۳۔ نور نامہ
۴۔ رسالہ ارشادات
۵۔ نکات معرفت
۶۔ رسالہ نظم و نثر
۷۔ عشق نامہ
۸۔ شرح کلمہ طیب
۹۔ ذکر نامہ
۱۰۔ ارشاد نامہ (نثر)
۱۱۔ رسالہ تصوف (وجودیہ)

ذیل میں مذکورہ رسالوں کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں :

۱۔ گنج مخفی

شاہ امین کے اس نثری رسالے کا تذکرہ سب سے پہلے ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں کیا تھا [۱]۔ اس رسالے میں ذات باری تعالیٰ کی تشریح، عقاید صوفیہ کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ :

: اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیان کرنا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکل سو اس سے امین، دیکھ ہوا۔ امین شاہد کہتے ہیں یو دونوں ذات کے دو طور ہیں ذات نے اپس کو دکھیا اسے نظر کہتے ہیں دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں :

مولوی نصیرالدین ہاشمی نے بھی اپنی کتاب "دکن میں اردو" [۲] میں اس رسالے کا ذکر کیا ہے اور اقتباس بھی دیا ہے۔ لیکن یہ اقتباس مذکورہ بالا اقتباس ہی ہے جو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی کتاب میں مندرج ہے۔ اسی بنا پر قیاس یہ ہے کہ مولوی ہاشمی صاحب کی معلومات کا ماخذ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی کتاب ہی ہے۔

۱۔ "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۷۲

۲۔ "دکن میں اردو" صفحہ (۲۱۵)

Hanif Razvi

مجھے "گنج مخفی" کا ایک مخطوط کتب خانہ درگاہ امین الدین اعلیٰ میں دستیاب ہوا ہے۔
اس میں شاہ امین اپنے مرشد سید محمد حسینی کا حوالہ ان الفاظ میں دیتے ہیں۔ :

"سید محمد حسینی میرے پیر، عبد کون تون ہے دستگیر۔
اللہ مجھ پر کرم کر، برکت محمد پیغمبر۔"

رسالے میں زمین آسمان عرش کرسی کی وضاحت انسانی اعضا کی تشبیہہ کے ذریعہ سے کی گئی ہے۔ جابجا اشعار بھی آتے ہیں۔ مسلکِ صوفیہ، رموز اور تکوینِ خلق اور دوسرے مسایل جیسے محمد کا ظہور، ذکر جلی۔ قلبی اور روحی کا بیان ہے۔ اور "من میں ڈوب کر سراغ زندگی" پانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس رسالہ کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ قدیم گنج مخفی میں آپ مقیم پانچ ذکران میں مکتا اپی جلی قلبی روحی سری خفی۔ الس میں تھا آپ خفی اندیشا کیا سو دوسری دیکھا الس روحی سون بوجا الس قلبی سون جلی ذکر میانی اون آنلہی بولیا کن فیکون محمد ہو کر نکلا بہار ابر قہ خاکی کر اظہار پنج تن لیانی اپین رب ہر ہر تن میں پنج کی سب ذات کیوں کیا نور جھلک جیئو سون یو ہے دیکھ ایک نزد کھواب تجکون بیان فرض جایز میں سب کون عیان ذات یان۔"

اشیائے کائنات کی تشریح انسانی اعضا کی تشبیہہ کے ذریعہ اس طرح کرتے ہیں :

"زمین پر جیون ہے ندیا لہران ۔ تیون ہے جسد کے سب ہزا (اعضا)
زمین پر جیوتی جیا نیل ساری تنگی سر کے بال
تس برابر ہد انکھ میں جو برابر ہد نفس میں
تیرے رخسار ہے کرسی پیشانی تیری ہے عرش کی کنگوری
تلی کہی سو زمین کا قیال کلیجا کہی سو ...... (دِ مٹا ہوا)
سورج حال دل ہے چاند کے مانند جان کر دے یں۔ تاریان تیون بیجیان روح بادشاہ عقل وزیر کتووان ہے۔"

Hanif Razvi

"گنج مخفی" کو شاہ امین کے ایک مرید معظم نامی نے منظوم کیا ہے۔ اس نظم کا ایک مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے [1]۔ معظم، سکندر عادل شاہ کے عہد کا شاعر تھا۔ اس کی اور دو تصانیف "شجرۃ الاتقیا" اور "گنج مخفی" کا تذکرہ نصیر الدین ہاشمی صاحب نے "دکن میں اردو" میں کیا ہے [2]۔ معظم نے اپنے مرشد شاہ امین کی مدح حسب ذیل اشعار میں کی ہے:

"اب جانوں بیجاپور | ہے پور وہاں شہ پور

وہاں امین علی ہے پیر | ہے روشن دیکھ ضمیر

ہے پیر میرا تو قادر | اور حاضر ہے اور ناظر"

معظم نے سلطان سکندر کی مدح میں بھی چند شعر لکھے ہیں جن میں سے ایک شعر یہ ہے:

"جیوں تو شہنشاہ دیکھ پہچانے | سلطان سکندر جانے"

۲۔ گفتار شاہ امین: اس رسالے کا تذکرہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو "رسالہ اردو" [3] میں شایع ہوا ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

"ایک چھوٹا رسالہ گفتار شاہ امین کے نام سے ہے۔ جس میں تصوف کے بعض مسایل اور بعض اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔"

۳۔ نور نامہ: یہ رسالہ "مجموعہ رسایل شاہ امین الدین اعلیٰ" میں شامل ہے جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے۔ اس پر پروفیسر سروری نے فہرست مخطوطات میں تشریحی نوٹ لکھا ہے [4]۔ رسالہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد و آلہ اجمعین۔ بدان راشدک اللہ فی الدین"

---

[1] "تذکرہ اردو مخطوطات" جلد اول صفحہ ۱۴۸

[2] "دکن میں اردو" طبع چہارم صفحہ ۲۱۲

[3] "رسالہ اردو" جلد ہشتم شمارہ

[4] "فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ" صفحہ ۳۴

بر طلب صادق مخفی و محتجب نماند کہ حق تعالیٰ در قرآن مجید فرمودہ کہ

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

ہور اس کا معنا خدا کہیا ہے دیا کہ تحقیق نہیں کوئی موجود جز ایہن ..... ؏

اس کے بعد نورِ معرفت کی تجلیات کے مظاہرے کا ذکر ہے۔

؏ کہتا دوسری یکہ تمیز یو ہے کہ نور یکہ دریا بے پایاں ہے اس پر موظان (موجان) آتیاں جاتیاں سو عرفان ہے اس دریا کے بہیتر تے موظان پر تیا سو ذات کا میوہ ہے ؏

۴۔ ارشادات: اس کی صرف تمہید نثر میں ہے [1]۔ "ارشاد نامہ" نامی ایک اور رسالے کا مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ذکر کیا ہے [2]۔ جس کا پتہ انھوں نے مولوی عبد اللہ صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں چلایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ امین نے اپنے والد شاہ برہان کی مثنوی "ارشاد نامہ" کو نثر کا جامہ پہنایا۔ "ارشادات" کے مطالب کو نو ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کو "تماشا" سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس طرح اس رسالے میں نو "تماشے" ہیں۔ پہلا "تماشہ" نظم سے شروع ہوتا ہے:

؏ سفر تماشا ظاہر و باطن دیکھنا لازم تجھ امر الست بربکم مختار میثاق تھے بوجہ
پہلا تماشا دیکھنا واجب پہلے تن کا بھوکیہ حواس خمس ہو کیوں کر بریں کتیا کتے
سنجو کہ پانچ اناسر ؏

۵۔ نکات معرفت: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں وجود اور معرفتِ باری کے رموز بیان کیے گیے ہیں یہ رسالہ بھی کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے اور پروفیسر سروری نے اس کی کیفیت "فہرست" میں قلمبند کی ہے۔ ذیل میں اس رسالہ کا اقتباس درج ہے:

؏ اللہ بڑا صاحب ہے اسکوں بھوت ہور نور درنا اس کے خدائی تھے۔

---

[1]

[2] : دکن میں اردو، طبع چہارم صفحہ ۲۱۵

دونوں عالم پیدا کرنے میں عقل کیا انکھیاں حیران ہیں خدا دایم قایم ہے :

یہ عبارت شروع کے حصہ تمہید کی ہے اس کے بعد سے ابواب شروع ہوتے ہیں۔ پہلا باب : بصیرت اور بصارت : کے عنوان سے ہے۔ لیکن نسخہ کرم خوردہ ہے اور بعد کے اوراق غائب ہیں۔

: اُجلے کاغذ پر اس کالی ستران میں نور تو نا دیکھین اسے مخلوق کہتے ہیں ای چین
پہلے قرآن ہیں خدا کہیا اس قرآن کون کاغذ :

۶۔ رسالہ نظم و نثر : یہ رسالہ بھی نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہے۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے : مجموعہ رسایل شاہ امین : کے مخطوطہ میں شامل ہے۔ اس میں شاہ امین نے اپنے والد شاہ برہان کے اقوال کے حوالے جا بجا دیے ہیں۔

: ہور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح بھی اور تمام پیغمبران کی روح بھی ہر
یکیک احوالان کی روح بھی گذرنے کی اب آگے ہونے والے کاماں ہور اب گذرے
کاماں اس طالبوں کو

۷۔ عشق نامہ : یہ رسالہ چھ رسالوں کے ایک مجموعہ کے ساتھ کتب خانہ درگاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپور میں مجھے دستیاب ہوا۔ لوح پر عبارت : رسالہ امین الدین اعلیٰ : درج ہے۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل رسایل ہیں :

۱۔ : چہار پیر و چہار خانوادہ : مصنف نامعلوم

۲۔ : رسالہ تصوف : " " (فارسی زبان میں)

۳۔ : کتاب المرغوب فیہ الکلام لب لباب حل الرموز مفاتح النور اسرار اللہ : درج ہے۔

۴۔ : رسالہ عشق نامہ : شاہ امین الدین اعلیٰ

۵۔ : رسالہ فارسی : مصنف نامعلوم

۶۔ : شرح کلمہ طیب : شاہ امین الدین اعلیٰ

: عشق نامہ : کی ابتداء درود سے ہوتی ہے اور آگے چل کر عشق خداوندی کے رموز بیان کیے

Hanif Razvi

گیے ہیں۔ ذیل کے اقتباس سے رسالے کے مطالب کا اندازہ ہوسکے گا :

: لیکن بھایوں کتا ہے پیچ اسباب کی امید الی اللہ لاتقنطو من رحمت اللہ ای بھائی جان کر پیچ اس جہان کے تین چیز ہیں۔ یعنی عشق، ہور عاشق، ہور معشوق، یہ تین ظاہر ہیں۔ جب یو عشق بیچ دل کے بترکے تو جو کچھ کے غیرت ہوئی یعنی محبوب ہو تو اوسی جلا ڈال جیسا کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں جہاں عشق است دیگر زرق ساری ہمہ بازیست الاعشق بازی جس وقت کرای اک تیری تئیں حاصل ہوئی یعنی تیرے دل میں عشق پیدا ہوئی تو تن نیر اچھیا لکڑی ہو یکا ہیں سو جل جاوی یعنی دوی جل جاوے تو جب تو ن نارہے تیرے ہیں :

۸۔ شرح کلمہ طیب : یہ رسالہ چودہ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا آغاز بھی "عشق نامہ" کی طرح محمد صلعم اور صحابہ اور اہلبیت پر درود سے ہوتا ہے۔ آگے چلکر "کلمہ طیب" کی شرح کی گئی ہے۔ ذیل میں اس کا اقتباس درج ہے :

: جان جو بنا اسلام کی ہور دین رسول اللہ علیہ وآلہ کا کلمہ طیب اور وہ جامع ہے خاص سب مراتب عروجی ہور نزولی کتین ہور تجلیات الٰہی کتین :

اس کے ساتھ چند عربی اشعار ہیں جن کی شرح دکھنی میں کی گئی ہے نمونہ حسب ذیل ہے۔ :

: اتشفع امتہ بی فاذا ارادا الذکر :

شفاعت کا کرامت کا اپنی باپ کے پس جس وقت ارادہ کرے ذکر تمہاری کے۔

۹۔ ذکر نامہ : اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔ ایک اور مخطوطہ کتب خانہ درگاہ شاہ امین الدین اعلیٰ میں بھی مجھے دستیاب ہوا لیکن درگاہ امین الدین اعلیٰ کا مخطوطہ بہت مختصر اور صرف ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس طرح یہ مخطوطہ نامکمل ہے۔ : ذکر نامہ : میں ذکر کے مدارج بتائے گیے ہیں۔ اسی موضوع پر ان کے والد شاہ برہان نے بھی لکھا ہے۔ لیکن عبارت اور اندازِ بیان دونوں کا مختلف ہے۔

ذیل کے اقتباس سے مختلف اذکار کی تفصیل واضح ہوتی ہے :

: ذکر جلی یعنی زبان سوں ہے ہور تمام باتاں وہی ہے ۔ ذکر قلبی یعنے دل میں یاد، ذکر روحی جیو کی بہتر نظر سوں، ذکر سری بہتر نذر کے وہ مقصود تحقیق، ذکر خفی غیر اللہ ثابت کرتا ہے ۔ دیکرادس و (رسوان) ذکر جلی میں کرتا زبان سوں اپنی صفت خدا کی کرنا جوں محیط ہے یوں مقصود پچھانی ہور معرفت کریں و قلبی جیکچہ کیا و بیان کیا ہور سو وہ اپنے دل میں قرار خدا و روح جوں اپنے دل میں قرار کیا ہے ۔ و تحقیق دیکھے مشاہدہ اللہ کا دسے جیکچہ دیکھا سو اس پر محبت بکریں سب چیزوں میں ایسی پچھانیں ہور دیکھیں :

اس کے بعد ایک فارسی حکایت لکھی ہے :

ارشاد نامہ : اس رسالہ کا تذکرہ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب : دکن میں اردو[1] کیا ہے ۔ اس کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے ۔ :

: بسم اللہ نام اللہ کا ۔

اللہ محمد کے راز رموز کے باتاں کسی نامحرم کے آگے نا بولنا بولینگے تو کافر ہوینگے سو دیولانے ہووینگے تو انو کوں بول کر دیولانے نا کرنا ہوا بی سنا کر کافر ہونا یو شرط اس زبان سوں ذکر کرنا اللہ اللہ ...... اے بار خدایا ارادت کو مجھ پر آستی تا کہ تیری احد ذات میں فنا ہوئی الف کا لا نفی الا اثبات ذات تعلق صفات بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔

پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کی بیاض میں اسی نام کا ایک رسالہ ملتا ہے لیکن اس کی ابتدائی عبارت مختلف ہے ۔ ذیل کا اقتباس مذکورہ بیاض ہی سے اخذ کر کے یہاں دیا جارہا ہے :

---

[1] "دکن میں اردو" صفحہ ۲۱۵

Hanif Raza

" ثنا اور شکر سزاوار ہے اس خدا کون جو انسان کیتئیں مشرف کیا ہے اپنے ذات وصفات کے معرفت سون "

رسالہ وجودیہ : اس کا تذکرہ بھی مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے کیا ہے۔ لیکن مرتب مقالہ کو یہ رسالہ دستیاب نہ ہو سکا۔ مولوی ہاشمی صاحب کی کتاب سے اس رسالے کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے :

" اے عارف خدائے تعالیٰ قرآن میں فرمایا ہے، کُلُ شیٔ محیطاً وَ فِی اَنْفُسِکُمْ اَفَلاَ تُبْصِرُوْنَ

اس واسطے ضرور ہوا کہ کچھ معرفت حق کا بولنا جون آپ کون سمجا کیا

تبتوں قال علیہ السلام تکلم الناس علیٰ قدر عقلوھم

یعنی آدمی بات کرتا ہے اپنی عقل موافق

جو کوئی پیر کامل سون یہ دیکھے عن اوس کا متاع ہے نین ہے

اے عارف ہر ایک انسان کون پانچ وجود ہیں ہر ایک وجود باری تعالیٰ کا ہے

ہر ایک وجود کی شرطاں اور لوازمات ہیں "

شاہ امین کی تصانیف پر تبصرہ

شاہ امین کے اسلوب بیان کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں :

" شاہ امین کی زبان اپنے دادا شمس العشاق میران جی اور اپنے والد شاہ برہان سے کسی قدر زیادہ صاف ہے "۔ [1]

ڈاکٹر زور نے بھی تقریباً اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :

" باپ اور دادا کے مقابلے میں شاہ امین کے اسلوب بیان میں بہت روانی اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ دوسرے ہم عصر شعرا کے مقابلے میں ان کی شاعری فطری اور قیود شعری سے آزاد ہے "۔ [2]

---

[1] رسالہ " اردو " جلد ۲۹ ۔ ۔ ۔ [2] " اردو شہ پارے " صفحہ ۷۰

پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں :

" شاہ امین الدین کی شخصیت اس عصر کے شعرا میں سب سے مقدس ہے۔ اسلاف کی طرح آپ نے بھی سلوک و معرفت میں کئی رسالے ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں چند منظوم ہیں اور کچھ نثر میں ہیں۔ نظم فرمائے ہیں۔ نظم میں آپ نے کچھ جدتیں بھی کیں مثلاً آپ کی نظم جو "محب نامہ" کے نام سے منسوب ہے۔ غزل کے قافیہ کی ترتیب رکھتی ہے "

آگے چلکر لکھتے ہیں :

" قدیم اُردو میں اس طرز کی نظمیں کم دستیاب ہوتی ہیں یہ نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان اُردو میں پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ وسعت پیدا ہو گئی تھی " ؎۱

شاہ امین کا اسلوب ان کے باپ اور دادا کے رسالوں کے اسلوب کے مقابلے میں کسی قدر نشو و نما پایا ہوا ہے۔ اور شاہ برہان پر ہندی کا اثر زیادہ تھا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جاچکا ہے۔ شاہ برہان کی اکثر نظموں کی بحریں بھی ہندی ہیں۔ شاہ امین کی تحریروں سے عربی اور فارسی کے اثر کی زیادتی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے اسلوب بیان پر بھی فارسی کا تھوڑا بہت اثر ہے۔ وہ فارسی اضافتوں اور ترکیبوں سے بھی بہت کام لیتے ہیں مثلاً ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو :

۱۔ اے بار خدایا ارادت کو مجھ پر آستی کر۔ تیری احد ذات میں فنا ہوئی۔ الف کالانفی الاثبات۔ (رسالہ وجودیہ)

۲۔ تحقیق ذکر ہے غیر نفی اللہ ثابت کرتا ہے : ؎۲ (ذکر نامہ)

؎۱ اُردو مثنوی کا ارتقاء صفحہ ۵۸

؎۲ مقالہ ہذا صفحہ

۳۔ جو کوئی پیر کامل سوں یہ دیکھے عین اس کا ستاج ہے:

بعض جگہ عربی فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ مثلاً

معشوق حق اللہ نُور ہُنا علیٰ نُور ہے ٭ نبی پر کٹ ذات ظہر ہے

حقیقت حقایق ذات کمال ہے صورت معنی ذوالجلال ہے ٭ ؎۱

شاہ امین کی اکثر نظموں کی بحریں فارسی ہیں مثلاً ذیل کی غزل ہیں:

راہ صراطِ پُل جون سر مانگ جو چھپی ہے ٭ کاہے کشان سمان پر محب بلاوے کون

اور

زدستم رفت عنان جو رہیا نہ ہوش منج میرا

بیا اے ماہ ظلماتم دھڑک دل کون کی دیتا نیں ؎۲

شاہ امین کے رسایل زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے لکھے ہوے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں عوامی مسلوں کو بیان نہیں کیا گیا بلکہ صرف تصوف اور حقیقت کے مسایل ہی بیان کیے ہیں شریعت کے مسایل پر بھی وہ زیادہ توجہ نہیں کرتے۔

؎۱ : اُردو کی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام : صفحہ ۲۰

؎۲ : رسالہ اُردو جلد ششم : صفحہ ۲۹

Hanif Razvi

(۷)

شاہ برہان الدین اور شاہ امین کے خلفاء و تلامذہ

نثر کی ترقی۔ مذہبی تحریروں کی طرف رجحان ۔ اس دور کے مشہور مصنفین ۔ مولانا عبداللہ مصنف : احکام الصلوٰۃ :۔ میران جی خدانما : شرح تمہید : : رسالہ وجودیہ :۔ : چکی نامہ :۔ : شرح تمہید : کے مختلف ترجمے۔ شاہ میران حسینی :۔ خلاصۃ الرویا :۔ میران یعقوب : شمایل الاتقیا : شاہ برہان الدین قادری راز الٰہی :۔ : وجودیہ :۔ شاہ نور محمد قادری : رسالہ نور دریا : : نوبطون :۔ عابد شاہ : گلزار السالکین : : کنز المومنین : عبد الصمد : تفسیر وہابی :۔ محمد شریف : گنج مخفی : حبیب اللہ قادری : تحفۃ المرسلہ : ولی اللہ قادری : معرفت السلوک : شاہ میر : اسرار توحید : انتباہ الطالبین : نوبطون : رسایل قادریہ :۔ : عوارف المعارف : اور چند اور کارنامے جن کے مصنفین کا پتہ نہ چل سکا۔ مذہبی نثر پر تبصرہ۔

Hanif Raza

(۷)

شاہ برہان اور شاہ امین کے خلفاء و تلامذہ

نثر کا جو بیج آٹھویں صدی میں بویا گیا تھا (۵) نویں اور دسویں صدی ہجری میں نخل اور درخت کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اور گیارھویں صدی میں اسے برگ و بار آنے لگے۔ شاہ میراں جی اور ان کے خاندان کے بزرگوں نے اردو میں تصنیف و تالیف کے جو معیار قایم کیے تھے۔ ان ہی کو ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں اور بعد کے لکھنے والوں نے اپنا نمونہ (Models) بنایا۔ قدیم دور کے وہ شاعر اور انشا پرداز پیدا ہوئے جن کے بلند رتبہ کارناموں کی وجہ سے اس دور کو "زرین دور" سے بجا طور پر موسوم کیا گیا ہے۔

اس دور میں اُردو نظم و نثر کی وسعت کا اندازہ شاعروں اور ادیبوں کے اس وسیع گروہ سے ہوتا ہے جو اس زمانے میں ابھرا اور نظم اور نثر میں ایسے کارنامے پیش کیے جو اب "کلاسکس" کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان میں گولکنڈے کے تاجدار محمد قلی اور اس کے دربار کے شعرا وجہی۔ غواصی اور ابن نشاطی نے معرکتہ الآرا ادبی اور شعری کارنامے پیش کیے۔ بیجا پور میں شاہ میراں جی۔ شاہ برہان الدین جانم۔ شاہ امین الدین اعلیٰ۔ شاہ میراں جی خدا نما۔ مولانا عبداللہ نے مذہبی اور فلسفیانہ تحریروں کو ترقی دی۔ اور شاعروں میں مقیمی۔ نصرتی۔ ہاشمی وغیرہ نے نظم میں گولکنڈہ کے شعرا سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ شاہ برہان الدین اور شاہ امین کے اکثر خلفاء اور مریدین نے انھیں بزرگوں کے اتباع میں مذہبی موضوعات پر تصنیف اور ترجمہ کا سلسلہ جاری رکھا اور لکھنے والوں میں مشہور یہ ہیں :

۱۔ مولانا عبداللہ ۲۔ میراں جی خدا نما ۳۔ میراں حسینی ۴۔ میراں یعقوب

Hanif Razvi

۵- برہان الدین راز الٰہی ۶- مخدوم شاہ حسینی ۷- حبیب اللہ قادری

۸- ولی اللہ قادری ۹- سید شاہ میر ۱۰- اعظم -

مولانا شاہ عبداللہ ۱۰۳۲ھ

مولانا عبداللہ کے رسالے : احکام الصلوٰۃ : کا حوالہ نثر کی اکثر تاریخوں میں منشورات : [1] : اردو کے اسالیب بیان : ، دکن میں اردو : وغیرہ میں ملتا ہے۔ ان کتب میں مولانا عبداللہ کی اس تصنیف کے اقتباس بھی دیے گیے ہیں۔ لیکن کسی نے ان کے حالات زندگی پر کچھ نہیں لکھا۔

پروفیسر سروری نے اپنی کتاب : اردو مثنوی کا ارتقاء : [2] میں شاہ وجیہ الدین گجراتی[3] کے فرزند میاں شاہ عبداللہ کا ذکر کیا ہے۔ جو ہاشم حسینی العلوی (متوفی ۱۰۵۹ھ) کے مرشد تھے۔ ہاشم حسینی العلوی نے جو خود بھی اردو میں لکھتے تھے۔ انھوں نے نظم میں اپنے کارنامے چھوڑے ہیں۔ ہاشم حسینی شاہ وجیہ الدین گجراتی کے بھتیجے تھے۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ : احکام الصلوٰۃ : کے مصنف مولانا عبداللہ، شاہ وجیہ الدین گجراتی کے فرزند : مولانا شاہ عبداللہ : ہیں۔ اس کی تائید میں مندرجہ ذیل دلایل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ :

۱- مولانا شاہ عبداللہ کا زمانہ وہی ہے جو : شاہ عبداللہ : کا زمانہ ہے۔

۲- کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ نماز سے متعلق مسایل بیان کیے گیے ہیں۔ اور یہ وجیہ الدین اور ان کے سلسلے کے اکثر بزرگوں کے خاص موضوع ہیں۔ اس لیے اغلب ہے کہ وجیہ الدین کے فرزند نے ہی فقہ حنفی پر یہ کتاب لکھی ہو۔

شاہ ہاشم حسینی العلوی گجرات کے اولیاء کبار میں سے تھے۔ ان کی درگاہ بھی بیجاپور میں عوام وخاص کا مرکز اور مرجع تھی۔ مجھے ان کے ملفوظ : مقصود المراد : کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان ملفوظات کو ان کے مرید شاہ مراد ابن سید جلال نے جمع کیا تھا۔

---

[1] تاریخ نثر اردو موسومہ بہ منشورات از احسن مارہروی

[2] اردو مثنوی کا ارتقاء صفحہ ۲۰

[3] وجیہ الدین گجراتی کی اردو تصانیف کا حال پیچھے گزر چکا ہے۔

جو قلمی صورت میں تھے۔ موجودہ سجادہ صاحب نے اس کو طبع کروادیا ہے۔ اس میں "بہت سے عمل" اور اشعار وغیرہ اُردو میں بھی ہیں۔

مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف "اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کے کام" میں شاہ عبداللہ کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے۔ لکھتے ہیں[1] :

"شاہ ہاشم ایک دن شاہ عبداللہ کی خدمت میں بغرض بیعت حاضر ہوئے مولانا عبداللہ نے بیٹھنے کے لیے ارشاد کیا۔ شاہ ہاشم نے جواب دیا۔ "میں تو خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں" ۔ مولانا عبداللہ نے فرمایا "میں تم سے کیسے خدمت لے سکتا ہوں تم میرے بھائی ہو۔ شاہ ہاشم نہ مانے اور کہا میں آپ کی خدمت کے ارادے سے حاضر ہوا ہوں اس پر مولانا عبداللہ نے فرمایا مجھ میں جو کچھ ہے وہ میں نے تجھے بخشا اور پانچ عمل سکھائے"

اس واقعہ اور ان اشغال کو شاہ ہاشم نے منظوم کیا ہے۔ نظم کا کچھ حصہ یہ ہے :

ہنس ہنس سپنے کہیا نا نہان
دیوے تج سب جسے منج مانہان
میں بی نم نم سر کو لیتا
کیوں نہ لیو جو دیوے ییتا
پانچ شغل لکھ اکھیں سائیں
جیون رے کہوں ہوں چلن تو انھیں
شغل تکفینا کہیا پیو
ننھا بڑا ایک جانے جیو

---

[1] "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۴۱

اور

تھی دوشنبہ کیری رات

شاہ عبداللہ اکھی بات

کیونکہ اس خاندان کے دوسرے بزرگ۔ ہاشم حسینی العلوی وغیرہ اور خود ان کے والد شاہ وجیہہ الدین دادا قاضی نصر اللہ اور چچا قاضی برہان الدین (جو ہاشم حسینی العلوی کے والد تھے۔) بلند پایہ فقیہہ اور علم دین کے عالم گزرے ہیں، اس لیے مولانا عبداللہ کا اس موضوع پر اردو میں تصنیف یادگار چھوڑ جانا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

حالات زندگی

تذکرہ اولیائے دکن میں شاہ عبداللہ کے حالات زندگی درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وجیہہ الدین العلوی کے بیٹے اور خلیفہ تھے۔ علم حدیث و فقہ میں بے مثل، تصوف و عرفان میں بے بدل تھے[۱] ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں بیجاپور آئے اور مدت تک خلایق کو ارشاد و ہدایت سے مستفید فرماتے رہے سنہ ۱۰۳۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا مزار حیدر آباد میں فتح دروازہ کے باہر بتایا جاتا ہے، جہاں سید شاہ راجو ثانی بھی مدفون ہیں۔

تصانیف

ان کی تصنیف: احکام الصلوٰۃ: کے بارے میں ڈاکٹر زور اور مولوی نصیر الدین ہاشمی دونوں کی متفقہ رائے ہے کہ یہ فارسی کا ترجمہ ہے مجھ کو اس کا اصلی نسخہ کہیں نہ مل سکا۔ ہاشمی صاحب رسالے کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ ایک رسالہ ہے جو چھوٹی تقطیع پر خط نسخ میں لکھا ہوا ہے"[۲]

ہاشمی صاحب نے اس کا پتہ نہیں بتایا کہ اس کا نسخہ کہاں سے دستیاب ہوا۔ البتہ انھوں نے ایک طویل اقتباس دیا ہے جس سے عیاں ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو دیکھا اور اس کا مطالعہ کیا ہے۔

۱: تذکرہ اولیائے دکن: صفحہ ۵۸

۲: دکن میں اردو: طبع چہارم صفحہ ۱۱۷

ذیل میں ہاشمی کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

: اول کلمہ طیب پہلا کلمہ بولتا ہوں پاکی کا، کائیکی پاکی ایمان کی کفرتی۔ شرکتی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نہیں کوئی معبود برحق اِلَّا اللّٰہ۔ مگر اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے۔ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ محمد رسول خدا کے برحق ہیں۔ دوم کلمہ شہادت دوسرا کلمہ بولتا ہوں میں شہادت کا یعنی گواہی دیتا ہوں اس خدائے تعالیٰ کی ایک پنی یہ اشہد اور گواہی دیتا ہوں میں ان لا الٰہ کہ نہیں کوئی معبود برحق :

: بات کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں آدمیان کی مثال دعا منگنے نماز جاتا ہے۔ ہی واہ کینے سوں نماز جاتا ہے۔ دردسوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ رونے سوں یا دنیا کی سبب سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں کسی کی موت کی خبر سن کر قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن بولتی سوں نماز جاتا ہے خبر سن کر نماز جاتا ہے نماز میں سُبْحَانَ اللّٰہِ بولتی سوں نماز جاتا ہے :. نماز میں قہقہہ ہنسے سوں نماز جاتا ہے۔

روح قبض ہوا سی وقت اسکیان انکھیاں موچنا ہور پاوں دراز کرنا ہور ہات دراز کرنا ہور دونوں پہلو کی طرف ولیکن سینہ پر نا رکھنا ہور اسی کی تھوڑی ہور سر کوں ملا کر بندنا اسے تبر نخدان بولتے ہیں یو سب سنت ہے۔ :.

ڈاکٹر زور نے بھی : اسالیب بیان : میں اس کا ایک مختصر اقتباس دیا ہے۔ تقریباً اسی زمانے کے لگ بھگ شاہ ملک نے ایک رسالہ مسایل دین کے متعلق نظم دکھنی میں لکھا تھا۔ اس میں بھی نماز کے فرایض و احکام بیان کیے گیے ہیں اس کا مخطوطہ کتب خانہ انڈیا آفس میں ہے اور مخطوطات کی فہرست کے مرتب بلوم ہارٹ نے اس کا نام : شریعت نامہ : بتایا ہے۔ لیکن مصنف : اُردوئے قدیم : حکیم شمس اللہ قادری کی تحقیق کی رو سے اس کا نام : احکام الصلواۃ : ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبداللہ اور شاہ ملک دونوں

کے ترجموں کا ماخذ کوئی فارسی کتاب تھی۔

میران جی خدا نما ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۷۴ھ

ان کا نام حکیم شمس اللہ قادری[1] اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق[2] نے سید میران حسینی بتایا ہے۔ ڈاکٹر زور[3] اور مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی[4] ان کا نام "میران جی خدا نما" بتاتے ہیں یہ دوسرا نام زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "رسالہ اردو" میں ایک مضمون جو "قدیم اردو کا سلسلہ" کے عنوان سے شایع کیا ہے۔ اس میں میران جی حسن خدا نما ہی لکھا ہے۔ غالباً اسی بنا پر حامد حسن قادری نے اپنے خیال میں دونوں ناموں میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ "تاریخ داستان اردو" میں لکھتے ہیں۔ :

"شاہ میران جی خدا نما سید میران حسینی بھی کہلاتے ہیں" [5]

حالانکہ میران حسینی اسی دور کے ایک دوسرے بزرگ ہیں۔ جن کا پورا نام "عبدالقادر شاہ میران حسینی" تھا۔ یہ بھی شاہ امین کے اور شاہ محمود شبریں دہن کے فیض صحبت سے تربیت یافتہ تھے۔

حالات زندگی[6]

میران جی خدا نما صحیح النسب سید تھے۔ اور سلطان عبداللہ شاہ کے دربار سے متوسل تھے۔ سلطان نے ان کو سکندر عادل شاہ کی خدمت میں مملکت کے بعض امور طے کرنے بیجاپور بھیجا تھا۔ بیجاپور میں اس زمانے میں شاہ امین الدین اعلیٰ کی بڑی شہرت تھی۔ میران جی اپنے مفوضہ کام سے فارغ ہو کر جب واپس ہونے لگے تو انہیں اطلاع ملی کہ شاہ امین الدین اعلیٰ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے ہیں۔ ان کے دل میں بھی ملاقات کا

---

1. "اردو قدیم" صفحہ ۱۱۷
2. "اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۲
3. "اردو شہ پارے" صفحہ ۹۹
4. "دکن میں اردو" صفحہ ۱۲۰
5. "داستان تاریخ اردو" صفحہ ۳۸
6. "تذکرہ اردو مخطوطات" جلد اول صفحہ ۶۲ "رسالہ اردو" اپریل ۱۹۲۸ء

شوق پیدا ہوا۔ وہ وہاں پہونچے اور زیارت سے مشرف ہوئے۔ شاہ امین کا بھی اپنے دادا شمس العشاق میراں جی کی طرح یہ قاعدہ تھا کہ غلبہ حال سے فارغ ہو جانے کے بعد حجرے سے باہر آکر ہدایت فرماتے تھے اور سر نگوں ہو کر زمین کریدا کرتے تھے۔ جب آنکھیں کھولتے تو تمام حاضرین سر جھکا لیتے۔ اس روز ان کی نظر ایک پتھر پر پڑی حاضرین سے پوچھا یہ پتھر کیا کہتا ہے۔ تمام لوگ خاموش رہے۔ جس پر میراں جی نے آگے بڑھ کر کہا: یہ پتھر کہتا ہے امین الدین خدا ہو گیا ہے اور خدا امین الدین: یہ سن کر شاہ امین اٹھے اور میراں جی کا ہاتھ پکڑ کر انھیں حجرے میں لے گیے اور چند گھنٹے کی خلوت رہی۔ جب میراں جی باہر آئے تو تمام خلفا اور مریدین کو یہ شبہ ہوا کہ خود حضرت امین الدین باہر آئے ہیں۔ سب کے سب سجدے میں گر گیے۔ جب سر اٹھایا تو دیکھا میراں جی ہیں۔ اس کے بعد شاہ امین باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ: امین الدین میراں جی ہو گیا اور میراں جی امین الدین: انھوں نے میراں جی کو کچھ دنوں اپنے ساتھ رکھا۔ آخر خرقۂ خلافت عنایت فرما کر گولکنڈہ رخصت کیا۔ گولکنڈہ آکر وہ ہدایت و ارشاد میں مشغول ہو گیے۔ اس سلسلے کے دوسرے بزرگوں کی طرح انھوں نے بھی اردو میں تصنیف و تالیف کی۔ ان کی وفات بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۱۱۰ھ میں ہوئی۔: روضتہ الاولیا: کے مصنف کے بیان کے مطابق ان کا مکان اور روضہ بیرون حصار حیدرآباد تھا۔

: تاریخ گلزار آصفیہ: میں مذکور ہے کہ ان کی قبر شہر حیدرآباد کے باہر مستعد پورہ، کاروان عبداللہ پور میں واقع ہے۔ ان کے مزار پر ان کے بیٹے امین الدین ثانی نے گنبد بھی تعمیر کرا دیا تھا جو: کمر کی گنبد کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بزرگ میراں جی خدا نما کے نام سے مشہور تھے عالمگیر کے گولکنڈہ فتح کرنے کے وقت وہ زندہ تھے۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ عالمگیر بادشاہ نے آپ سے فرمایا: کیا جناب خدا نما ہیں:

فرمایا: بابا اگر خدا نما نہ باشم پس خود نما باشم:

ان کی تین تصانیف کا سراغ ملتا ہے۔ جن میں سے دو نثر میں ہیں اور ایک نظم میں۔ نثر کی تصانیف یہ ہیں:۔

۱- شرح تمہید ۲- رسالہ وجودیہ

نظم میں ان کی ایک تصنیف : چکی نامہ : عرفان : سلہ ہے۔

چکی نامہ عرفان یہ ایک ترکیب بند ہے جس میں تین تین اور دو دو مصرعوں کے سولہ بند ہیں۔ ہر بند کے آخر میں ایک ہی شعر بطور ٹیپ کے لکھا گیا ہے۔

مثلاً :

بسم اللہ ذاتی ناون
قرآن اوپر لیا ٹھاون
کُل شیئٍ اس کی چھاون

لَا اِلٰہ کہنا اللہ میں رہنا - نبی رسول سے من لانا اللہ اللہ کہنا

اس نظم کا ایک مخطوطہ کتب خانہ : ادارہ ادبیات اُردو : حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔

شرح تمہید : تمہیدات : نامی ایک کتاب عربی میں عین القضاۃ ہمدانی کی مشہور تصنیف ہے۔ عین القضاۃ کا اصل نام عبداللہ بن محمد تھا۔ وہ میانہ کے رہنے والے تھے۔ اس لیے : میانجی : کہلاتے تھے۔ شیخ احمد غزالی برادر امام محمد غزالی کے وہ شاگرد تھے اور : تمہیدات : انھوں نے تصوف کے موضوع پر لکھی ہے۔ عین القضاۃ ۵۳۳ھ میں قوام الدین ابوالقاسم سلطان سنجر کے وزیر کے حکم سے قتل کر دیے گیے۔ کیونکہ انھوں نے ایک اور کتاب : مکتوبات : لکھی تھی۔ اس میں قرآن کی بعض آیات کے باطنی معنی بیان کیے تھے جنھیں خلاف شرع متصور کیا گیا تھا۔

عین القضاۃ کی اس کتاب کی ایک شرح خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے بھی فارسی میں لکھی تھی۔ دوسری شرح میران جی خدانما نے اُردو میں لکھی ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میران جی نے خواجہ بندہ نواز کی شرح کا ترجمہ کیا ہے۔ یا اصل کتاب کا کیونکہ ڈاکٹر عبدالحق نے اس کے دو نسخے اور دو نام بتائے ہیں۔ ایک شرح تمہید ہمدانی : اور دوسرا : شرح شرح تمہید :

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کے کتب خانہ کی ایک بیاض میں ایک اور نسخہ جو موصوف کے بیان کے مطابق رایل ایشیاٹک سوسایٹی کلکتہ کے نسخے کی کیفیت اور

اس کا اقتباس ہے۔ اس نسخہ کے سرنامہ پر "ترجمہ تمہیدات عین القضاۃ" درج ہے۔ اس کی کتابت ۱۲۲۳ھ میں ہوئی ہے۔ مصنف کا نام درج نہیں، کاتب کا نام شیخ عبدالقادر ولد شیخ عبدالغفور لکھا ہے۔ اس کے جملہ (۱۵۵) اوراق ہیں۔ روضتین کے نسخہ کے (۳۶۵) اوراق ہیں۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"نہ جان ولی جان لینا اپنی ہیں دسرا حال بدلتا ہے۔ خدا کون یوں ہی دایم یک حال ہے۔

قولہ تعالیٰ یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت۔ خدا کہیا اس تن کو فنا کروں گا ہور جیو کو خوبصورت فرشتے کی ایسی دیگر رکھوں گا۔"

چند ابواب کی تفصیل یہ ہے: پہلا باب بصیرت ہور بصارت۔ دوسرا باب پیر ہور مرید کا مقصود۔ باب تیسرا جان چوتھا باب اپنی پیچھانت ہور خدا کی پچھانت کا۔

مجھے روضتین میں "تمہیدات" کے نام سے اس کتاب کا ایک مخطوطہ دستیاب ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق [1] اور ڈاکٹر زور [2] لکھتے ہیں کہ میران جی کی شرح اصل فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کا تھوڑا سا اقتباس بھی دیا ہے جو یہ ہے:

"اے عزیزاں اے بات نیں سنیاں بادشاہاں گھوڑے منتخب کیے باج نیں سوار ہوتے ہور کھڑے میں پچ گھوڑا اچھے تو بھی نیں قبول کرتے یعنی پیر کے عشق میں سچا ہوئے۔ باج خدا کے عشق میں بن نا آسک سی ہور دیکھ نا سکی اگر عشق خالق نہ داری بارے عشق مخلوق جیا کن۔ اس کا معنا خدا کی پیچھانت کر۔ سوائے بات یوں ہے کہ آفتاب کا ذات تو از نہارا ہے ہور اس کا اجالا جالنہارا ہے۔ یعنی دوست سو تو از نہارا ہور خوبیاں دینا ہارا ولے اس کا محبت اسے دگدا تا ہے یعنی معشوق کا محبت عاشق کو

---

[1] رسالہ اردو: نہم شمارہ

[2] اردو شہ پارے: صفحہ ۹۹

گالنا ہے اس کے فراق ہیں :

کتب خانہ روضتین کے نسخہ کا اقتباس یہ ہے :

: اس کی خدائی تی دونوں عالم پیدا کرنے میں عقل گیان گیان انکھیاں حیران ہیں۔ خدا دایم قایم ہے۔ اب کی بزرگی کا مہر سب پہ ہے۔ ہور خدا ایکیلا ہے۔ پیدا کرتا ہے ہور مارتا ہے۔ سب کونا اپنے ہاتھوں کرتا ہے دوسرے کچوں فرماتا ہے۔ ہور کہتے ہیں۔ دونوں عالم ہو کر اپی ایک اشارات میں دوجی بار کا حاجت نہیں رکھیا خدائے تعالیٰ ایسا پاک ہے۔ او کے سا نہیں ایسے خدا کوں صورت نہیں خدا کوں ایک جا طا تین خدا پیدا کرنہارا ہے :

: تمہیدات : دس ابواب پر منقسم ہے :

رسالہ وجودیہ[1]

اس نام کے بھی رسالے ملتے ہیں۔ ایک سید امین نے بارھویں صدی ختم کے قریب لکھا تھا۔ دوسرا رسالہ نور دریا قادری نے لکھا تھا جو شاہ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ تھے۔ ادارہ ادبیات اُردو میں ان دو کے علاوہ ایک اور رسالہ وجودیہ بھی محفوظ ہے جس کو ڈاکٹر زورؔ میران جی کی تصنیف خیال کرتے ہیں۔ میری رائے میں بھی میرآن جی ہی کی تصنیف ہونی چاہیئے۔ ان کے پیر شاہ امین الدین اعلیٰ نے بھی ایک مختصر سی مثنوی اس موضوع پر لکھی۔ ممکن ہے اسے ہی میرآن جی نے نثر میں لکھا ہو۔ یہ مخطوط (۲۱) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

: بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم   ایں رسالہ وجودیہ

اللہ محمد کے راز رمز کے باتاں کسی نامحرم کے انگے نا بولنا بولینگے سو کافر ہووینگے وتینگے سو دیوانے ہووینگے۔ اون کون دیوانے بھی نہ کرنا پے

---

[1] اسکا مخطوط ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔ فہرست اُردو مخطوطات جلد اول ۲۵۰

کانی بھی نہ ہونا۔ زبان سون ذکر کرنا اللہ اللہ جون زبان میں کہتے ہیں تو دام
اوتے جاوتے اللہ اللہ کہتا سارا دن ساری رات کیا کام کرتے ہیں۔ سو اللہ
کی یاد سون کرتا یوں سنبال کر برتے تو ذکر جلی اللہ کی یاد سون کیا تین کا فائدہ
کیا۔ اور اللہ کی یاد سون نہ کیا ضایان کیا۔ جون شروع بیچ میں کیا سو حرام
ہے۔ اور درست رکھے سو حلال ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔
اللہ کی یاد سون فعل کیا تو حلال ہے۔ اور اللہ کی یاد سون نہ کیا حرام جیا۔
وہ حرام تنے اے حرام ہے۔ ابلیس کی طرف تھے یاد کی طرف ثابت کیا سو
مشاہدہ ہے۔ یعنی اللہ ہمارے نزدیک ہے تن کے۔ فعل کرتے ہیں سو دیکھتا
ہے۔ بولتے ہیں تو سنتا ہے۔ برا خطرات نہ لاونا بری بات، نہ بولنا۔
برے فعل نہ کرنا یو اللہ حاضر ناظر ہے۔ اپنے تن واجب الوجود۔ اس کا
مقام شیطان تے راہ شریعت ذکر جلی .....

اختتام کی عبارت حسب ذیل ہے :

: شغل پانچواں حروف ت کو نعمت میں رکھا ہے۔ دعوت اس کا
شغل فی کھر تعمتک یا اللہ یعنی بار خدایا تمام نعمت تیری یار کر منجے شغل
چھٹا حرف ب کون بسم اللہ میں رکھا ہے۔ دعوات اس کا بدر نافی بخنک
یا اللہ یا بار خدایا برکت دے منجے اپنی برکتوں سین اون برکتاں سین برکت
پاوں۔

شغل ساتواں حرف : ا : کو ذات اللہ کی میں رکھا ہے۔ دعوت اس کا
احد نافی احدک یا اللہ یعنی یا بار خدایا احد کرمت کون تاکہ تیری احد ذات
میں احد ہوں۔

واحد الوجود کا سگن نرگن مرنا سو گن اور مرکے جیونا سو نرگن چہار روح نامیہ
روح متحرک روح ناطقہ روح قدسی چہار دل واجب الوجود ممکن ممتنع عارف

قلب مضغہ قلب منعم قلب سلیم قلب شہید انفس دل روح نور ایک سب
یعنی شاہد فعلون خارج دیکھو۔

شاہ میران حسینی ولی

گیارھویں صدی کے اواخر کے بزرگوں میں سے تھے ان کا اصلی نام عبدالقادر ہے یہ بھی حضرت امین الدین اعلیٰ کے مرید اور تربیت یافتہ تھے۔ ان کے حالات بھی میران جی خدانما سے ملتے جلتے ہیں لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ امین الدین اعلیٰ کے ایک اور شاگرد میران نام کے تھے وہ بھی اتفاق سے حیدرآباد ہی کے رہنے والے اور سپاہی پیشہ تھے۔ امین الدین اعلیٰ کی شہرت سن کر وہ بیجاپور گیے اور ان سے بیعت کرنے کے بعد ملازمت ترک کر دی۔ بارہ برس کامل پیر کی خدمت میں لگے رہے۔ بعد تکمیل علوم باطنی خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اور حیدرآباد لوٹے انھوں نے شاہ امین کے خلیفہ شاہ محمود شیرین دہن سے بھی فیض باطنی حاصل کیا۔ ان کا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا اور شاہ علی بنڈہ کے قریب مدفون ہوئے۔ ان کی تصنیف ایک مذہبی رسالہ ہے جو "خلاصۃ الرویا" کے نام سے موسوم ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں خلاصۃ الرویہ کا ایک مخطوطہ موجود ہے اس کے سرنامے پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"یہ رسالہ شاہ عبدالقادر عرف شاہ میران کا لکھا ہوا ہے"

شاہ میران حسینی کی تحریر میں ادبیت جھلکتی ہے۔ وہ تصوف کے خشک سے خشک موضوع کو بھی جاندار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ تصوف کی دقیق اصطلاحوں جیسے "لاہوت" "ماہوت" وغیرہ کی تشریح وہ دلچسپ حکایتوں کے ذریعے کرتے ہیں۔

ایک حکایت کے ذریعے انسانی وجود کی توضیح کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اپنے اصل کی نقل ہے اس کی تشریح شیخ چلی کی حکایت سے کی گئی ہے جو اپنے آپ کو بھول گئے تھے۔

رسالے کی وجہ تصنیف یہ بتاتے ہیں:۔

"بیان ذات ہور صفات کا ہور مراقبہ اور مثال کے چند کلمہ ظاہر کیا جاتا ہے اگر کوئی طالب خدا کا سالک راہ کا اس بیان کے تئیں خوب تامل اور تفکر

سے دیکھے پانے توانشا اللہ تعالیٰ پچھانت ذات اور صفات کا حاصل ہوکر
دونوں عالم میں دیدار خدا عیاں ہوا ؞
اس کے بعد درود ہے اور درود کے بعد اس طرح عبارت شروع ہوتی ہے ؞۔
؞ ہر ایک شخص کون کسی چیز کے پانے کی تلاش ہوتی ہے تو لازم ہے کہ اول اس
چیز کے صفت اور ذات کی خبر معلوم کری بعد از اس چیز کی تلاش نیں تو اس
چیز کے پانے میں دہوکہ کھاوے گا اور دغا پاوے گا اگر کوئی شخص ہیرے کو پانے
کا طلب کرے تو اول ہیرے کا صفت اور خاصیت معلوم کرے بعد ازاں
ہیرے کو ڈھونڈھنے کی تلاش میں ہوئی ؞
پھر خدا کی صفات کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے ؞
؞ ہور صفات سوحی[۱] قدیر[۲] بصیر[۳] علیم[۴] سمیع[۵] حکیم[۶] برید[۷]
یہ سات صفتاں ذاتی ہیں صفت ذات سوں جدا نیں ہوتی ہے جیسا کہ دھوپ
آفتاب سوں جدا نیں ہے چراغ سوں جوت جدا نیں ہوسکتے اسے سات صفتاں
سوں سات عالم پیدا کیا جیسا کہ سات طبق آسمان سات طبق زمین سات
دریا سات پہاڑاں سات بہشت سات دوزخ سات روزاں سات آدمی
کے آزا یہے سات ہیں یعنی آنکھ ۔ ناک ۔ موں ۔ کان ۔ ہاتاں ۔ سینہ ۔ پیٹھ ۔
پاؤں یہ تعلق پیٹ کا ہے کن فیکون اس کے بھی حرف سات ہیں ؞
تصوف کے منازل کی بھی تفصیل لکھی ہے مثلاً بتایا ہے کہ مراقبہ کیا ہے ۔ جبروت لاہوت
سے کیا مراد ہے ۔ وہ تصوف کے مشکل سے مشکل مسئلے کو دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں ۔
رسالے کے آخر میں ان کے کسی مرید صدرالدین نے ایک قطعہ لکھا ہے جس میں وہ اعتراف
کرتے ہیں کہ انہیں روح کے حقایق کا علم شاہ میراں کی بدولت ہوا ہے ۔ قطعہ یہ ہے

جو ہے شاہ میراں ولی جس کا نام ۔۔۔ کہی مجکوں سب بھید اس کا تمام
چتا کچھ جو طالب کوں درکار ہے ۔۔۔ وہ سب نظر کے بیچ اظہار ہے

صدر الدین اب نظم کون کر تمام   درود بر محمد علیہ السلام

میران یعقوب ۱۱۰۰ھ

ان کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے لیکن ان کا نام اپنی بے مثل تصنیف "شمائل الاتقیا" کے سبب یادگار رہے گا۔ ادارہ ادبیات اُردو میں اس کتاب کا جو مخطوطہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف میران یعقوب۔ میران حسینی خدانما کے مرید تھے۔ اس میں میران یعقوب نے خدانما کے فرزند شاہ امین الدین ثانی اور نواسے شاہ میران ثانی کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اپنے مرشد کا سنہ وفات انھوں نے ۱۰۷۷ھ بتایا ہے لیکن عام طور پر میران جی خدانما کا سنہ وفات ۱۰۸۰ھ بتایا جاتا ہے۔ اصل کتاب فارسی میں برہان الدین غریب کے مرید شیخ رکن الدین نے شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کے نام سے لکھی تھی۔ اس میں مصنف نے فارسی عربی کی تقریباً سو کتابوں سے تصوف کے متعلق بہت سے مقولے اور روایات جمع کر دیئے تھے۔ اس کی فہرست میران یعقوب نے اپنے اُردو ترجمے میں بھی دی ہے۔ شیخ رکن الدین کی ایک اور کتاب: نفائس الانفاس: بھی مشہور ہے جس میں اپنے مرشد برہان الدین کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔

میران یعقوب نے شمائل الاتقیا کا جو ترجمہ کیا ہے وہ چار حصوں پر منقسم ہے پہلے حصے میں (۵۰) موضوع شامل ہیں۔ دوسرے میں (۳۰) تیسرے اور چوتھے میں گیارہ گیارہ یعنی اس طرح کل (۹۱) مسایل پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

کتاب کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ میران یعقوب نے اس کتاب کا ترجمہ اپنے مرشد زادے شاہ امین الدین ثانی کی فرمایش پر کیا تھا یہ کتاب مرشد کی زندگی میں ختم نہ ہو سکی کیونکہ ان کا انتقال ۱۰۷۷ھ میں ہو گیا ان کے بعد ان کے بھانجے یعنی خدانما کے نواسے شاہ میران ثانی ابن سید حسین خلیفہ ہوئے تو میران یعقوب نے یہ کتاب ختم کر کے ان کی خدمت میں پیش کی۔

شاہ میران ثانی کے بعد میران یعقوب نے ایک اور بزرگ بابا ابراہیم خلیل کا ذکر کیا ہے پھر کتاب کی وجہ تالیف بیان کی اور یہ بھی لکھا ہے کہ اصل کتاب کس کی ہے۔ اس کی زبان

Hanif Raza

سلیس ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں اُردو کے اسلوب میں کافی تغیر ہوگیا تھا بہت سے قدیم الفاظ ترک کردیے گیے تھے اور ان کی جگہ نیے نیے لفظ زبان میں داخل ہو رہے تھے۔ اسالیب میں جملوں کی سادہ ساخت اور اظہار خیال کے راست انداز سے بہت فرق پیدا ہوگیا تھا۔ بہ حیثیت مجموعی میراں یعقوب کی زبان جدید اُردو نثر کی زبان سے بہت قریب ہے۔

ابھی تک میراں یعقوب کی ایک ہی تصنیف "شمایل الاتقیا" کا حال معلوم ہوسکا ہے اس کے دو مخطوطوں کا پتہ چلا ہے جن میں سے ایک کتب خانہ آصفیہ اور دوسرا ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔ آصفیہ والا مخطوطہ [1] (۱۱۶۵) صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ ابتداء میں (۱۶) صفحات کا ایک دیباچہ ہے جس میں اصل کتاب "شمایل الاتقیا" کے مضامین کی فہرست دی گئی ہے۔ کتاب کے نام اور موضوع کی وضاحت مصنف نے اس طرح کی ہے :-

"اس کتاب کا ناوں "شمایل الاتقیاء" کر رکھیا گیا ہے ہور اس میں طریقت حقیقت کے علم ہور مقاماں کے چہار قسم ہور تو ہر ایک بیان کیا گیا ہے۔

پہلا قسم — طریقت کے لوگاں کے افعال کے بیان میں ہے دو لکھے پچاس بیان سوں۔

دوسرا قسم — حقیقت کے لوگاں کے احوال کے بیان میں دو لکھے تین بیاسو ان

تیسرا قسم — خدائے تعالیٰ کے وجود ہور ذات کے صفات کے بیان میں ہور ازل ہور ابد کے بیان میں ہور حضرت محمدؐ کے تک یک ذات کے صفت ہور نسبت میں ہے چہار بیان سوں۔

چوتھا قسم — نہایت کے اچنبھے ہور نازکیاں کے بیان میں ہور وزاو زا کی حقیقت ان کے رموزات ہور باریکیاں کے بیان میں ہور مہتر آدم کی پیدائش کی صفت میں ہور آدمیاں کی برائیاں ہور انسانی کیان خصلتاں ہور انو کی امیدواریاں ہور انو کے حق میں خدا

Hanif Razvi

کیاں عنایتاں کے بیان میں ہے کیں بیان سون ؛

؛ شمایل الاتقیا: مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے :

(۱) تقسیم طریقت کے لوگاں کے خوب افعال ہور سالکان کے مقاماں ہور مریدوں ہور طالبان ہور اس کے عجائبات۔

(۲) توبہ فضلماں ہور انبیا ہور اولیاں کے خصلتاں۔

(۳) بیان ذمیمہ ہور حمیدہ کا یعنی بری صفتاں ہور خوب صفتاں کا۔

(۴) بیان ہدایت ہور ارشاد ہور دعوت کے مرتبیاں کا۔

(۵) حقیقی ہور مجازی خلافت کا۔

(۶) خدا کے ولایت لاتے کا ہور صاحب ولایت مشائخ کے خصلتاں کا۔

(۷) بیان پیغمبروں کے معجزوں کا ہور ولیاں کے کرامت کا۔

(۸) بیان ارادت ہور بیعت کے معنی کا ہور مرداں ہور عورتاں میراں کے مریدیوں کے روش کا۔

(۹) بیان مرید ہور مراد کے معنی ہور فضیلتاں کا۔

(۱۰) بیان خرقہ کے فضل کا ہور خرقہ پوشاں ہور ٹوپیے والیاں کا۔

(۱۱) بیان کترنے کے فضلاں کا ہور سب سر منداں ہارسی ہور تھوری کچھ بال کتراں ہارسی آن کا۔

(۱۲) بیان مریداں کی ادب کا خدا ہو پیر سون۔

(۱۳) بیان زہد و ورع کے فضیلت کا ہور زاہدوں کا۔

(۱۴) بیان تصوف کے فضلاں کا ہور صوفیا کے خصلتاں کا۔

(۱۵) عام ہور خاص الخاص کے خوب ہور ....

(۱۶) بیان شریعت طریقت کے

(۱۷) بیان شریعت طریقت حقیقت کے لوگاں کے نمازاں کا۔

(۱۸) قرآن کے تلاوت ہور تلاوت کرن ہارے کے فضلان کا۔

(۱۹) عبودیت ہور نجیبت کے جنس میں سجدیانکا۔

(۲۰) بیان عاشقاں ہور محیان عارفان ہور مقربان کے قبیلہ کا ہور کعبہ ہور حج کا۔

(۲۱) طریقت کے حقیقت کے لوگاں کے روزیان کے فضل کا۔

(۲۲) یا دلیوان بیان طریقت حقیقت زکوٰۃ کا ہور فضل کا۔

(۲۳) بیان شریعت طریقت کے بھانت کے علم ہور پرہیزگاری عان کے خصلتان کا۔ ہور نا پرہیزگاری عان کا جنبیت کا۔

(۲۴) بیان شریعت معرفت کے فرق ہور اس کے مرتبے ہور درجان رمزان کا۔

(۲۵) بیان عالم ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت کے مقام ان کا ہور رموزان کا۔

(۲۶) خدا کے محبت و معرفت و قرب و وصلیت کے طالبانکا سلوک کا۔

(۲۷) بیان ظاہر ہور باطن کے سفران کا ہور اس کے لطفِ عجائبیانکا۔ ترجمہ قشری

(۲۸) بیان خلوت کی فضلان کا ہور گوشہ نشیاں کے خصلتاں کا اس شرطانکا۔

(۲۹) صحبت کے فایدے ہور رسوائی کا ہور اس کے شرطان کا۔

(۳۰) بیان تجرید اور تفرید کے فضلان کا ہور دنیا کے خوبے ہور برائی ہور دنیا چھوڑنے کی فضلان کا۔

(۳۱) سلوک ہور جن کے فضلاں ہور خوبیان کا۔ بھوت بونے کی ضرر ہور برائی کا۔

(۳۲) بیان ذکر لسانی اور طلبی کے فضلان کا ہور ذکر سری ہور روحی کے ذاکران کے خصلتان کے ہور ذکر کے شرطان کا۔

(۳۳) بیان وزا وزا کی نیندان کا ہور اس کے خوبی عیان کا۔

(۳۴) بیان خطرے اور ہوا جس کا ہور اسے رفع نفی کرنکا۔

Hanif Razvi

(۳۵) بیان محو ہور سکو کا ذوق ہور شراب کا ہور اس ہر یک کے۔

(۳۶) قبض ہور بسط کا

(۳۷) (سات اگلی تیسواں) بیان عبادت ہور عبودیت ہور عبودیت ہور اصلیت

(۳۸) طاعت ہور اطاعت کا مطیعات خصلتاں کا۔

(۳۹) صدق ہور اخلاص کے خوبیاں کا ہور اس کے حقیقت بوجھنے کا ہور کذب ہور نفاق کے ہوایاں کا۔

(۴۰) بیان خوب خصلتاں ہور برائی کا۔

(۴۱) بیان جود ہور سخا کا کرم ہور عطا کا ہور ایثار اتفاق کے۔

(۴۲) بیان علم الیقین ہور عین الیقین کے باریکیاں کا۔

کتاب کی وجہ تالیف یہ بتاتی ہے:-

:- یو کتاب پہلیں فارسی تھا کن عماد پیر معنوی حضرت سلطان العارفین خواجہ برہان الدین غریب کے مرید تھے۔ انو بھوت مدت تک بزرگان کے بھوت کتاباں ہور رسالے مطالعہ کیے تھے۔ اس کتاباں تھے ہر ایک بیان علاحدہ کر کر یو کتاب فارسی لکھے ہیں۔ ہور اس کا نادر شمایل الاتقیا کر رکھے ہیں۔ یعنی پرہیزگاران کے خصلتاں ہور اس تمام کتاباں ہیں جو کچھ ولیاں کا قول و احوال ہور خصلتاں ہور خارج کشف اپنے پیر کی زبان مبارک تے سنے ہیں ہور تلقین پائے سو جی تمام کتاب میں لیائے ہیں:-

ذیل میں اس کتاب سے تجرید و تفرید کی بحث نقل کی جاتی ہے:-

:- تیسواں بیان تجرید و تفرید کے فضلاں کا ہور دنیا کے خوبی ہور برائی ہور چھوڑنے فضلاں کے تجرید ہور قول محقق تجرید ایس تیں ہے ہور تفرید خدا باج سب چیز نیں ہے۔ خلق تے مجرد ہونا سو یو ہے جو نفع ہور ضرر سکہ ہور دکھ اینو نے نہ جانے ہور آپس تے ہور خدایا۔ سب چیزاں میں منفرد ہونا سو م دان

Hanif Razvi

کی نشانی ہے۔

بیت : اس دوست کی درگاہ میں اول توں اپین کھو کہ جا
دو جگ کے الایش سیتے دا اپنا تو دھوکہ جا

تجرید سو عاشقاں کی بازار کا روز تفرید سو عارفاں ۔ وصاد فاں کا اسرار کا روز ہے۔ تجرید روحی جو بی چیز کن کے تلہار آیا ہو تس نے کناری ہووی تفرید او وہ ہے جو دو عالم تے (سے) ہور با خدا سب تے بیزاری لیوے تجرید ظاہر کے جلائی ہے خلق ہور ملک میں تفرید باطن کے جدائی ہے ملک ہور ملکوت تے (سے) رسالہ رموز الوہین تجرید تلوین کے مقام میں ہے ہور تفرید تمکین کے مقام میں ہے۔ تجرید غیر تے جدائی ہور تفرید خدا باج سب تے جدائی ہے کیفیت دنیاں کا یو ہے فواید الفواد دنیا نکوں چہار صفت ہیں ایک ظاہر میں دیتا ہے ہور باطن میں نہیں سو جمع کرنا ہے اپنے حلال عورتاں سوں اوتو کا حق ادا کرنے کی نیت سوں پرا ظاہر میں دنیا نیں ہور باطن میں دنیا ہے۔ سو طاعت بن کے ہے جو خلق کوں دکھلانے بدل کرتے ہیں۔ تیسرا ظاہر ہور باطن میں دنیا ہے سو یو ہے۔ جو کسی کوں دنیا کے چیزاں ہور اسباب حاجت تے (سے) اکلا (لیکھا) اچھین (رکھین) جو تھا نہ ظاہر میں دنیا ہے نہ باطن میں سو طاعت ہے۔ جو اخلاص سو خدا چہ کے خاطر کرتے ہیں۔ رموز الوہین قدسی حدیثاں میں ہے۔ یا دنیا اخدمی من خدمنی واستخدمی من خدمک یعنی خدا کہا ہے دنیا کوں اے دنیا جس نے میری خدمت کرتا ہے۔ اُسکی توں خدمت کر جیسے تیری خدمت کرتا ہے توں اسے اپنی خدمت فرما۔ دنیا تیری چھاؤں کے مثال ہے اگر توں اپنی چھانواں سے پیٹھ کرے گا۔ تو او تیری طرف موں کریں گے ہور تیری پچھیں پچھیں آوے گی اگر توں اس طرف موں کرے گا تو او تیری طرف پیٹھ کرے گی۔

Hanif Razi

شاہ برہان الدین قادری رازِ الٰہی وفات ۱۰۸۳ھ

شاہ برہان الدین قادری جو رازِ الٰہی کے لقب سے مشہور تھے۔ مشاہیر مشائخین کرام واکابر اولیائے عظام میں سے تھے فیض ارادت و خلافت شطاریہ حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ شطاری سے حاصل کیا تھا۔ ہمیشہ متوکل اور تارک الدنیا رہے۔ زمانہ شاہزادگی میں عالمگیر اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور واسطے حصول سلطنت کے دعا کرنے درخواست کرتا۔ ایک شب جب شاہزادہ نے دعا مانگی آپ نے آمین کہہ دیا۔ روایت ہے کہ آپ کی دعا کی برکت سے عالمگیر تخت پر بیٹھا۔ آپ کے دو ملفوظ: روایح الانفاس: اور: ثمرات اطباق: فارسی میں ہیں۔ اُردو میں ان کی ایک تصنیف: رسالہ وجودیہ[1]: کا پتہ چلا ہے۔ برہان الدین قادری نے ۱۵ شعبان ۱۰۸۳ھ وفات پائی اور برہان پور کے محلہ سندھی پورہ میں مدفون ہوئے۔

رسالہ وجودیہ

اس رسالہ میں تصوف کے مسائل جیسے وحدتِ وجود دیدارِ باری تعالیٰ اور نماز کی اہمیت، روزہ کی برکتیں، حرص و آز کی برائیوں پر لکھا گیا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ رسالے کے آخر میں ایک ترقیمہ ہے جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔:

وجودیہ کی زبان بہت سلیس ہے۔ عالمگیر کے عہد تک اُردو زبان کے سانچے کافی منجھ گئے تھے جس کا کچھ اندازہ ولی اور اس کے معاصرین جیسے شاہ سراج اورنگ آبادی، لچھمی نارائن شفیق وغیرہ کے کلام سے ہو سکتا ہے۔:

: خدا کے دیدار کو اینڈ کر خدا کے راز کا ذوق لے کر نمنے ہوتا ہے ہور کیسے مانگ سکتا۔ :

شاہ نور محمد قادری ۱۰۸۵ھ

لاپچور کے: نور دریا: خاندان کے جد اعلیٰ اور شیخ امین الدین اعلا کے خلیفہ تھے۔ ان کی زندگی کے بہت کم حالات کا

---

[1] ، فن تصوف، نمبر ۸۱۷

پتہ چلتا ہے کسی تذکرے میں ان کے حالات نہیں ملتے۔ ان کے رسالوں کا ذکر حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر زور دونوں نے کیا ہے۔ حکیم صاحب: اُردوئے قدیم: میں تحریر کرتے ہیں:

"عالمگیر کے زمانے میں گذرے ہیں آپ نے زبان دکنی میں کئی رسالے لکھے ہیں منجملہ ان کے ایک مجموعہ میں ہم نے آپ کے دو رسالے دیکھے جن میں مسایل وحدت وجود اور قضا و قدر پر بحث ہے"۔ ؎۱

ڈاکٹر زور نے: اُردو اسالیب بیان: میں اس کا تھوڑا سا اقتباس دیا ہے۔ مجھے مندرجہ ذیل تین رسالوں کا پتہ چل سکا ہے:۔

۱۔ رسالہ نور دریا ؎۲ (وجودیہ)

۲۔ رسالہ نو بطون ؎۳

ان دو کے علاوہ ایک کتاب: صراۃ المستقیم: ؎۴ نامی بھی ہے۔ احادیث جمع کیے گیے ہیں۔

رسالہ نور دریا

اس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ یہ کُل (۳۷) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تصوّف کے اسرار و غوامض بیان کیے گیے ہیں۔ مصنف اپنے استاد اور مرشد شاہ امین الدین اعلیٰ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ رسالے میں تکوین کائنات پیدائش نور محمدؐ اور اس سے متعلق مسایل لکھے گیے ہیں۔ احدیت اور واحدیت کی تفسیر بھی کی گئی ہے۔ اس حصے کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"یو تینوں مل ذات کی مرتبے ہیں دھانسوں چاہا کہ اپس کی مراتب کا ظہور کروں کہ خود دیکھا دیکھتے میں یو پیدا ہوا کیا واسطے جہاں دیک ہے وہاں بوجھ۔ بغیر بوجھ کی دیک کو وجود نہیں سا اس دیک کوں احدیت

؎۱ اُردوئے قدیم طبع دوم ص ۱۱۹ ۔ ؎۲ مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ فن تصوف نمبر ۶۱۴

؎۳ مخطوطہ کتب خانہ روضتین

؎۴ مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ

Hanif Razvi

میری سوں وعدہ کی اس تن میں اچھکر ہمیں تجھی تحقیق کرتے کہا اگر کوئی اس وعدے کوں پونچی تو مریکا دوست ہوئے گا اگر نین تو میرا دیدار نا دیک سکے گا ؛

رسالے کے آخر میں یہ عبارت درج ہے :

: از تصنیف مخدوم شاہ حسینی کہ یکی از مریدان سلطان المحققین حضرت شاہ بیراللہ حسینی والیشان خلیفہ تاج السالکین کامل العاشقین حضرت شاہ میران جی خدانما است :

یہ رسالہ بھی سوال وجواب کی شکل میں لکھا گیا ہے جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوگا :

: ای سالک سب عالم دو جھگری کی میانی پڑکر ہلاک ہوتے ہیں۔ ان کی مراد یوں ہے کوئی عاقبت کوں دیدار دیکھنا بولتی ہیں کوئی یہاں دیکھنا بولی ہیں عاقبت کوں دیکھنا ہو رندی یہاں دیکھنا کہی سو ملعون یو دو نو معنے عاشقاں کوں صحیح ہیں جہاں دیکھن کو مرشد کی ظاہر صورت اور اپنی ہیں دیکھنا سو عاقبت خدا کہیں ہیں تمھاری کے شہرگ کے نزدیک ہوں کہیا سو پوچھنا بول قرآن ہیں سند اچھکر عمر ضایع کرنا کیا فاعدہ۔

سوال طالب : پوچھا اے مرشد یو سند اللہ کی زبان قرآن نبی کی زبان حدیث اچھکر نین بوجھنے کا کیا سبب۔

جواب مرشد : سُن اے طالب یو آیت یو ہے (عربی)

یو سب یک عالم کوں دو دیکھتے ہیں۔ کوئی میں توں بولتے ہیں کوئی اللہ بندہ بولتے ہیں۔ کوئی ازل ابد بولتے ہیں۔ کوئی نور ذات بولتے ہیں کوئی من عرف فقد عرف بولتے ہیں کوئی تجرید تفرید بولتے ہیں کوئی نفی اثبات بولتے ہیں۔ کوئی فنا بقا بولتے ہیں۔ کوئی کفر اسلام بولتے ہیں کوئی میثاق محشر بولتے ہیں کوئی دنیا دین بولتے ہیں جیکوئی اپنی پچھانت کی ہیں انو کو یو سب حاصل ہے ای سالک اس دو جھگڑی میں ہے تک اسے راحت نین۔ کوئی خدا کوں اپنی

Hanif Razvi

سکتا ہے تو تحقیق کرنا آپس کوں۔

سوال طالب۔ اے مرشد اسکوں تحقیق کرنے کا طریقہ کیوں کر ہے۔

جواب مرشد۔ ای طالب بندہ بالغ ہونے میں فرض اول اپس کوں تحقیق کرنا اللہ کو پچھانیا یو مسلماناکوں ہور مسلماناکیا عورت کوں فرض ہے بوجنا حدیث اطلبوا العلم ولو کان باالسین اس کا معنی تو چین ماچین ملک ہے۔ وہاں تک مرشد تلاش کرنا تو تیرا مراد پاوے گا۔ پیر کامل ملی تو سالک پچھانا جیو پانی پانی کا جیو آگ جیو بارا باری کا جیو خالی خالی کا جیو ذات قدیم باٹی پانی میں حرم پانی آگ میں حرم آگ بارے میں حرم بارا خالی میں حرم خالی اے سالک ان کی ۲۵ کن پانچہ پھل پانچہ رنگ پانچہ لذت پانچہ مقام پانچہ دروازے یو مرشد بلج بوجانیں۔

سوال طالب۔ اے مرشد پانچ فرشتے کیوں پیدا ہوئے۔

جواب مرشد۔ سن اے طالب اول عزازیل ذات تے پیدا ہوا اس کا قدیم نانو رحمٰن التی اسرافیل پیدا ہوا اسرافیل تے عزرائیل پیدا ہوا۔ سالک جبرئیل آواز کوں بولتے ہیں میکائیل مطلب کوں بولتے ہیں عزرائیل نہنار یہوں بولتے ہیں۔ اسرافیل مطلب بوجا نہار یکوں بولتے ہیں عزرائیل دیکھنا دیکوں بولتے۔ اس کا تروار امرشد بغیر نا ہووے۔

عابد شاہ سنہ ۱۰۹۲ھ

عابد شاہ کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملے۔ کتب سے محض اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہ یوسف شاہ راجو ثانی کے مرید تھے۔ جو ابو الحسن تانا شاہ کے مرشد تھے۔ سید شاہ راجو ثانی کا ذکر گزر چکا ہے۔ اکثر اس زمانے کے شاعر اور ادیب شاہ راجو سے عقیدت رکھتے تھے۔ عابد شاہ کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی۔ عابد شاہ دو رسالوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱۔ گلزار السالکین ۲۔ کنز المومنین

گلزار السالکین یہ رسالہ سالکان راہ معرفت کی رہنمائی کے لیے لکھا گیا ہے۔ راہ سلوک و معرفت اس کے منازل اور مقامات روح۔ توحید۔ غرض تصوف کے کئی مسایل سے اس میں بحث کی گئی ہے۔ رسالہ کی ابتداء حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ حمد و نعت کے بعد مصنف اپنے مرشد شاہ راجو کی مدح کرتا ہے۔ شاہ راجو کا انتقال ۱۰۹۲ھ میں ہوا اور مصنف نے یہ مدح خاص انہیں کے لیے لکھی ہے اس لیے قیاس یہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۰۹۲ھ سے قبل لکھی گئی ہوگی۔ مناجات کے آخری شعر میں مصنف نے اس رسالے کے دکھنی زبان میں لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ شعر یہ ہے :

شروع جو کیا ہوں یہ دکھنی کتاب
یوا تمام جلدی سوں ہوئے شتاب

کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

اول ثنا و صفت کرنا اللہ تعالیٰ کا کہ او قادر ہے تمام چیز اوپر قدرت رکھتا ہے۔ اور ہر شے میں حاضر و ناظر ہے جیسا کہ شکر مٹھائی اور پھول میں باس۔ اسی طرح سب میں صنعت گیری رکھتا ہے۔

دیکھ تون آدم میں کیا صفت دھریا
اس کا صانع ہے خدائے کبریا

ہور تمام شے پر اس کی ذات بالاتر ہے ۔

آخری حصہ کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

اگر کوئی پوچھا کہ اے مالک تیرے وجود کتے ہیں ہور راہ ہور منزلاں ہور نفس اور شہادت اور مقام اور حال اور روح اور توحید اور نظر اور بادل اور زبان اور درجہ اور عناصر اور رنگ اور مزہ اور پھل اور مثال اور خاندان اور یہ سب چیزاں آپس میں کہتے ہیں جواب دے۔ اس واسطے اس کی پچھانت کرن :۔

تخلص ( ) بنایا ہوں [1]

[1] اُردو مخطوطات صفحہ ۳۱۴

کنز المومنین اس ایک مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ [1] اور دوسرا آصفیہ میں محفوظ ہے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے مخطوطے کے متعلق پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں :

: کتاب کی زبان دکھنی ہے۔ اس کے ماخذ مصنف نے عربی اور فارسی کی حسب ذیل کتابیں بتلائی ہیں :

آگے کتاب کے ماخذوں کی تفصیل دی گئی ہے جو حسب ذیل ہے۔ :

کنز المومنین ۔ مفتاح الصلوات ۔ کفایت الاسلام ۔ کفایت العباد ۔ تحفتہ الجواہر ۔ تحفتہ النصائح ۔ فتاویٰ ۔ کتاب الاخبار ۔ ہزار مسایل ۔ محیط کاکح ۔ کنز العباد ۔ کنز ابتیاں ۔ شرح وقایہ ہدایہ ۔ بحر فایق ۔ رایق ۔ مشکات ۔ تفسیر حسینی ۔ تفسیر جواہر ۔ قانی حال ۔ منہاج الانوار ۔ لطایف شاہی ۔ کشف الحقایق ۔ فتاویٰ ملتفت ۔

: کنز المومنین : انیس ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کئی کئی فصلوں میں منقسم ہے جن کی مجموعی تعداد خود مصنف نے : ستر پر تین (۷۳) بتاتی ہے مشتملات کی تفصیل پورے دو صفحوں پر حاوی ہے ۔ ان ابواب میں مسایل شرعیہ اور مسایل معرفت تفصیل سے بیان کیے گیے ہیں جیساکہ مصنف خود لکھتا ہے ۔ :

: علم شریعت علم معرفت پر جملہ اس کتاب میں انیس باب اور ترپن فصل ہیں :

اس کتاب کے لکھنے کی بڑی غایت یہ تھی کہ :

: جو مشرکانہ عقاید دیگر اقوام سے میل جول بڑھنے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیل گیے تھے ان کی برائیاں دکھا کر ان کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے :

ذیل کے اقتباس سے مصنف اور

: الحمد اللہ رب العالمین ۔ یعنی سرانا ہور تعریف کرنا سزاوار ہے ۔

اللہ تعالیٰ کوں کہ پیدا کیا ہے تمام خلقت کوں۔ بعد ای عزیز اس کتاب کا نام کنز المومنین رکھا ہوں۔ اس کا معنا مومن کا خزانہ ہے۔ ہور اس کتاب بنانے والے کا نام فقیر الحقیر تراب الاقدام عابد شاہ حسینی الحسینی قدس اللہ سرہ العزیز اس کتاب کوں دکھنی ہے کہ ہلکا نکو سمجھو۔ اس بری بری فقہ سین مسئلہ جمع کر کے لایا ہوں۔ تھا اتھر امیں فتوے کی مسلۂ خفیف مسئلہ نہیں لیا۔ ہور جواب سوال طرح طرح سے لایا ہوں ہور حدیث اور دلیل یا معنی لایا ہوں ہور نصیحتاں لایا ہوں کہ سب لوگاں کوں سمجھ ہوئی نیں تو عربی فارسی پر کسی کوں سمجھ نیں ہوتی تو اس واسطے دکھنی کیا کہ تمام لوگ سمجھ کر اللہ تعالیٰ کا حالت کری۔ ہور شریعت کا حکم بجانی۔ ہور کدو کیکی دل میں مسئلہ کا شک آیا تو اس کتابوں میں دیکھو۔ نام اس کتابوں کے یہ ہیں :

۱۔ قرآن شریف ۲۔ دستایین ۳۔ کنز ۴۔ .... ۵۔ مفتاح الصلوٰۃ
و ۶۔ احکام و ۷۔ ترغیب الصلوٰۃ و ۸۔ کفایت المومنین و
۹۔ کتابت العباد و ۱۰۔ تحفتہ الجواہر۔

اس طرح ان کتابوں کے ناموں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جن سے مصنف نے استفادہ کیا۔ آگے چل کر علم دین کی اہمیت اور اس کے سیکھنے کی ضرورت کے بارے میں مصنف لکھتا ہے :

: ہور مومن مسلمان پر فرض ہے جو علم دین کا سیکے جیسا کہ حدیث نبوی طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ اس کا معنی طلب کرنا فرض ہے مسلمانوں پر ہور مسلمان کی عورتوں پر پھر دوسرا دھوندو (ڈھونڈو) علم کوں کدو باگ (باگ) کے مان تھی (ماتھے) پر ہیں تو بھی۔ ہیں درناسیک نیکوں۔ دوسرا معنی اُطْلُبُ الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ فِی فَمِ الْبَہَائِمِ یعنی ڈھونڈو علم کوں کدو چار پائوں کی جانور کے موں میں تو بھی

بھی یعنی او جاڑوالے کا فعل حیوان سریکی تو بھی اس کی علم کون لیو فعل کون مت دیکھو۔ دوسرا حدیث طلبُ العِلمِ وَ لو کان بِالصِّین۔ اس کا معنا طلب کرو علم کا اگر وچین میں ہے تو یعنی اتنا دور ہوا تو بھی جانا ہور سیکنا :۔

حدیثوں کی سند کے ساتھ کمفصل وضو نماز بیع وشرا۔ نکاح اور میت وغیرہ کے اصول سمجھائے گئے ہیں۔ ابتدا میں انسان کی تخلیق کے متعلق احادیث اور ترجمے درج ہیں پھر ارکان دین اس کے بعد زجر و توبیخ وغیرہ کے مسئلے بیان کیے گیے ہیں۔

حدود اور توحد کو ذیل کے اقتباس میں یوں سمجھایا گیا ہے :۔

:۔ باب الحدود۔ تو حد کے معنی اصل میں منع ہیں۔ اسی واسطے بواب یعنے دریا کون حداد کھتیکہ اندر جانیکون منع کرتا ہے ہور بہار آنے کون۔۔۔ ہور جو حد کے شرع میں ہیں سو وسکے معنی یہ ہے کہ منع کرتا نہ کون کہ بندی ہور گیند کرنہ بجہ میں آتا ہور محارم یعنے بھی حدود اللہ ہوتا ہی جیسا کہ کتاب اللہ میں ہے۔

حدیث عربی تلک حدود اللہ خلد تقربوھا جیسا کہ تلک حدود اللہ خلد تعتدوھا باقی اوپر بول چکا ہوں "۔

عبد الصمد

اس دور میں مسایل شرع اور تصوف کے علاوہ فقہ، حدیث اور تفسیر کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ "تفسیر وہابی" تفسیر قرآن پر لکھی ہوئی بسیط کتاب ہے جس کا مخطوط کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ اس کے مصنف عبد الصمد بن نواب شکوہ الملک نصیر الدولہ عبد الوہاب نصرت جنگ ہیں۔ جو حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔

سورہ الحمد کی تفسیر کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

:۔ اللہ تعالیٰ ایسا بڑا صاحب ہے کہ تمام آسمان اور زمین کا اور فرشتوں کا اور بہشت کا اور دوزخ کا اور ان میں کی چیزوں کا اور تمام عالم کا پیدا کرنے ہارا وہی اللہ تعالیٰ ہے اور ایسا اللہ تعالیٰ ہے کہ فضل کرنے ہارا اور

گناہوں کا بخشنے ہارا آخرت میں اور پلنے ہارا اور دینے ہارا رزق کا مال کا اور ملک کا اور آبرو کا اور فتح کا بندوں کو اور دعا کا قبول کرنے ہارا۔ :

محمد شریف

محمد شریف بارھویں صدی ہجری کے اوایل کے ایک بزرگ تھے۔ جن کی ایک تصنیف "گنج مخفی" کا پتہ چل سکا ہے۔ "گنج مخفی" کے نام سے کئی تصانیف تصوف پر ملتی ہیں۔ چنانچہ شاہ برہان الدین جانم نے بھی ایک رسالہ اسی نام سے لکھا تھا۔ محمد شریف نے بھی اس نام سے ایک رسالہ لکھا۔ مصنف کے بیان سے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "گنج مخفی" اصل میں فارسی تصنیف تھی جس کا انھوں نے ترجمہ کیا ہے۔ غالباً ان کی یہی ایک تصنیف ہے۔ زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ کتاب اردو نثر کی ترقی کی ایک اور منزل کا پتہ دیتی ہے۔ مصنف نے وجہ تصنیف کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب انھوں نے اپنے ایک دوست احمد خان خویشگی کی فرمایش پر لکھی تھی :۔

"عاجز خفیف فقیر الحقیر محمد شریف کتاب منج فارسی دونوں جہان کی آرسی بولیا عبادت پاک کتے۔ الفاظ وحدانیت کے رسالے سوں ہور الفاظ وحدانیت کے رسالے پر موزوں محب ہمدم ہور مخلص ہم قدم احمد خان خویشگی فصیح زبان ہور ملیح بیان سوں جمع کی۔ راست پر کرنا مج انوں کی دل ہور روح کوں یوں بھایا کہ جیوں پیاسے نے خشک جنگل میں آب حیات پایا ہور صورت پاکی خوش لقا وحدانیت کا عین یہ عین اس آئینہ مبارک میں سوانوں کی دل بھی ...... انکھیاں کو ظاہر باہر نظر آیا تو اس عاجز کوں بہوت منت سوں بولے کہ "گنج مخفی" کو دکھنی زبان کی کلام کی نسر (نثر) مدون بولوں۔ اس آئینہ جمال کا فارسی غلاف کھولوں :

Hanif Raza

"گنج مخفی" کی تشریح پیر و مرید کے سوال و جواب کی صورت میں اس طرح کی ہے :

"پیر دستگیر کوں سوال پوچھی کہ ای قبلہ حاجات و کعبہ مرادات گنج مخفی کسے بولتے ہیں۔ پیر جواب باصواب فرمائی کہ گنج مخفی برگزیدہ یزدانی وجود انسانی کوں بولتے ہیں۔

مرید سوال کیے کہ بعضے خلق اللہ بولتے ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ کو مکان نہیں ہور بعضی بولتے ہیں کہ حق جل وعلی مکان ہے :

کتاب کے اختتام پر مصنف نے کتاب کی تصنیف کا ۱۱۱۱ھ بتایا ہے۔ اور کتاب کے اختتام پر خدا کی بارگاہ میں شکر ادا کیا ہے :

: لاکھ شکر بلک بیحد بے نہایت شکر۔ اس لطیف بے کیف کوں مہینان میں کا سید امہینا رمضان المبارک کے گیارھویں تاریخ ہور گیارھویں تاس ہور ایک ہزار ایک سو گیارہ برس کی ہجرت نبوی ۱۱۱۱ھ میں دکھنی زبان سوں پنجشنبہ کے روز شروع ہور مرتب کیا یو کتاب :

حبیب اللہ قادری

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کے کتب خانہ کی ایک بیاض میں حبیب اللہ قادری کے ایک رسالے ؛ تحفتہ المرسلہ ؛ کا ایک تفصیلی نوٹ مجھے ملا ہے۔ یہ نوٹ ؛ تحفتہ المرسلہ ؛ کے مخطوطے مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ پر مبنی ہے۔ رسالہ تصوف کے موضوع پر ہے اس کے آغاز کی عبارت حسب ذیل ہے :

: ثنا بہوتہ ہور صفت بے گنت ثابت ہے پروردگار کے تیں الیسا پروردگان کے اپنے الہام ربانی سوں روشنیاں ہو انوار کی باغستان کی ہور لالہ زار باطنی راز اس کی اپنی عارفاں کی سراں پر ہور ضمیراں پر کھولیا :

حالاتِ زندگی

حبیب اللہ قادری[1] کا سلسلہ نسب حضرت عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے وہ شاہ مرتضیٰ قادری کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بارہ برس تک جنگل اور صحرا میں ریاضت کرتے رہے پھر گلبرگہ میں قیام کیا۔ عالمگیر کے حملہ کے بعد جب مرہٹوں نے گلبرگہ پر یلغار کی تو شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اس وقت شاہ حسین صاحب سجادہ درگاہ سید محمد حسینی نے ان کو کہلا بھیجا کہ آپ کا مکان مستحکم اور محفوظ نہیں غنیم کی آمد ہے اگر آپ خانقاہ میں تشریف لے آئیں تو مناسب ہے

---

[1] تذکرہ اولیائے دکن صفحہ ۲۶۴

آپ نے فرمایا حضرت ذکریا نے درخت کی پناہ لی تھی ان کے سر پر آرے چلائے گیے میں حفظ الہی کے سوا کسی چیز کو پسند نہیں کرتا۔

مشہور ہے کہ جس وقت حملہ آور آئے وہ عبادت و ریاضت میں مشغول تھے۔ انھیں اس حال میں دیکھ کر حملہ آور واپس جانے لگے تو انھوں نے خود بلا کر مال و متاع ان کے حوالے کر دی۔ اس کے کچھ دن بعد وہ گلبرگہ سے حیدرآباد آگیے اور محلہ مستعد پورہ میں مقیم ہوئے ان کا انتقال ۱۱۴۲ھ میں ہوا۔

ان کے بیٹے ولی اللہ قادری بھی مشہور بزرگ گذرے ہیں جن کی تصنیف "معرفت السلوک" قدیم ادب کی ایک گراں بہا کتاب ہے۔ شاہ حبیب اللہ کے سترہ فرزند تھے جن میں شاہ ولی اللہ سب سے بڑے تھے اور وہی ان کے خلیفہ ہوئے۔

ولی اللہ قادری

حبیب اللہ قادری کے خلف اکبر تھے۔ "معرفت السلوک" انھوں نے اپنے والد کی فرمایش پر لکھی۔ جیسا کہ خود کتاب کے متن میں لکھتے ہیں :-

: بولتا ہے کمترین مرید ہور واپس ترین شاگرد جاروب کش درگاہ عالی بارگاہ ابالی عاجز فقیر الحقیر محمد ولی اللہ حکم کیے مجکوں حضرت شاہباز ولایت معدن ہدایت آفتاب عالمتاب بزرگ اولیا کے بری اتقیا کے ہور صدر نشین محمد مصطفیٰ کے صاحب شریعت ہور طریقت کے دریا حقیقت ہور معرفت کے وارث محمد رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری باقی رکھے۔ اللہ تعالی انو کوں :

یہ کتاب جیسا کہ اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے۔ انھوں نے والد کی زندگی میں ختم کی اور واجب الوجود، نفس امارہ، نفس لوامہ۔ توحید افعالی۔ توحید وجودی پر اپنی تفصیلی بحثیں لکھی ہیں۔

: معرفت السلوک : کے دو مخطوطے [1] کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے کے جو محرکات تھے اس کا ذکر بھی مصنف نے کیا ہے جو حسب ذیل ہے :

---

[1] تصوف نمبر (۶۸۰)

: کتیک ایسے طالبان حق کی ہیں جو نا عربی جانتے ہیں ہور نا فارسی پہچانتے ہین ولیکن اپنے مطلوب کی طلب میں سچے ہیں ہور ظاہری عالم کی نظر میں کچھ نین۔ ہور اپنے معشوق کے عشق مین جلتے ہیں۔ ہور اپنے محبوب کی بے نیازی دیک کر مہتاب کی ضرب کلتے ہیں۔ ہور حق کی باتاں کی پیاسے ہو کر حیران اور سر گردان (سرگردان) پھرتے ہیں۔ لیکن خضر کہاں ہیں جو اس مانی کی پانی کون ان سمجھی لفظاں کی ظلمات تے نیکال کر سمتجی زبان کی کوزی میں بھر کر اس پیاسیاں کی حلق کون تر کری ہور ابد کی زندگی بخشے تا اوسے دعا خیر سون یاد کریں تو تجکون لازم ہے جو اس معانی کی عروس کون فارسی ہور عربی کی خلوت خانی کی باہیر کھار کو ہندی زبان کی تخت پر بیلا جو تا ہر عاشق اپنی معشوق کی جمال کا شراب اپنی انکھیاں کی پیالیاں میں مالامال بھر کر اپنی جیو کی حلق کون پھونچاوی ہو ابد کا بے ہوش ہو جاوی۔ تو اس حکم کون غنیمت جان کر جیو سون قبول کیا میں ہور معانی کے محبوباں کی چہری تی حجاب ہور نقاب ان سبی لفظاں کا دور کیا میں ہور آیتہ ہور حدیث کی خوباں کی جمال کون ترجمہ کی زرایں سون آراستہ کیا میں تا دلبر ہور دلدار ہر عاشق کا ہووے ہور نور علیٰ نور نظر میں آوی :

مصنف شاہ محمود شاہ میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین کا مرید جن کے مرشد شاہ جمال الدین مغربی جمال الدین کے مرشد شاہ کمال الدین تھے۔ شاہ کمال الدین خواجہ صدرالدین ابو الفتح گیسو دراز کے مرید تھے۔

پانچ وجود یعنی واجب ممکن ممتنع عارف اور واحد کی تشریح کی ہے :

اس کے یو پانچ ابواب ہیں۔ پہلے باب میں واجب الوجود کی حقیقت سمجھائی ہے۔ دوسرے میں ممتنع الوجود۔ ممکن الوجود۔ چوتھے میں عارف الوجود۔ پانچویں میں واحد الوجود۔

ا۔ واجب الوجود۔ اس میں بتاتے ہیں کہ یہ وجود اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جو قائم ہے۔ ابدالابد

Hanif Razvi

اپنی ذات سوں جو اسکوں تغیر اور تبدیل نین ہور نوی پنا ہور فنا اس پر روا نین د
ھوالحی القیوم ہے یعنی ہمیشہ زندہ ہے۔ ہور ہمیشہ قایم ہے۔ ہور وجود تمام
موجودات کا اس سوں قایم ہے۔

مصرع: ما با او قایم او قایم بخود

چونکہ شاہ برہان الدین نے انسان کا وجود واجب مانا ہے یعنی بغیر اس کے
روح کا وجود نین۔ جیسا کہ حدیث میں خَلَقَ الاَرْوَاحَ مِنْ قَبْلِ الاَجْسَادِ
.... یعنی پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے روحاں کو جسماں تے انکھین پیدا کیں
لیکن وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ نین سکی تھیں۔ اس واسطے حضرت آدم علیہ السلام
کے جسم کون حق سبحانہٗ تعالیٰ نے بنا کیا ہور میثاق کی روح کون اس میں آتاریا
تو جس وقت روح ہور جسم نے ملاپ پائی تو اسی دونوں وجوداں کی ملاپ تھی
ایسا ایک وجود حقیقی ظاہر ہوا جو انہی کے ذاتی ہور صفاتی تجلی کے قابل ہوا اس
وجود خاکی کی خاصیت میکائیل کی ہے یعنی فعل اور صفت میکائیل کی ہے۔
چونکہ فرشتہ میکائیل پانی پر موکّل ہے ہور تمام عالم کو فیض بخشتا ہے یعنی اس پانی
تی کسی جن کی جھاڑاں زمین تے نکلتے ہیں۔ ایسے رویش بعض عناصر بھی یو بچہ
پانی سے فیض لیتے ہیں۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ یعنی کہ ہمیں ہر
یک شی کو پانی تی جیوتا کیا واسطا کہ خاکی وجود پانی سوں خمیر کیا ہے۔ تمثیل
اگر کوئی چاہے گا ماٹی تی کوزہ یا پیالہ کرے تو ہرگز نہ کر سکے گا۔ تب تلک کہ
پانی سوں ترکیب نہ دی جاوے۔ پچھن پچھین پانی مرکبات میں دوسرے عناصر ان
پر فضیلت رکھتا ہے۔ اس کے بعد روح نامیہ اور قلب مضغہ کا بیان ہے۔
پھر نفس امارہ کی تشریح ہے۔ پھر تجرید اور تفرید کا بیان ہے۔ تجرید یعنی جس
وقت مومن اللہ تعالیٰ کون اپنی پر تحقیق کیا تو سو دیکھتا ہے جو قدیم حادث ہے
جو یہی صفتاں ہیں مجرد ہو دی ہور اپنی منہ پھراوے تفرید وہ ہے۔ سب تعلقان

Hanif Razvi

کو چھوڑ کر سکیلا ہو۔ پھر ذکر جلی اور عارف کا بیان ہے۔ اس کے بموجب فراوشی عاشق کا لازمہ ہے۔ منزل ناسوت یعنی ذکر جلی کی یعد از حاصل ہوتی ہے اس روش سوں کہ سالک جس وقت ذکر جلی میں اللہ کی اسم سوں رہتا ذوق لیتا ہے ہور لذت پاتا ہے۔

ممکن الوجود اس کی تعریف مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے :

ممکن الوجود اسکوں بولتے ہیں جو اپنی سوں اپین قایم نچھے کہ ہین ہے ہور کہ ہین اپین حق سبحانہ کی امر میں ہور او سو تمام عالم کا وجود ہے جسم تی روح تک ہور عرش سے فرش تک ہور اس ممکن الوجود کا قایم ہونا حق سبحانہ کی ذات سوں ہے۔ ہور حق تعالے اپنی واجب الوجود سوں اپنی ذات سوں اپے قایم ہے نہ اس کی ذات کیفیر ہور تبدیل ہے۔ ہور نہ اس کی صفتاں میں پس اے یار حضرت پیر اپنی قرار داد میں روحانی وجوکا ناوں ممکن الوجود رکھے ہیں۔ اس کا موکل اسرافیل ہے۔ یعنی حضرت اسرافیل باری کلا ہے جو باریکوں چلاتا ہے۔ اسی روش ممکن الوجود کو بھی یو نچہ یک خاصیت ہور یک صفت ہے۔ جو اس وجود کو باری کی ضرب چلاتی ہیں۔ ہور یو وجود ایسا سیر رکھتا ہے جو یک لحظہ میں شرق تے مغرب تلک باری تے بھی زیادہ سیر کرتا ہے۔ ہور عرش سے فرش تلک اڑتا ہے۔ ہور یو سیر اس وقت حاصل ہوا جو آدم علیہ السلام کی جسم میں روح کوں بھیجے۔ اس کے بعد روح متعلق قلب نفس لوامہ فہم وہم کا ذکر ہے۔ اس میں بھی تجرید و تفریدیہ ہے۔ ذکر جلی کے بجائے ذکر قلبی اور مراقبہ ہے۔ اور منزل ملکوت ہے۔

اس کے بعد صوفیا کے مختلف اشغال کا ذکر کرتے ہیں :

ممکن الوجود کا شغل یہ ہے : ق ۔ ف ۔ غین ۔ عین ۔ ظ ۔ ط ۔ ض

(ق ۔ ف ۔ غ ۔ ع ۔ ظ ۔ ط ۔ ض)

پہلا شغل ق حرف سے کلام میں قدسی کلا منا یا اللہ یعنی اے بار خدایا پاک ہماری کلام کون

تیری حمد ہیں یعنی اس زبان سے دوسری زبان بخش تا لائق تیری کلام کے ہووے۔

ف۔ ف۔ کے حرف سوں دماغ میں خضر حنا ہی انک یعنی یا اللہ ای بار خدایا راحتمند کر ہمنا تیری رحمت کے خوشبوی سوں۔ تام حوم ایچھیں ہمیں تیری رحمت سوں۔

غ۔ کے حرف سوں بصر ہیں غنمتنا علی لقا یك یا اللہ یعنی اے بار خدایا ہماری انکھیاں کو غنیمت اپنی دیدار کا بخش تا تیری دیدار کے لائق اچھوں میں۔

ع۔ کے حرف سوں سمع میں علمنا القرآن فی سمعنا یا اللہ۔ یعنی اے بار خدایا۔ قرآن جو کلام اللہ ہے اس کو ہمارے کان میں تعلیم کر تا تیری معرفت حاصل ہووی۔

ظ۔ کے حرف سوں عقل میں ظرنا بجوھرك یا اللہ یعنی اے بار خدایا روشن کر ہماری عقل کوں تیری جوہر سوں۔

ط۔ کے حرف سوں طبنا شما متك یا اللہ۔ یعنے اے بار خدایا خوشی ہور خواف ہور ذوق تمام بخش تیری خوشبوی سوں۔

ض۔ کے حرف سوں ضیا میں ضونا بضو یك یا اللہ۔ یعنی اے بار خدایا روشن کر ہماری وجود کو اپنی ذاتی نور سوں۔

ممتنع الوجود: سو یوں ہے کہ ازل لازال میں حق تعالی کی ذات بغیر کسی شئے کوں وجود نہ تھا یعنی خدائے تعالی کی ذات تھی۔ ہور یوں اس کا موکل عزرائیل ہے۔ یعنی اس کی خاصیت عزرائیل کی ہے۔ جو قبض روحاں کوں کرتا ہے پچھیں اسے۔ بخش سالک تمام خطریاں کوں قبض کر لی ہور اپنی میں برقرار رہے۔ عزرائیل کے مانند جو تمام روحاں کوں قبض کرتا ہے۔ حیوانی ہور جنی ہور انسانی ہور ملکوتی تا جبرئیل ہور میکائیل ہور اسرافیل کے روح کوں بھی یو بچہ قبض کرے گا۔

عارف الوجود: اسے بولتے ہیں کہ دانا اچھے وجود پر یعنی ایسی ہستی ہے جو اپنی دانائی ہے۔ ہور یو ہستی ذاتی ہور منزہ ہے۔ سب ہستیاں سے ہور اپنی ہستی سوں قیام رکھتا ہے۔

Hanif Razvi

واحد الوجود: حق سبحانہ تعالیٰ کا وجود ہے۔ ہور یہ دایرہ مرکز ہور محیط سب دائریاں کا ہے۔
ہور رجوع ہونا سب دایریاں کا اسی طرف ہے۔ کیا واسطا کہ واجب الوجود
ممکن الوجود سوں قایم ہے۔

مذہبی موضوعات پر لکھنے والوں میں سے آخری دور کے سب سے اہم مصنف سید شاہ میر ہیں۔ جن کا زمانہ بارھویں صدی ہجری کے اوایل کا زمانہ ہے۔ تاہم موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ان کے کارنامے مذہبی تصنیفات کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

سید شاہ میر کی زندگی کے حالات پر ایک تفصیلی مضمون مولوی سخاوت مرزا صاحب نے نوائے ادب[1] بمبئی میں شائع کیا ہے۔ میری معلومات کا ماخذ یہی مضمون ہے۔

شاہ میر رانچوٹی سنہ ۱۰۸۱ھ تا ۱۱۷۱ھ

سید شاہ میر اپنی جائے ولادت کے تعلق سے، شاہ میر رائے چوٹی بھی مشہور ہیں۔ یہ سنہ ۱۰۸۱ھ میں رانچوٹی میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ذیل کے قطعہ سے ظاہر ہے:

صاحبِ کمال حضرت شہ میر قطب الدین
مخدوم رہ نمائے و سرتاج عارفین
آمد ندا از غیب بتاریخ شانِ عجب
سلطانِ اصفیا و شہنشاہ واصلین (۱۰۸۲ھ)

ان کا نام سید محمد حسینی اور لقب شاہ میر تھا۔ والد کا نام شاہ جمال الدین تھا جو حضرت مخدوم جہانیانِ جہاں گشت کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے آبا و اجداد سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں ملتان سے گجرات اور گجرات سے بیجاپور آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ سلطنت عادل شاہیہ بیجاپور کے خاتمہ کے بعد شاہ میر کے جد امجد شاہ کمال الدین نے بیجاپور کی اقامت ترک کردی اور شاہ نور میں رہنے لگے۔ شاہ میر کے والد شاہ جمال الدین شاہ نور سے رانچوٹی

۱؎ نوائے ادب، بمبئی، جلد ۴ شمارہ ۳ (جولائی ۱۹۵۳ء)

آگرآباد ہو گیے اور وہیں اپنی بقیہ زندگی گزاری ان کا انتقال ۱۱۸۲ھ میں ہوا۔ ان کے سنہ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ تذکرہ اولیائے دکن میں ان کی عمر ۱۰۵ اور سنہ وفات ۱۱۸۶ھ درج ہے لیکن مطبوعہ انتباہ الطالبین کے خاتمہ پر یہ قطعہ وفات لکھا ہے۔

معدنِ توحید کانِ معرفت
حضرت شاہ میر پیر نیک خو
بہر تاریخ اتش ندا آمد ز غیب
ہست جنّت بالیقین ماوائے

(جس سے ۱۱۸۲ھ برآمد ہوتا ہے)

شاہ میر نے اپنے والد ماجد کے سایہ عاطفت میں تعلیم پائی۔ انھیں علم حدیث۔ فقہ۔ تفسیر منطق اور فلسفہ پر کافی عبور تھا۔ اس دور کے لکھنے والے بزرگوں میں سید شاہ میر کی اوّلیت یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی حقایق کو فلسفیانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ سخاوت مرزا نے تمکین کاظمی صاحب کے ایک بیان کی کہ اُردو میں فلسفہ اور نفسیات پر سب سے پہلے مرزا رسوا اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے کتابیں لکھیں تردید کی ہے۔ کیونکہ شاہ میر نے اس سے بہت پہلے ان موضوعات پر لکھنا شروع کیا تھا۔ شاہ میر نے جس طرح فلسفیانہ اور منطقی بنیادوں پر وجود ذات باری تعالیٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس دور کے ادب میں اولیات میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ منطق اور فلسفے کی کئی اصطلاحوں کے ترجمے بھی انھوں نے کیے ہیں۔ اُردو زبان کو جو ابھی اپنے نشو و نما کے ابتدائی مرحلے میں تھی ایسے مضامین کے لیے استعمال کرنا شاہ میر کا بڑا قابل قدر کارنامہ ہے۔ شاہ میر نے بھی شاہ میران اور شاہ بُرہان کی طرح نہ صرف زبان اور قلم سے اُردو زبان کی خدمت کی بلکہ اپنے پیچھے اُردو لکھنے والوں کا ایک بڑا گروہ چھوڑ گیے۔ دسویں صدی کے اواخر اور گیارھویں صدی کے اوایل میں شاہ میر اور ان کے تلامذہ نے سلسلہ تصانیف کو جاری رکھا۔

۵؎ : انتباہ الطالبین :

ان کی تصانیف مندرجہ ذیل مشہور ہیں :

۱- اسرار توحید ۲- انتباہ الطالبین ۳- رسالہ عینیت وغیرت

۴- رسائل قادریہ ۵- عقاید صوفیہ ۶- دیوان میر

اسرار التوحید اس دور کے لکھنے والوں میں اس کتاب کا ذکر اردوے قدیم میں حکیم شمس اللہ قادری نے سرسری طور پر کیا ہے اور صرف یہ لکھا ہے کہ سید شاہ میر نے بھی ایک رسالہ مسایل توحید کے موضوع پر لکھا تھا ۔ اس کا مخطوطہ یہاں کتب خانہ آصفیہ میں دستیاب ہوا ہے ۔ اس رسالہ میں خدا کی ذات وصفات پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی گئی ہے اور رسول اللہ کی ذات کو وجہ تخلیق کائنات ثابت کیا ہے ۔ آخر میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان اسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے کسی مرشد کامل سے فیض حاصل کرنا ضروری ہے ۔ مخاطب کو شاہ میر کا اندازِ تخاطب بھی اچھے بزرگوں کا سا ہے چنانچہ وہ پڑھنے والے کو: اے عزیز : سے مخاطب کرتے ہیں ۔ شاہ میر نے بعض موقعوں پر شاہ برہان الدین کے اشعار کو بہ طور تائید استعمال کیا ہے ۔ علاوہ ازیں حاشیہ پر بھی شاہ برہان الدین کے حسب ذیل دس شعر نقل کیے ہیں جس کی سرخی یہ ہے :

: من کلام حضرت شاہ برہان صاحب قدس اللہ سرہٗ :

اس کے ابتدائی چند شعر حسب ذیل ہیں :

دیکھ وجود کے برتن او مرکر چھوڑے تن

سب کاموں ہووے اُداس تب رہے پنچ پلاس

جی راکھے پنچ حوس تو ہووے وہی نفس

وجود کے اوضاع سے متعلق جو بحث کی ہے اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :

: اے عزیز وجود دو صنع کا ہے ایک واجب الوجود دوسرا ممکن الوجود واجب الوجود اسے بولتے ہیں جو خود بخود آپ سوں آپ قایم ہے ۔ ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہے گا ۔

۱؎ فہرست اُردو مخطوطات از حامد اللہ ندوی مطبوعہ رسالہ : نوائے ادب :

Hanif Raza

ہور وہ وجود حق تعالیٰ کا ہے یعنی خدا کی ذات ہور صفات کو واجب الوجود کہتے ہیں۔ ہور وہ قدیم ہے ہور غیر مخلوق ہور باقی ہے۔ ہور دایم ہے ممکن الوجود دو بھانت ہے۔ ایک جوہر دوسرا عرض جوہر قایم بہ نفس خود کون کہتے ہیں ہور عرض قایم بالغیر کون کہتے ہیں۔ ہور جوہر پانچ وضع کا ہے اول عقل دوسرا نفس تیسرا جسم چوتھا ہیولا پانچواں صورت عقل مجرد تنہا مادے سے اپنی ذات میں اور فعل میں نئیں کس واسطے کہ محتاج ہے تصرف و تدبیر کے بیچ مادے کا اور ہیولا جاگا ہے جسم کی صورت کا اور جسم مرکب ہے۔ ہیولا اور صورت سے ہور صورت ایک جوہر ہے۔ اترنے والا ہیولا میں عرض نو قسم کا ہے۔ اول کم یعنی گی جو دکھنی کتا پنا بولتے ہیں اور کم دو وضع کا ہے متصل ہور منفصل متصل وہ ہے۔ درمیانے اس کے اجزاء کے حد مشترک ہے۔ مشترک اسے بولتے ہیں جو نہایت اول جزو کا اور ہدایت دوسرے جز کا ہے۔ جیسا کہ خط میں لکیر اور منفصل وہ ہے کہ اس کے اجزا میں حد مشترک اچھے جیسا کہ عدد یعنی گنتی دوسرا کیف یعنی چگونگی جو دکھنی میں کیا پنا بولتے ہیں۔ کیف چار وضع کا ہوتا ہے۔ اول کیف جسمانی او سے بولتے ہیں جو ظاہر کے حواس میں آوے جیسا کہ باس ہور لذت دوسرا کیف نفسانی جو حیوان اور جاندار کو ہوتا ہے جیسا کہ علم اور حیات۔ تیسرا کیف مخصوص عجل جیسا کہ ڈول ہور رنگ چوتھا کیف استعدادی جو شے اس سے کمال اپنا حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ تلوار کی تیزی یعنی کاٹ۔ تیسرا اضافت ہے جو ایک شے کو دوسری شے سے نسبت حاصل کرنے میں دونوں شے کو حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ پدری اور پسری یعنی باپ پنا ہور بیٹاپنا۔ چوتھا این وہ ہے جو شے مکان حاصل کرنے میں حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب کے تین مشرف حاصل ہوتا ہے۔ حمل کے برج میں اترنے سوں اور بعض کہتے ہیں جو این مکان میں داخل ہوتا ہے۔ پانچواں متی وہ ہے جو شی وقت تے آتے سو

شے کے تین حاصل ہوتا ہے جیسا کہ چاند کو گرہن اس کے ہور سور کے درمیان زمین آڑ ہونے وقت حاصل ہوتا ہے۔

یہ کتاب: اسرار التوحید: ۱۳۱۲ھ میں مطبع عزیز حیدر آباد طبع ہو چکی ہے۔

انتباہ الطالبین

یہ شاہ میر کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل بحثیں شامل ہیں۔ پہلے تمہید ہے جو گویا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر ہے۔ اس کے بعد اصل متن شروع ہوتا ہے۔

مباحث کے عنوان حسب ذیل ہیں:

۱۔ ذکر پیری و مریدی
۲۔ ذکر چہار پیر و چہار خانوادہ
۳۔ ذکر معرفت عقلی
۴۔ ذکر معرفت علمی
۵۔ ذکر معرفت کشفی
۶۔ مقولہ علما ظاہر
۷۔ مقولہ فقرا باطن
۸۔ ذکر سلوک
۹۔ ذکر توبہ و اقسام آن
۱۰۔ ذکر توکل و انواع آن
۱۱۔ ذکر قناعت و اقسام آن
۱۲۔ ذکر حقیقت
۱۳۔ ذکر خلوت

اسی طرح ۴۴ ابواب ہو سکتے ہیں۔

ذیل کے اقتباس میں باری تعالیٰ کے ناموں کے ہر نام سے اس کے موسوم ہونے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بنام آن کہ او نامی نہ دارد
بہر نامے کہ خوانی سر بر آرد

جس نام سوں تو اسے بلاوے گا سر اٹھاوے گا یعنی جواب دیوے گا ہور حاضر ہووے گا اے طالب صادق بی وجود ہے۔ اسے ایک نام نین بلکہ اسکے نام بےحد ہور بے عدد ہیں ہور عدم کو سواۓ ایک نام کے دوسرا نام نین اس سبب سوں کہ اسم بے مسمیٰ ہے۔ یعنی لاشے ہور وجود شے ہے ایسا کہ بھوت

Hanif Razvi

کمالات رکھتا ہے ہر ایک کمال کے سبب سون اسے ایک نام علحدہ رکھتے ہیں۔
اہلِ توحید کی اصطلاح میں وجود ہست کون بولتے ہیں۔ ہور ہست حقیقی حق تعالےٰ ہے کہ اول بی ہے ہور آخر بی ہے ہور درمیانی بی ہے یعنی نین تھے تب بھی تھا۔ ہور ہمین نا ہونینگے تب بی رہے گا۔ [1]

اس رسالہ میں مزید حسب ذیل بحثیں شامل ہیں۔ :

۱- ممکن کو نہ ذات نہ صفات نہ افعال نہ انا

۲- دلایل اختراض بیعت طریقت

۳- فال صحیح

۴- سلوک حقیقی وہ ہیں جو عموماً مروج ہے۔

۵- مقامات عشرہ سلوک بشرح معانی حسب شریعت۔ حقیقت

۶- حق اور عالم میں عینیت حقیقی اصطلاحی اور غیریت حقیقی اصطلاحی مطابق شرع شریف

۷- توحید تعطیل اور تشریک کے مسایل

نو بطون

یہ رسالہ بھی شاہ میر سے منسوب کیا جاتا ہے اس ایک مخطوطہ کتب خانہ جامعہ مسجد بمبئی اور دوسرا کتب خانہ آصفیہ میں ہے[2] یہ دراصل ایک فارسی رسالے : نہ بطون : (مصنفہ سید اسد اللہ) کا ترجمہ ہے [3]۔

اس میں تصوف کے بعض اسرار اور رموز کی تشریح کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ان نو بطون سے کائنات کا ظہور ہوتا ہے۔ رسالہ کی ابتدا سے پہلے نو بطون کی تفصیل۔

---

[1] مطبع عزیزی حیدر آباد

[2] جامعہ بمبئی کے اُردو مخطوطات

[3] حامد اللہ ندوی " نوائے ادب بمبئی "

ہستی مطلق	ہستی مجمل	ہستی مفصل
۱۔ امین دیکھ	۱۔ روح مقیم	۱۔ روح جاری
۲۔ امین شاہد	۲۔ انا نور	۲۔ من نور
۳۔ امین نور	۳۔ ممکن الوجود	۳۔ واجب الوجود

رسالہ کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے :

: ظاہر کا دیکھ روح جاری اس پر کی شاہدی من نور۔ ظاہر کا وجود واجب یہ تینوں مل کر بندہ ہوا اور باطن کا وجود ممکن اس کا دیکھ روح مقیم اس پر کی شاہدی انا نور یہ تینوں مل کر محمد ہوا ذات کا دیکھ امین دیکھ ذات کا شاہد امین شاہد اور ذات کا وجود امین نور یہ تینوں مل کر خدا البیچہ نوم تبہ (نو بطون) بولتے ہیں :

رسالہ قادریہ : رسالہ قادریہ بھی شاہ میر کی تصنیف بتائی گئی ہے۔ لیکن کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کی "فہرست اُردو مخطوطات" میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری اپنے شبہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

: عبارت سے صرف اس قدر پتہ چل سکتا ہے کہ یہ رسالہ سید محمد شاہ میرؒ کے ارشادات سے ہے۔ چونکہ بعض رسالے اس قسم کے بھی دستیاب ہوئے ہیں جس میں مرشدین کے اقوال وارشاد کو مریدین نے اپنے طور پر ترتیب دیا ہے۔ اس لیے یہ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رسالہ خود حضرت سید محمد شاہ میرؒ کا مرتبہ ہے یا ان کے مریدین میں سے کسی ایک کا [۱]۔

لیکن پروفیسر سروری صاحب کا مذکورہ بالا شبہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ شاہ میر کی دیگر تصانیف اور رسالے کی زبان میں کوئی فرق نہیں اور انداز بیان بھی یکساں ہے۔ ان اندرونی

---

[۱] : فہرست اُردو مخطوطات، جامعہ عثمانیہ صفحہ ۷۹

Hanif Razvi

شواہد کی بنا پر مجھے خیال ہے کہ یہ رسالہ شاہ میر ہی کی تصنیف ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے اس کے سرورق پر درج ہے :

: یہ رسالہ قادریہ حضرت دادا مرشد سید محمد شاہ میر قدس سرہٗ بیان میں تنزلات کے جو موافق بعض اصطلاح قادریہ فرماتے ہیں :

اس بیان کی موجودگی میں شبہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ رسالہ یوں شروع ہوتا ہے :

: ثنا اور شکر سزاوار اس خدا کو جو انسان کو اپنی ذات وصفات کی معرفت سے مشرف کیا اور اپنی توحید اور یگانگی کی خلعت عطا کیا :

اصل بحث کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

: اول فرض بندہ مکلف پر ایمان ہے اور ایمان کلمہ سے حاصل ہوتا ہے یعنی کلمہ میں بیان خدا کا وحدانیت کا اور محمد رسول اللہ کی رسالت کا ہے :

: رسالہ قادریہ : کے ساتھ مزید تین رسالے منسلک ہیں[۱] جن کا ذکر پروفیسر سروری صاحب نے فہرست : اردو مخطوطات : جامعہ عثمانیہ میں کر دیا ہے۔

مدح میران

یہ منظوم رسالہ ہے جس میں شاہ میر نے شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح لکھی ہے۔ مقطع میں شاعر نے صاف طور پر اپنا نام شاہ میر لکھا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ کے وزیر اور محمد قلی قطب شاہ کے خسر کا نام بھی شاہ میر تھا۔ اسی بنا پر پہلے ڈاکٹر زور کو یہ شبہ ہوا تھا کہ یہ ہ آخر الذکر کی تصنیف ہوگی لیکن بعد میں انھوں نے اس کی تردید کر دی[۲]۔

دیوان میر

شاہ میر غزل بھی خوب لکھتے تھے چنانچہ ان کی غزلوں کا ایک دیوان مرتب کیا گیا ہے۔ کلام زیادہ تر متصوفانہ ہے۔ لیکن عاشقانہ رنگ کے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔

شاہ میر کے بھائی شاہ کمال تھے جو ان کے خلیفہ بھی تھے۔ شاہ کمال بھی صاحب دیوان

---

[۱] فہرست اردو مخطوطات، جامعہ عثمانیہ صفحہ ۸،

[۲] " " " ادارۂ ادبیات اردو صفحہ ۱۰۱

Hanif Razvi

شاعر ہوئے ہیں جن کا دیوان : گنج عرفان[1] : کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

شاہ اعظم

شاہ میر کے صاحبزادے سید محی الدین کے مرید شاہ اعظم بھی ایک کتاب : الوجود تلاوۃ : کے مصنف ہیں جس کا ایک مخطوطہ عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

یہ رسالہ : انتباہ الطالبین : کے ساتھ ایک ہی جلد میں منسلک ہے[2]۔

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ کئی ایسی کتابیں بھی ملتی ہیں جن کے مصنفین کا سراغ نہیں مل سکا۔ یہ تمام تصانیف مذہبی ہیں۔ ان میں مذہب کی ہر صنف جیسے حدیث۔ فقہ۔ تفسیر اور تصوف وغیرہ کی کتابیں شامل ہیں۔ ذیل میں ان کتابوں کی تفصیل درج کی جارہی ہے :

مفتاح الخیرات۔ مجموعہ المسایل۔ ترجمہ چہل حدیث۔ عرفان العشاق۔ رسالہ اخلاق۔ ہدایت المومنین۔ گوشہ عافیت۔ تفسیر اذا جاء۔ سوال جواب موسیٰ۔ ابلیس نامہ۔ رسالہ شریعت۔ فقہ۔ ہزار مسئلہ۔ وصایائے نبی آمدنامہ۔ وحدالوجود۔ پنج تن۔ حجتہ الاسلام۔ مشکواۃ وغیرہ۔

ان میں بعض کافی اہم ہیں جیسے عوارف المعارف۔

عوارف المعارف

: عوارف المعارف : مصنفہ شہاب الدین سہروردی فارسی زبان میں تصوف پر بے مثل کتاب ہے۔ : عوارف المعارف : کے ترجمہ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب بندہ نواز کی تصنیف : آداب المریدین : کی طرح صوفیوں کی خصلتوں اور اخلاق کے بیان میں ہے مثلاً غم و مسرت میں نفس کو قابو میں رکھنا۔ خوش اخلاقی۔ شرم و حیا وغیرہ صفات پر زور دیا گیا ہے۔ اس کا نمونہ درج ذیل ہے :

: صوفی لوگ اللہ کے پیغامبر صلے اللہ وسلم کی راہ پر چلتے ہیں سب لوگاں

---

[1] : گنج عرفان : نامی شاہ میران جی کی ایک مثنوی بھی چھپی ہے۔

[2] : نوائے ادب : بمبئی اپریل ۱۹۵۳ء

: مضمون سید محمد حسینی الملقب بہ شاہ میر رائے چوٹی : نوشتہ محمد سخاوت مرزا

سے زیادہ حصہ پانے والے ہیں اور سب سے بڑھ کر اس بات کے لائق ہیں کہ آپ کے طریق زندہ کریں اور اللہ کے پیغامبر صلی اللہ کے خصلتوں موافق پکڑنا اچھی طرح آپ کی راہ پر چلتے ہیں۔ اور آپ کے طریق کو زندہ کرنے میں داخل ہے۔ جیسا کہ ہم کو خبر دیئے استاد عالم ضیاء الدین مسلمانوں کے استاد ابو احمد عبدالوہاب نے بو علی کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو خبر دیئے ابو الفتح عبدالملک نے جو ابو القاسم کے بیٹے ہیں کہا کہ ہم کو خبر دیئے ابو نصر عبدالعزیز تریاقی نے جو محمد کے بیٹے ہیں ہم کو خبر دیئے ابو محمد عبدالجبار نے۔ محمد کے بیٹے کہا کہ ہم کو خبر دیئے ابو العباس محمد نے جو احمد کے بیٹے کہا کہ ہم کو خبر دیئے ابو عیسی محمد نے جو ترمذ کے رہنے والے بیٹے عیسی کے وہ بیٹے سورہ کے کہا کہ ہم سے کہا مسلم انصاری نے جو قایم کے بیٹے بصرہ کے رہنے والے۔ کہا کہ ہم سے بیان کیا محمد انصاری نے جو عبداللہ کے بیٹے وہ روایت کرتے ہیں۔ اپنے باپ سے وہ علی سے جو زید کے بیٹے وسعید سے ...... انھوں نے کہا کہ انس نے مالک کے بیٹے ان ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہو کہ مجھ سے فرمایا اللہ کے پیغامبر نے اے میرے بیٹے اگر تجھ سے ہو سکے تو صبح کرے۔ اور شام کرے۔ اس حالت میں کہ تیرے دل میں کسی کا کینہ نہ ہو تو یہ بات کر کے فرمایا اے میری بیٹو اور میرے یہ طریق میں سے ہے جس نے میرے طریق کو زندہ کیا تو اس نے مجھ کو زندہ کیا۔ وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔ یعنی پھر صوفیوں نے زندہ کیا۔ طریق اللہ کے پیغمبر کا۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے شروع میں آپ کی فرمائی ہوئی باتوں پر قایم رہے اور اپنی حالت کے بیچ میں آپ کے کاموں کی پیروی کیے تو اس سے ان کو پھل یہ ملا کہ وہ اپنی آخر کی حالتوں میں آپ کی خصلتوں پر ثابت ہو گیے۔ اور خصلتوں میں درست کرنا نہیں ہو سکتا۔ مگر نفس کے

Hanif Raza

پاک کرنے کے بعد اور پاک کرنے کا طریق یہ ہے کہ شریعت کے بندوبست کی تابعداری کرے اللہ نے اپنی نبی سے فرمایا کہ بیشک تو بڑے خلق پر ہے جبکہ آپ سب سے بڑھ کر عمدہ اور سب سے بڑھ کر نفس میں پاک تھے تو سب سے بڑھ کر خصلت میں اچھے تھے۔ حضرت عائشہ سے پوچھے کیا اس کی پیغامبر کے خصلت کا احوال۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ کی خصلت قرآن ہے۔ قتادہ نے فرمایا وہ باتیں ہیں جو آپ عمل کرتے تھے اللہ کے حکموں پر اور باز رہتے تھے ان چیزوں سے جن سے اللہ نے منع فرمایا :

اس کتاب کے چالیس باب ہیں۔ چند اہم ابواب کے اقتباس ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

۱۔ تیسواں باب : جدا جدا بیان میں صوفیوں کی خصلتوں میں جیسے صوفیوں کی بہت اچھی خصلتوں میں سے عاجزی ہے اور نہیں پہنتا ہے بندہ کوئی لباس بہتر عاجزی سے اور جس شخص کو مل گیا خزانہ عاجزی کا اور حکمت کا وہ قایم رکھتا ہے اسی نفس کو نزدیک ہدایت :

ایک اور اہم باب کا اقتباس درج ذیل ہے :

۲۔ اکتیسواں باب : الباب الماری وثلاثون۔ روایت کیا گیا رسول اللہ سے کہ اپنی فرمایا ادب سکھلایا مجھ کو رب میرے نے پس خوب طرح ادب سکھایا مجھ کو۔ پس ادب صاف کرنا ہے ظاہر و باطن کا۔ پس جس وقت ظاہر صاف ہو تو ظاہر بندہ اور باطن اس کا ہو گیا صوفی ادب والا :[۱]

تبصرہ اس دور کی نثر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مذہبی ہے۔ کیونکہ اس کے لکھنے والے سنت اور صوفیا تھے۔ اور ان کی مخاطبت عوام سے تھی۔ اسی لیے مذہبی تحریریں بھی عوامی زبان ہی میں لکھی گئیں۔ گو اس وقت نظم و نسق اور درباروں کی زبان فارسی

---

۱ : شرح عوارف المعارف : مخطوط مخزونہ کتب خانہ آصفیہ تصوف صفحہ ۶۴۰

Hanif Razvi

سے زیادہ حصہ پانے والے ہیں اور سب سے بڑھ کر اس بات کے لائق ہیں
کہ آپ کے طریق زندہ کریں اور اللہ کے پیغامبر صلی اللہ کے خصلتوں
موافق پکڑنا اچھی طرح آپ کی راہ پر چلتے ہیں۔ اور آپ کے طریق کو زندہ
کرنے میں داخل ہے۔ جیسا کہ ہم کو خبر دیئے استاد عالم ضیاء الدین مسلمانوں
کے استاد ابو احمد عبدالوہاب نے بو علی کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو
خبر دیئے ابو الفتح عبدالملک نے جو ابو القاسم کے بیٹے ہیں کہا کہ ہم کو خبر
دیئے ابو نصر عبدالعزیز تریاقی نے جو محمد کے بیٹے ہیں ہم کو خبر دیئے ابو محمد
عبدالجبار نے۔ محمد کے بیٹے کہا کہ ہم کو خبر دیئے ابو العباس محمد نے جو احمد
کے بیٹے کہا کہ ہم کو خبر دیئے ابو عیسی محمد نے جو ترمذ کے رہنے والے بیٹے عیسی
کے وہ بیٹے سورہ کے کہا کہ ہم سے کہا مسلم انصاری نے جو قایم کے بیٹے بصرہ
کے رہنے والے۔ کہا کہ ہم سے بیان کیا محمد انصاری نے جو عبداللہ کے بیٹے
وہ روایت کرتے ہیں۔ اپنے باپ سے وہ علی سے جو زید کے بیٹے وسعید سے
.... انھوں نے کہا کہ انس نے مالک کے بیٹے ان میں۔ اللہ
ان سے راضی ہو کہ مجھ سے فرمایا اللہ کے پیغامبر نے اے میرے بیٹے اگر
تجھ سے ہو سکے تو صبح کرے۔ اور شام کرے۔ اس حالت میں کہ تیرے
دل میں کسی کا کینہ نہ ہو تو یہ بات کر کے فرمایا اے میری بیٹو اور میرے یہ
طریق میں سے ہے جس نے میرے طریق کو زندہ کیا تو اس نے مجھ کو زندہ
کیا۔ وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔ یعنی پھر صوفیوں نے زندہ کیا۔
طریق اللہ کے پیغمبر کا۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے شروع میں آپ کی فرمائی ہوئی
باتوں پر قایم رہے اور اپنی حالت کے بیچ میں آپ کے کاموں کی پیروی
کیے تو اس سے ان کو پھل یہ ملا کہ وہ اپنی آخر کی حالتوں میں آپکی خصلتوں
پر ثابت ہو گیے۔ اور خصلتوں میں درست کرنا نہیں ہو سکتا۔ مگر نفس کے

Hanif Razvi

پاک کرنے کے بعد اور پاک کرنے کا طریق یہ ہے کہ شریعت کے بند وبست
کی تابعداری کرے اللہ نے اپنی نبی سے فرمایا کہ بیشک تو بڑے خلق پر ہے
جبکہ آپ سب سے بڑھ کر عمدہ اور سب سے بڑھ کر نفس میں پاک تھے تو سب
سے بڑھ کر خصلت میں اچھے تھے۔ حضرت عائشہ سے پوچھے کیا اس کی
پیغامبر کے خصلت کا احوال۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ کی خصلت قرآن
ہے۔ قتادہ نے فرمایا وہ باتیں ہیں جو آپ عمل کرتے تھے اللہ کے حکموں
پر اور باز رہتے تھے ان چیزوں سے جن سے اللہ نے منع فرمایا :

اس کتاب کے چالیس باب ہیں۔ چند اہم ابواب کے اقتباس ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

۱۔ تیسواں باب : جدا جدا بیان میں صوفیوں کی خصلتوں میں جیسے
صوفیوں کی بہت اچھی خصلتوں میں سے عاجزی ہے اور نہیں پہنتا ہے
بندہ کوئی لباس بہتر عاجزی سے اور جس شخص کو مل گیا خزانہ عاجزی کا اور
حکمت کا وہ قایم رکھتا ہے اسی نفس کو نزدیک ہدایت :۔

ایک اور اہم باب کا اقتباس درج ذیل ہے :

۲۔ : اکتیسواں باب : الباب الحادی وثلاثون۔ روایت کیا گیا رسول اللہ
سے کہ اپنی فرمایا ادب سکھایا مجھ کو رب میرے نے پس خوب طرح ادب سکھایا
مجھ کو۔ پس ادب صاف کرنا ہے ظاہر و باطن کا۔ پس جس وقت ظاہر صاف
ہو ظاہر بندہ اور باطن اس کا ہو گیا صوفی ادب والا :۔ لہ

تبصرہ

اس دور کی نثر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مذہبی ہے۔ کیونکہ اس کے لکھنے
والے سنت اور صوفیا تھے۔ اور ان کی مخاطبت عوام سے تھی۔ اسی لیے مذہبی
تحریریں بھی عوامی زبان ہی میں لکھی گئیں۔ گو اس وقت نظم و نسق اور درباروں کی زبان فارسی

لہ: شرح عوارف المعارف : مخطوط مخزونہ کتب خانہ آصفیہ تصوف صفحہ ۶۴۰

Hanif Razvi

تھی۔ لیکن عوام اُردو بولتے تھے جو : ہندوستانی : یا : ہندوی : یا : دکھنی : کے نام سے موسوم تھی اور یہ زبان قریب قریب تمام ملک میں رائج تھی چنانچہ اس دور میں گجرات کے مصنفین کے کارنامے بھی ملتے ہیں اور پنجاب و دکن کے مصنفین کے بھی وہیں کچھ کارنامے بنگال کے بھی ہیں۔ مذہبی دور کے تقریباً ساری تصانیف فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اُردو کے علاوہ اودھی اور برج بھاشا بھی فارسی رسم الخط ہی میں لکھی گئی۔ اسی طرح دیوناگری رسم الخط میں خالص اُردو یا : کھڑی بولی : میں لکھی ہوئی تصانیف بھی ملتی ہیں۔ اس خصوص میں ملک محمد جائسی کی تصنیف : پدماوت : کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جائسی نے اودھی اور راجستانی بولی کو فارسی رسم الخط میں لکھا ہے۔ اسی طرح اُردو یا : کھڑی بولی : کے ادیب اور شاعروں نے اس کے لیے دیوناگری رسم الخط بھی استعمال کیا ہے چنانچہ کبیر اور نانک کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ رسم الخط کے بارے میں اس آزادی کے باوجود اس دور کے ادب کی سب سے خاص بات یہی ہے کہ چاہے وہ کبیر کے دوہے ہوں یا میراں جی اور یحییٰ منیری کے کچھ مندرے ان سب پر مذہب کی چھاپ ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے لکھنے والوں نے محض طریقت یا حرف شریعت کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ یعنے مذہب کے صرف نظری یا صرف عملی پہلو ہی کو نہیں لیا بلکہ نقلی اور عقلی دونوں طرح کے علوم میں اپنے کارنامے چھوڑے ہیں چنانچہ جہاں ما بعد مابعد الطبیعاتی مسایل پر تصنیفات ملتی ہیں وہیں وضو کے طریقے نماز کے مسایل۔ میراث اور شوہر اور بیوی کے حقوق وغیرہ جیسے مسایل پر بھی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں مصنفین نے جہاں اونچے دھنی طبقے کے لوگوں کے لیے مذہب کے دقیق مسایل بیان کیے ہیں وہیں ان پڑھ عورتوں کے لیے : چکی نامہ : وغیرہ کے روپ میں مذہبی احکام سمجھانے اور سکھلانے کی کوشش بھی کی ہے

اس دور کی تصانیف کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بعض مصنفین نے مذہب کے خشک مسئلوں اور ٹھوس اصولوں کو بھی ادبی رنگینیاں عطا کر کے شگفتہ اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس خصوص میں میراں جی شمس العشاق کی نظم : خوش نامہ : اور شاہ برہان کی تصنیف

Hanif Razvi

: وجدیہ : کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جن میں طرح طرح کی خیال انگیز تشبیہوں اور چست استعاروں سے خدا اور بندے کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے اور ان سے صرف تفہیم کا کام نہیں لیا گیا بلکہ قاری کا انہماک اور دلچسپی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور یہی چیز : ادب : کے ارتقاء میں پہلے قدم کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لیے اس دور کے ادب کی اہمیت گھٹائی نہیں جا سکتی۔

چوتھی خصوصیت جو اس دور کی اکثر تصانیف میں نظر آتی ہے وہ ہے ہندوستانی ماحول

اس دور کے ادیبوں اور شاعروں نے جذبات کی عکاسی میں ہندوستانی مزاج اور ماحول کا خیال رکھنے کی خاص کوشش کی ہے چنانچہ اکثر تشبیہیں اور استعارے ہندوستانی سماجی زندگی ہی سے لیے گیے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مقامی رنگ پیدا کیا جا سکے۔ مثلاً شاہ برہان نے اس شعر میں :

تماری بانس نت جو بانسری ہے ٭ ہماری بانسری یہ سانسری ہے

نہ صرف ہندوستان کے دیہی سماج سے استعارہ لیا ہے۔ بلکہ اسی استعارے کی مدد سے ہندوستان کی قدیم ترین تہذیبی روایات کو بھی اپنا لیا ہے۔ اسی طرح : چکی نامہ : وغیرہ کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔

اسی دور کی تصانیف کی پانچویں اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان تصانیف نے ہندوستانی عوام کی ذہنی اور باطنی اصلاح میں بہت بڑا حصہ لیا۔ اور ایک طرح سے ارسطو کے کتھارسس (Catharsis) یعنے تزکیہ نفس کا کام کیا۔ سعدی کی گلستان کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ سعدی نے اخلاق کی اچھائیوں کی تلقین کی تھی۔ اس دور کے مصنفین نے بھی بیش بہا اخلاقی درس دیئے اور انسان کو انسانیت کا پیغام دیا۔ مل جل کر رہنے کی تلقین کی۔ عربی۔ فارسی اور سنسکرت کے علاوہ ہندوستان کی دوسری بولیوں کے ادب سے بھی ان ساری روایات کو لیا جو ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ انھوں نے انسان کو اعلیٰ اقدار کی طرف مایل کرنے کی کوشش کی۔ یعنی مادیت کی بجائے اعلیٰ روحانیت کا سبق پڑھایا۔

اس کے باوجود یہ سبق اس ایرانی تصوف کی طرح کی افیون نہ تھی جس نے بقول علامہ اقبال ایرانی قوم کی قوت عمل مفلوج کر دی تھی۔ ان کے ہندوستانی ادب نے عوام میں نئی امنگیں اور نئے

Hanif Razvi

ارادے پیدا کیے اور ایک نئے معاشرے کو جنم دیا جس میں ہندوستانی مزاج کے ساتھ عرب۔ ایران ترکستان اور افغانستان کے عناصر بھی گھل مل کر ایک وحدت بنانے لگے تھے۔

اس نوخیز زبان میں جو "ہندی" "ہندوی" یا "دکھنی" کہلاتی تھی۔ ہندو مسلم دونوں مزاجوں کی خصوصیات جذب ہو رہی تھیں۔ مثلاً

۱۔ جہاں اس میں رومی اور غزالی کا "حرکی فلسفہ" شامل ہو گیا تھا وہیں گوتم بدھ اور شنکر آچاریہ کی "سکونیت" کا پرتو بھی باقی رہا۔

۲۔ ابتداءً میں نظم میں ظاہری طور پر بیان کا تکنیکی پہلو یا بیان کے سانچے بھی خالص ہندوستانی تھے کیونکہ ابتدائی دور میں اکثر نظمیں ہندوستانی بحروں ہی میں لکھی گئیں۔ تاہم فارسی بحروں کی وجہ سے ایک مستحکم امتزاج کا آغاز ہو چکا تھا۔

۳۔ سنسکرت ویدانت کے الفاظ بھی بڑی بے تکلفی سے استعمال کیے گئے۔ جیسے آکار نراکار وغیرہ۔

۴۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان مصنفین کے ہاں الفاظ کے اوزان صوتی اثرات پر رکھے گئے۔ الفاظ کے تلفظ میں عوامی بول چال کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے جس کا اس دور کے مصنفین نے خاص طور پر خیال رکھا۔ مثلاً نفع۔ کو نفا۔ وضع کو وزا وغیرہ جو آوازیں ان کے تلفظ اور املا میں چھوڑ دی گئی ہیں وہ وہی ہیں جنھیں ہندوستانی صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔

۵۔ اسالیب میں بھی بڑی حد تک "ہندوستانیت" تھی مثلاً عورت کی طرف سے اظہار عشق۔ تصوف کے مسائل کو عورت کا میکہ اور سسرال کی اصطلاحوں میں سمجھانا جو "بھکتی۔ ویدانت" طور (BHAKTI-CUM-VEDANTA ATTITUDE) ہے نیز "استری بھاؤ" یا عورتوں کی جذبات نگاری اختیار کی گئی جو خالص ہندوستانی طریقہ ہے۔

۶۔ اس کے علاوہ تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں میں بھی "ہند ایرانی" تہذیب کا گہرا امتزاج نظر آتا ہے۔

اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم "مذہبی" ادب اپنے دامن میں بہت سے جواہر لیے

Hanif Razvi

ہوئے ہے۔ جن پر اہلِ تحقیق کی نظریں نہ پڑسکی تھیں ان مجتہدین کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اُردو نثر کو اس نہج پر لاڈالا جس کے نتیجہ کے طور پر اس میں ہر قسم کے مضامین کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہو سکی۔

ان بزرگوں نے اپنی تحریروں میں فنی اور جمالیاتی قدروں سے زیادہ اخلاقی تلقینی قدروں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا۔ یہ سچ ہے کہ کوئی بھی آرٹ اس وقت تک انسانی روح کی تسکین نہیں کرسکتا جب تک وہ اخلاقی عناصر کا حامل نہ ہو۔ : ٹالسٹائی : اپنی ۱۸۹۶ء کی ڈائری میں لکھتا ہے۔ :

: انتہائی جمالیاتی کیف ہمیں کبھی پوری تسکین نہیں بخشتا۔ انسان اس کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے وہ مکمل تسکین صرف اس چیز سے پاتا ہے جو اخلاقی حیثیت سے اچھی ہو اور یہ خصوصیت اس دور کی سب ہی تصنیفوں میں پائی جاتی ہے

Hanif Razvi

(۸)

قدیم نثر کا شاہکار

(سب رس)

ادب کے ارتقا کے لیے سازگار فضا ۔ نثری قصوں کی ابتدا ۔ پہلا نثری قصہ ۔ ۔ سب رس: وجہی کے حالاتِ زندگی ۔ تصانیف: قطب مشتری: اور اس کا ادبی پایہ ۔ ۔ سب رس: ایک ادبی کارنامہ ۔ زمانہ ۔ ۔ سب رس: نام کے مضمرات ۔ سب رس: کے ماخذ اور مماثلات ۔ مقاماتِ تصوف ۔ تمثیلوں سے مقابلہ ۔ ۔ سب رس: عشقِ حقیقی کی تمثیل ۔ ۔ سب رس: عشقِ مجازی کی تمثیل ۔ کردار: حُسن ۔ دِل ۔ معاشرت پر تنقید ۔ اسلوب ۔ مقفیٰ مسجع طرز ۔ عربی فارسی الفاظ کہاوتوں کا استعمال ۔ ادبی خوبیاں ۔

Hanif Razvi

۸

قدیم نثر کا شاہکار

(سب رس)

گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) اُردو زبان اور ادب کی ارتقا کے لیے بڑی سازگار رہی کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کے چنگل سے آزاد ہو کر امن وچین کے عہد میں داخل ہوا۔ شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کی بنیادیں استوار ہوئیں تو دکن میں عادل شاہیہ اور قطب شاہیہ سلطنتوں کو استحکام نصیب ہوا۔ ادب اور فنونِ لطیفہ کے پروان چڑھنے کی یہی رت ہوتی ہے۔ ہندی ادب میں بھی یہ دور ، رتی کال: یعنی خوش حالی کا دور کہلاتا ہے۔ اس سے پہلے کا دور جو اُردو ادب میں صوفیائے کرام کے کارناموں کا دور ہے ہندی میں بھی ، بھگتی کال : یعنی سنت اور صوفیوں کے ادب کا دور تھا۔ ہندوستان کے عوام نے اگلے دور کے سیاسی لسانی اور تہذیبی انتشار سے گھبرا کر مذہب کے دامن میں ڈھونڈلی تھی۔ دو تہذیبوں کی آویزش کے بعد یہ زمانہ سکون اور اطمینان کا زمانہ تھا سچ تو یہ ہے کہ اسی دور میں ہندوستان کے مصنفین اور شعرا نے ادب کے ذریعے ہم آہنگی یکجہتی اور انسانیت کا بڑا اعلیٰ آدرش پیش کیا۔ ایسا آدرش جو اب بھی مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ابھی تک ادب صرف مذہب کا ترجمان تھا جب سیاسی اور تہذیبی شکست و ریخت سے مہلت ملی تو ذہنی عیش کوشی کے جذبات پرورش پانے لگے اور ادب جذباتِ انسانی کا مفسر اور اظہار کی لطافتوں کا مظہر بھی بننے لگا۔ یہیں سے قصے کہانیوں کی ابتداء ہوتی ہے۔ مذہب کے خشک موضوع سے ہٹ کر قصے کہانیوں کی دلچسپیوں نے شعرا اور مصنفین کے دامن دل کو کھینچا

اور اظہار کے سانچوں میں فنی پہلو اجاگر ہونے لگے۔ شعر اور قصے کو جوڑ کر منظوم داستانیں تیار کرنے کا آغاز اس صدی کی ابتداء سے ہو چکا تھا۔ گیارھویں صدی کے ربع اول کے بعد سے نثر میں بھی قصے اور داستانیں لکھی جانے لگیں۔

منظوم قصوں میں جو اس وقت لکھے جا چکے تھے: سیف الملوک و بدیع الجمال: اور: طوطی نامہ: کو کافی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ ان قصص میں طبع زاد بہت کم تھے۔ زیادہ تر فارسی عربی اور سنسکرت کے ترجمے یا چربے تھے۔ اس دور میں فارسی کے ترجمے بہت زیادہ ہوئے اور کوشش کی جانے لگی کہ اردو فارسی کے مدمقابل بن جائے۔ اس کے پس پردہ سیاسی مضمرات بھی کام کر رہے تھے۔ شمال میں فارسی سرکاری زبان تھی۔ دکن کی سلطنتوں نے دیسی یا نوزائیدہ زبان کی سرپرستی کی۔ یہاں تک کہ عادل شاہیہ اور قطب شاہیہ درباروں نے اردو کو درباری زبان کے رتبہ تک ترقی دے دی [۱]۔ چنانچہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں وجہی۔ نصرتی۔ غواصی اور ابن نشاطی کی قدر افزائی اس کی دلیل ہے۔

نثری قصوں میں وجہی سے پہلے لکھے ہوئے نثری قصے اب نایاب ہیں۔ لیکن وجہی کا نشو نما پایا ہوا آرٹ اور اس کی زبان شہادت دیتی ہے کہ یہ نقش اول نہیں ہو سکتا۔ وجہی کے قصے کتاب دل کی تفسیریں ہیں نظم اور نثر دونوں میں۔

نظموں میں وجہی کی: قطب مشتری: پہلی طبع زاد نظم ہے جس میں مصنف نے اپنی ہی دور کے ایک عظیم عشقیہ واقعہ کی ترجمانی کی ہے۔ اس قصہ میں دوسری زبانوں کی دریوزہ گری نہیں کی گئی ہے۔ نثر میں اس کی تصنیف: سب رس: مواد اور ہیئت ہر اعتبار سے قدیم اردو ادب کا شاہکار ہے۔

---

[۱] : تاریخ فرشتہ: (جلد دوم، صفحہ ۲۷) میں لکھا ہے۔ :

: ابراہیم عادل شاہ دفتر فارسی کہ بجائے دفتر ہندی جدو پدر او قرار دادہ بودند برطرف نمودہ۔ بدستور سابق ہندوی مقرر نمود :

خافی خان (: منتخب اللباب: جلد سوم صفحہ ۳۰۷) اور ابراہیم زبیری نے (بساتین السلاطین ص ۴۹) بھی اس کی توثیق کی ہے۔

Hanif Raza

حالاتِ زندگی

وجہی کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔ قدیم ادب کے اب تک جتنے بھی تذکرے یا تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کی زندگی کے حالات درج نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اتنا بڑا شاعر تھا کہ اسے کوئی تذکرہ نگار فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وجہی کی شخصیت قدیم دور کے شعرا میں سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ نہ صرف اچھا شاعر تھا بلکہ اپنے زمانے کا اور شاید سارے زمانوں کا بہترین نثر نگار بھی۔ اس نے جہاں طویل نظم میں: قطب مشتری: جیسا کہ طبعزاد کارنامہ چھوڑا وہیں اس کی شاعری کے پائے کا بہ حیثیت مجموعی اندازہ لگاتے ہوئے اس کی ان غزلوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو: قطب مشتری: میں اور اس کے نثری شاہکار میں جا بجا بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ اسی طرح اس کی رباعیاں اور قصیدے بھی اُردو ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ نثر میں تو اس کا کارنامہ مواد اور ہیئت ہر لحاظ سے کم سے کم قدیم دور کے نثری کارناموں میں سب سے: قد آور: نظر آتا ہے۔

بعض تذکروں اور تاریخوں میں وجہی کے جو حالات درج کیے گیے ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سب سے عجیب بات اس سلسلہ میں قابل ذکر یہ ہے کہ حکیم شمس اللہ قادری نے: اردوئے قدیم: کے پہلے ایڈیشن میں سرے سے وجہی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس عرصہ میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے اس کی: قطب مشتری: اور: سب رس: کے شائع ہونے کے بعد حکیم صاحب نے : اردوئے قدیم: کے تیسرے ایڈیشن میں وجہی کا کچھ حال شامل کر دیا وہ لکھتے ہیں:

: وجہی بھی اسی عہد میں گزرا ہے۔ اس نے محمد قلی کی وفات سے دو سال قبل ۱۰۱۸ھ کے حدود میں ایک مثنوی لکھی ہے اور اس میں مشتری کے ساتھ خود بادشاہ کے عشق و محبت کے حکایات بیان کیے ہیں:۔ [۲]

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورنے: اردو شہ پارے: میں وجہی کے جو حالات لکھے ہیں انکا ماخذ زیادہ تر خود وجہی کی تصنیفات ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے

---

[۱] اُردو شہ پارے صفحہ ۹۶

[۲] اردوئے قدیم (طبع سوم) صفحہ ۶۳

Hanif Razvi

کہ اس کی مثنوی سے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے لے:-

حکیم شمس اللہ قادری ۔ مولوی عبدالحق اور نصیر الدین ہاشمی سب نے وجہی کے ساتھ "ملّا" کا احترامی لقب بھی لگادیا ہے اور اس کا ماخذ غالباً نظام الدین کی تصنیف "حدیقۃ السلاطین" ہے جس میں وجہی اور غواصی کے معرکوں کا ذکر کرتے ہوئے وجہی کے ساتھ ملّا کا لفظ احتراماً استعمال کیا گیا ہے ۔ یہ اس زمانے کے اکثر علماء کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا تھا چنانچہ ظہوری جو وجہی سے قریبی زمانے میں دکن میں موجود تھا اس کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مورخین نے اسے بھی ملّا کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ یہ لفظ احترام کا اظہار کرنے کے لیے مخصوص معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم وجہی کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں اور خاص طور پر "سب رس" میں عربی اور فارسی کے علاوہ حدیث اور قرآن کی معلومات میں جس مہارت کا اظہار کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہیں تو وجہی کو ملّا کے لفظ سے متصف کرنا کچھ غلط بھی نہیں معلوم ہوتا۔

وجہی کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی صاحب نے لکھا ہے :

"ابراہیم قطب شاہ کے زمانے سے اس کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے"۔ ۲ے

اگر یہ تحقیق صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وجہی کی شاعری ابراہیم کی وفات سنہ ۹۸۸ھ سے پہلے شروع ہو چکی تھی اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ سنہ ۹۸۸ھ میں وجہی کی عمر پندرہ یا بیس سال کی تھی تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی پیدائش سنہ ۹۶۰ھ یا ۹۶۵ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نے "قطب مشتری" سنہ ۱۰۱۸ھ میں یعنی محمد قلی قطب شاہ (سنہ ۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے انتقال سے دو سال قبل لکھی۔ وجہی کے بارے میں اکثر تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عبداللہ قطب شاہ (سنہ ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے زمانے تک زندہ رہا۔ اور اس واقعہ کی شہادت خود اس کے نثری کارنامے "سب رس" سے بھی ملتی ہے جو سنہ ۱۰۴۵ھ میں لکھا گیا تھا۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وجہی کا انتقال

لے : یورپ میں دکھنی مخطوطات ، صفحہ ۲۷

۲ے : دکن میں اردو ، (طبع چہارم) صفحہ ۴

Hanif Raza

: سب رس : کی تکمیل کے فوراً بعد ہی ہوگیا تو ان سنین کے حساب سے انتقال کے وقت اس کی عمر ۸۰ یا ۸۵ برس کی ہوتی ہے۔

: قطب مشتری : کی تصنیف کا ۱۰۱۸ھ مسلمہ سنہ ہے۔ یہ عہد محمد قلی کی حکومت کا تھا۔ : قطب مشتری : میں ابراہیم قطب شاہ کی مدح کے بارے میں یہ کس طرح مانا جا سکتا ہے کہ وہ بادشاہ وقت کی مدح ہوگی۔ لہٰذا یا تو : قطب مشتری : کے سن کو غلط ماننا پڑے گا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابراہیم قطب شاہ کی مدح جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے : قصہ کے تعلق کسے ہے نہ کہ شاہ وقت ہونے کے لحاظ سے[۱] : لیکن : قطب مشتری : کی تصنیف کے سنہ کے بارے میں سب سے زیادہ مستند بیان خود مصنف کا ہو سکتا ہے اور وجہی نے ایک شعر میں اس کی تصنیف کا ۱۰۱۸ھ بتایا ہے۔ شعر حسب ذیل ہے :-

تمام کیا دیس بارا منے   سنہ ایک ہزار ہور اٹھارا منے : [۲]

غرض بجز اس کے کہ مطبوعہ نسخہ کے خاتمہ کے اشعار کو الحاق تصور کیا جائے ہم ۱۰۱۸ھ کو : قطب مشتری : کی تصنیف کا زمانہ ماننے پر مجبور ہیں۔

ہاشمی صاحب کا بیان اس صورت میں بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ : قطب مشتری : کی تصنیف کے وقت وجہی کی عمر تیس سال کی ہوگی تو اس کی ولادت کا ۹۸۸ھ ہوتا ہے۔ جو ابراہیم کی وفات کا سنہ ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص پیدا ہوتے ہی شعر کہنے نہیں لگتا۔

وجہی کے سنہ پیدائش اور اس کی شاعری کے آغاز کے زمانے کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں ہو سکتی ہیں لیکن ایک بات یقینی ہے کہ محمد قلی کے تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی اس کی قسمت کا ستارا چمکا محمد قلی کے تخت نشین ہونے کے تیس سال بعد اس نے : قطب مشتری : لکھی لیکن اس مثنوی کے پورے واقعات کو تخیل کے ذریعہ زندہ کرنے والا ذہن بڑا ہی پیچیدہ اور فنکار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو محمد قلی کی بادشاہت کے زمانے میں اس کو

---

۱ ؎

۲ ؎ : قطب مشتری : صفحہ ۱۰۱

شہزادے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف اس کے باپ ابراہیم قطب شاہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ اس وقت حکمران رہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :

:: ابراہیم قطب شاہ راجہ دھیراج
شہنشاہ شاہان میں اچتے ہین آج ::

بادشاہ کی مدح لکھنے کا یہ انداز شاید فارسی اور اردو کی شاہ وقت کی مدح نگاری کی رسم کے بالکل خلاف اور اپنی آپ نظیر ہے۔

وجہی کے علم وفضل اور ذوق شعر وادب پر اس کی مثنوی اور اس کے نثری کارنامے سے بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ وہ عربی سے واقف تھا۔ فارسی میں دستگاہ رکھتا تھا۔ اور شاعری میں تو اس کا وہی انداز تھا۔ جو میر کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا ۔۔۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا

وجہی نے : قطب مشتری : میں شرح شعر کے عنوان سے شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ شاید قدیم ادب میں ایک انوکھی چیز ہے۔ اس پائے کی کوئی چیز حالی کے مقدمہ سے پہلے مشکل سے دستیاب ہو گی۔ اس کی شرح شعر میں تنقید شعر کے بعض ایسے پہلو نکلتے ہیں جو ہر زمانے کے لیے نصب العین کا کام دے سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتا ہے :

:: جو بے ربط بولے تو ن بیتاں پچیس ❊ بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس ::

پھر وہ کہتا ہے :

:: سلاست نہیں جس کیرے بات میں ❊ پڑیا جائے کیوں جڑنے کر ہات میں ::

ملٹن نے اچھے شعر کی تین خصوصیات بتائی ہیں۔ صداقت، سادگی، اور تاثر یا جوش وجہی کی شرح شعر کے لحاظ سے سلاست۔ معنی کی بلندی۔ اثر منتخب لفظوں کا استعمال اچھے شعر کے ضروری لوازم ہیں۔

وجہی کی قدر و منزلت نہ صرف دربار میں بلکہ دربار سے باہر عوام میں بھی کافی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے روّیے میں : ادبی امارت : (Literary Aris-
-tocracy-)

کی وہ خوبی پیدا ہو گئی تھی جس کا اظہار وہ نظم و نثر دونوں میں کرتا ہے۔ بعض وقت اس کو اپنے فن پر اتنا ناز ہوتا تھا کہ وہ ادب میں کسی کو اپنا ثانی ماننے کے لیے تیار نہیں نظر آتا۔ وجہی کا اپنے کلام کی قدر دانی کے لیے گزرے ہوئے شاعروں میں فیروز اور محمود کو یاد کرنا اس کی اس پیچیدہ نفسی کیفیت پر روشنی ڈالتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے صاحبانِ فن میں سے کسی کو اپنے فن کی قدر دانی کر سکنے کا اہل بھی نہیں سمجھتا تھا۔

اِس ذہنیت کا آدمی کبھی اپنے زمانے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ یہی چیز ہم کو وجہی کے کلام سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً آخری زمانے میں جب محمد قلی کے جانشین محمد قطب شاہ نے غواصی کی قدر افزائی کی تو وجہی کو بہت برا لگا۔ چنانچہ وہ اپنے زمانے کے شعرا میں خاص طور سے غواصی کو اپنے زہر میں بجھے تیروں کا ہدف بنانے کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔

لیکن جس انداز میں اس نے غواصی پر ایزاد کیے ہیں اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح غالب کو : استاد شہ سے پرخاش : کا خیال نہیں آ سکتا تھا اسی طرح محمد قطب شاہ کے منظورِ نظر شاعر پر کھلے طور پر چوٹیں چلنے کی وجہی میں تاب و طاقت نہ تھی۔ جس کی وہ ذو معنی اشعار میں تعریفیں لکھتا ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہو گا۔

اگر غوطے یک برس غواصی کھائے   تو یک گوہر اس دھات امولک نہ پائے
یو موتی نین وہ جو غواص پائیں   یو موتی ہیں وہ جو کسی ہات آئیں

عبداللہ قطب شاہ جب تخت نشین ہوا تو وجہی کی دبی ہوئی شہرت کو کچھ عرصہ کیلیے افاقہ سا نصیب ہوا۔ عبداللہ غواصی کو جو اس کے پیش رو کے عہد میں دربار میں اہمیت حاصل کر چکا تھا نظر انداز تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے پرانے شاعر وجہی کو بھی نہیں بھلایا۔ چنانچہ تخت نشین ہونے کے بعد چھ برس بعد جب اس کے گھر لڑکے کا تولد ہوا تو غواصی اور وجہی دونوں نے تاریخ ولادت نکالنے کی کوشش کی۔ غواصی نے جیسی مختصر مفید مگر نثری انداز میں تاریخ: محفوظ باد: نکالی تھی۔ اس سے اس کے دربار میں اپنے اثر کے بارے میں الیقان کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں وجہی نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نکالنے میں اپنی ساری فنکارانہ صلاحیتوں

کو بازی پر لگا دیا جب کہیں جاکر : آفتاب از آفتاب آمد پدید : جیسی بے مثل تاریخ اس کے ہاتھ آئی۔

یہ سنہ ۱۰۴۱ھ کا واقعہ تھا۔ یہ تاریخ دراصل وجہی کی فنی صلاحیتوں کے اپنے معراج کی طرف ترقی کی رفتار کی غمازی کرتی ہے چنانچہ اس کے تین سال بعد اس نے : سب رس : لکھی ایک سہانی صبح عبداللہ قطب شاہ کا حکم اس کے پاس پہنچا۔ اس کی تفصیل خود اسی کی زبان سے زیادہ لطف دے گی۔ وہ کہتا ہے :

: صباح کے وقت بیٹھے تخت بکایک غیب تے کچہ امنر پا کر دل میں اپنے کچھ لیا کر وجہی نادا من کون دریا دل گوہر سخن کون۔ حضور بلائے پان دیئے ہور بہت مان دیئے۔ ہور فرمائے کہ انسان کے وجود بیچہ میں کچھ عشق کا بیان کرنا اپنا ناون عیان کرنا۔ کچہ نشان دھرنا وجہی بھوگنی گون بھریا۔ تسلیم کر کر سر پر ہات دھریا۔ ہوت بڑا کام اندیشا ہوت بڑی فکر کریا۔ بلند ہمتی کے بادل تی دانش کے میدان میں گفتار ان برسایا قدرت کے اسراران برسایا۔ بادشاہ کے فرمانے پر چینتیا نوی تقطیع بیتا۔ کہ آنگے کہ آن ہمارے ہمیں بھی کچہ تھے کر سمجھیں :

وجہی کو اپنے فن کی عظمت کا جتنا احساس تھا اتنا ہی اپنی شہرت کو اسی بلندی پر برقرار رکھنے کا بھی اسے بڑا خیال تھا۔ اور یہ احساس اس کے سارے کارناموں میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔

سنہ ۱۰۴۴ھ کے بعد وجہی کا کہیں نام نہیں سنائی دیتا۔ طبعی طور پر اگر وہ مرا بھی نہ ہو تو ادبی حیثیت سے وہ دنیا کے لیے مر چکا تھا۔

تصانیف

ابھی تک وجہی کی صرف دو تصانیف کا حال معلوم ہو سکا ہے ان میں سے : قطب مشتری : منظوم داستان ہے اور : سب رس : اس کا نثری شاہکار۔ لیکن گارساں دتاسی نے وجہی کی ایک تیسری تصنیف : قصہ ماہ سیما و پری رخ : کا ذکر بھی

اپنے خطبات میں کیا ہے وہ لکھتا ہے :

: علاوہ ان منظوم فسانوں کے جو مقبول عام قصوں سے لیے گیے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے ہیرو غیر معروف ہیں ہندوستانی میں ایسے قصے بکثرت ہیں۔ اور اکثر مشہور ہیں۔ جن میں سے چند کا ذکر کرتا ہوں۔ قصہ بلند اختر جو میر خان نے لکھا ہے۔ اخوان شاہ میں اس کے دو نسخوں سے واقف ہوں۔ ایک تو : چندر بدن ماہ یار : جس کے کئی نسخوں کا مجھے علم ہے اور دوسرا : دِل آرام اور دلربا : جس کے مولفوں میں ایک منتی رام ہے۔ : پری رخ و ماہ سیما : جس پر وجہی نے ایک مثنوی لکھی ہے :[۱]

پروفیسر سید مسعود حسن علی نے : جائزہ زبان اُردو : میں لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ محمد حفیظ صاحب الہ آبادی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

تاج الحقایق

ان تین کے علاوہ مولوی عبدالحق نے وجہی ہی کی تصانیف میں : تاج الحقایق : کو بھی شمار کیا ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

: وجہی قدیم دکھنی اُردو کا بہت بڑا ادیب گزرا ہے۔ اسے نثر اور نظم دونوں پر بڑی قدرت تھی۔ اب تک اس کی تین کتابیں دریافت ہوئی ہیں ایک : سب رس : جو اس سے قبل انجمن کی طرف سے شایع ہو چکی ہے ایک دوسری کتاب : تاج الحقایق : ہے اور وہ بھی نثر میں ہے تیسری یہ مثنوی جو : قطب مشتری : کے نام سے موسوم ہے :[۲]

تاج الحقایق پر بحث پیچھے صفحات میں گزر چکی ہے۔

قطب مشتری

وجہی کا منظوم کارنامہ ہے تاہم اس کے مطالعے سے وجہی کے اندازِ فکر کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ پروفیسر سروری : اُردو مثنوی کے ارتقاء

---

[۱] : خطبات گارساں دتاسی ؛ صفحہ ۱۵۹
[۲] : مقدمہ قطب مشتری ؛ " ۱

میں لکھتے ہیں :

"وجہی کی انشاپردازی کی طرح اس کی شاعرانہ قابلیت بھی بے مثل تھی" [۱]

اور اس بیان کی کچھ دلیلیں بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس مثنوی کو پڑھ کر وجہی کی غالب جیسی "جدت فکر" اور میر جیسی خود اعتمادی کا احساس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے "قطب مشتری" کو اپنے ہم عصر کارناموں میں خاص مقام حاصل ہے۔ چنانچہ وجہی خود بھی اپنے کمال سے باخبر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے یہ شعر محض تعلی کی خاطر نہیں لکھے تھے۔

"تیرا شعر سن جی پگھلتا ہے یوں
کہ پانی تے ایلوچ گلتا ہے یوں
تو وجہی کہیا شعر کئی دھات کا
ہوا نیا ست تجہ تے مزا بات کا"

میر کی طرح جس نے کہا تھا :

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد انگیز انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ روے گا

وجہی کو بھی اپنی انفرادیت کا احساس ہے۔ دوسرے شعرا کی طرح چبائے ہوئے نوالے کھانا اسے ناگوار تھا۔ دوسرے شعرا کے کارنامے وجہی کی طرح طبعزاد نہیں مستعار ہیں مثلاً غواصی نے "سیف الملوک و بدیع الجمال" میں "الف لیلیٰ" کے ایک افسانے کو منظوم کیا ہے۔ ابن نشاطی نے فارسی مثنوی "بساتین" کو "پھول بن" کا جامہ پہنایا۔ لیکن ان کے برخلاف وجہی نے ایک نئی چیز پیش کی۔ اس نے "قطب مشتری" میں "در شرح شعر" کے عنوان سے اچھے شعر کی پرکھ اور شعر گوئی کے چند اصول بھی بتائے ہیں۔ اس کے خیال میں شعر کی سب سے بڑی خوبی "جدت ادا" ہے اس خصوص میں اس کی ذہنیت غالب سے ملتی جلتی ہے۔ "قطب مشتری" کئی حیثیتوں سے

---

[۱] : اُردو مثنوی کا ارتقاء صفحہ ۶۵

Hanif Razvi

اہمیت رکھتی ہے۔

۱۔ اس کے بیان میں درد واثر ہے جو اسے دوسری مثنویوں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ اثر اس کی حقیقت نگاری کا نتیجہ ہے۔ دوسری مثنویوں جیسے : لیلیٰ مجنوں : : سیف الملوک بدیع الجمال: وغیرہ کی طرح اس کے کردار خیالی دنیا سے تعلق نہیں رکھتے جن کی تصویر کشی میں تخئیل ہی تخئیل ہو۔ قصہ کو بڑھانے اس کے سامنے جیتے جاگتے کردار محمد قلی اور بھاگ متی کے موجود تھے اور جیسا کہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ ان ہی کی داستانِ محبت کی اس نے شاعرانہ ترجمانی کی ہے۔[1]

۲۔ : قطب مشتری : کی زبان بہ نسبت اگلے شعرا کے سلیس اور صاف ہے اسمیں جگہ جگہ شاعر کی قدرتِ بیان کے نمونے نظر آتے ہیں۔ مثنوی میں اکثر مقامات پر جذبات کی ترجمانی اس نے نفیس غزلوں کے ذریعہ کی ہے۔ یہ غزلیں زبان کی گھلاوٹ کے سبب عمدہ گیت بنگئے ہیں۔

۳۔ وجہی کو منظر کشی میں بھی بڑی دستگاہ تھی جس کا ثبوت جگہ جگہ ملتا ہے مثلاً جہاں : عطارد : کے : مشتری : کے محل کو آراستہ کرنے کا بیان ہے وجہی نے اس آرائش کی تفصیل میں پورا زورِ قلم صرف کردیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نقاشی کی تصویر ہمارے سامنے موجود ہے۔ مثلاً :۔

کہیں بن بیابان کہیں سمدر پہاڑ ۔۔۔ کہیں مرغ ماہی کہیں پھول جھاڑ
کہیں شیر شرزا کہیں گج ترنگ ۔۔۔ کہیں باز بحری کہیں یک کلنگ
کہیں بت بجانے ہور بت پرست ۔۔۔ کہیں نار ہور پرش یک ٹھا رست
کہیں شاعراں شعر کہتے رہیں ۔۔۔ کہیں چشمے امریت کے بہتے رہیں :۔[2]

یعنے عطارد نے محل کی دیواروں پر قسم قسم کے نقش بنائے کہیں جنگل بیابان کا منظر پیدا کیا ہے تو کہیں سمندر اور پرند چرند کی تصویریں بنائی ہیں۔ کس جگہ شاعروں کو شعر پڑھتے دکھایا ہے تو کہیں چشمے بہتے بتائے۔

---

[1] دیباچہ قطب مشتری ۔۔۔ صفحہ (۱)
[2] قطب مشتری ۔۔۔ صفحہ (۷۳)

۴۔ جذبات نگاری میں دورِ قدیم کے بہت کم شاعر وجہی کے پایہ کو پہنچ سکے ہیں خصوصاً نسوانی جذبات کو وہ خوب بے نقاب کرتا ہے۔ "قطب مشتری" میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں شہزادہ "مشتری" کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس وقت "مشتری" کی بے تابی اور بیقراری کو جس طرح وجہی نے بیان کیا ہے وہ ادب میں کمیاب ہے۔ کبھی تو وہ اپنی حالت زار بیان کرتی ہے۔ کبھی اندیشہ مند ہے کہ قطب کسی دوسری عورت کے جال میں نہ پھنس گیا ہو یہ انگ ہندی یا ہندوستانی شاعری کا مخصوص موضوع ہے۔ فارسی میں اس طرح کے نمونے نہیں ملتے۔ وجہی کا انداز ایسے موقعوں پر ٹھیٹھ ہندوستانی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی عورت محبت کے آگے بڑی سے بڑی چیز کی پرواہ نہیں کرتی حتیٰ کہ جان تک دیدینے تیار ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے محبوب سے بھی اسی قربانی کی متوقع رہتی ہے۔ اسے محبوب کے صفات سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ صرف ذات کی طلب گار ہوتی ہے یہ بے لوث محبت کی انتہا ہے۔ کیونکہ صفات سے محبت ہو تو صفات کے زوال کے بعد محبت کے زوال کا بھی احتمال رہتا ہے۔ برخلاف اس کے ذات سے محبت ہو تو محبوب کا ہر روپ "سروپ" معلوم ہوتا ہے۔ "مشتری" بھی "قطب" سے اس وجہ سے محبت نہیں کرتی کہ وہ شہزادہ ہے چنانچہ ایک موقع پر وہ شہزادے پر طعن کرتی ہے۔

محبت میں جو نیاست سو نیاست ہے
کہی بات میں راست ہور راست ہے

(یعنے محبت میں جو بڑا ہے وہی دراصل بڑا ہے۔ میں نے یہ سچی بات کہی اور یہ سچ ہے)

۵۔ "قطب مشتری" میں کئی مقام ایسے آتے ہیں جو اسے اپنے عصر کی دوسری مثنویوں میں ممتاز کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق اس مثنوی کی عظمت کے زیادہ معترف نظر نہیں آتے۔ تاہم وہ بھی یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکے کہ "اس میں بعض باتیں بڑی خوبی کی ہیں" [1]

سب رس

وجہی کی "قطب مشتری" کے ادبی پایہ کے بارے میں ممکن ہے اختلاف رائے کی گنجائش ہو لیکن اس کا نثری کارنامہ "سب رس" قدیم ادب کا مسلمہ شاہکار ہے۔

[1] دیباچہ "قطب مشتری" صفحہ ( )

Hanif Razvi

: مثالیہ قصہ : (Allegory) کی پیچیدہ تکنیک اور اسلوب بیان ہر اعتبار سے یہ کارنامہ اس سے پہلے کے سارے نثری کارناموں پر اور شاید بعد کے بہت سے کارناموں پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ : سب رس : کی طرح کے بلند پایہ ادبی کارنامے دفعتاً نہیں پیدا ہو جاتے بیان اور اسلوب کو اس درجہ تک ترقی کرنے کے لیے بہت سی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ : سب رس : کے اسلوب کی شروعات : تاج الحقایق : میں کسی حد تک نظر آتی ہیں لیکن اس اسلوب کا کمال : سب رس : میں دکھائی دیتا ہے اور : ٹھیٹ ادب : (Belle-Lettres) کی حیثیت سے یہ تصنیف قدیم اُردو کے ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

وجہی کی تصانیف میں : سب رس : آخری کتاب ہے۔ اس کی تصنیف تک وہ دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اور تلخ و شیریں تجربات کا مزا لے چکا تھا۔ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کا فن اپنے شباب پر تھا۔ فن کار کی زندگی کی دوپہر ڈھل چکی تھی لیکن اس کے فن کا آفتاب : نصف النہار : پر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کونسی بات کیسے کہی جا سکتی ہے اس نے اس تصنیف کے لیے نام بھی خوب تجویز کیا ــــ : سب رس :

"سب رس" نام کے مضمرات

: رس : ہندی میں جذبات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فراق صاحب اپنی رباعیوں کے مجموعہ : روپ : کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

: جذبات کی مختلف کیفیتوں کو سنسکرت میں : رس : کہتے ہیں [1] :

یہ رس مختلف ہیں۔ شرنگار رس۔ ہاسیہ رس۔ ونود رس وغیرہ : سب رس : ان ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی اس میں زندگی کے تمام رس سموے ہوئے ہیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر وی۔ سیتا رامیا نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں : رس : کی حسب ذیل تشریح کی ہے :-

---

[1] دیباچہ : روپ : فراق گورکھپوری

Hanif Razvi

۱۰ رس (ذوق) وہ جوہر ہے جس سے ہم صناعت کے کسی نمونے کو جانچنے پر کھنے اور محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ لذت ذہنی (   ) ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو جذبات اور تناسبات کی ایسی دنیا میں پہنچادیتی ہے جہاں وہ اپنے گردوپیش کے مادی مناظر سے بے خبر ہوکر روحانی تلذذ حاصل کرتا ہے۔ جو مکش نفس مطمئنہ سے مشابہ ہے۔ تعینات سے گزر کر اس کی ہستی فرد کی حیثیت سے ختم ہوجاتی ہے۔ وہ محسوسات کے مطالعہ میں ایسا کھو جاتا ہے کہ ان کا دایرہ وسیع ہوتے ان آفاقی حقایق کا احاطہ کرلیتا ہے جو خود اس کی ہستی کے بنیادی عناصر ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے وہ خود بھی جملہ حیات اور تمام کائنات کا ایک جز بن جاتا ہے۔ ؎۱

ان دونوں تشریحوں کی رعایت "سب رس" میں موجود ہے۔ جہاں اس میں زندگی کے تمام رس مسرت غم رشک مسابقت موجود ہیں وہیں یہ کتاب کچھ دیر کے لیے انسان کو دنیا اور مافیہا سے بے خبر بھی کردیتی ہے اور انسان محسوسات کے دائرہ میں داخل ہوجاتا ہے جس کو وجہی نے "مجسم کردار" بنا دیا ہے۔

ماخذ لیکن ان مجرد تصورات کو کرداروں کا روپ عطا کرنا وجہی کی اپج نہیں جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحق نے تفصیل سے لکھا ہے وجہی سے قبل ایک فارسی شاعر ابن سیبک فتاحی ۸۵۲ھ نے ایک مثنوی "دستور عشاق" ؎۲ کے نام سے لکھی تھی جس کے پانچ ہزار اشعار تھے۔ پھر اس قصے کو مصنف نے "شبستانِ خیال" اور "حسن و دل" کے نام سے الگ الگ بھی لکھا ہے۔

"حسن و دل" نثر میں دستور عشاق کا خلاصہ ہے جو مسجع اور مقفیٰ طرز میں لکھا گیا۔

؎۱ بحوالہ "چھان بین" از جعفر علی خان اثر صفحہ ۲۹۲

؎۲ اس مثنوی کو آر۔ ایس۔ گرین شیلڈس (آئی اے۔ ایس) نے اصل فارسی نسخہ میں ۱۹۲۶ء میں شایع کیا تھا۔

Hanif Raza

صنایع بدایع اس میں خوب استعمال کیے گیے ہیں [1]۔ ڈاکٹر عبدالحق کے بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مثنوی "دستور عشاق" کا یہ نثری خلاصہ یورپ میں تین بار ترجمہ کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ اس کے دو ترجمے علی الترتیب آرتھر براؤن "اور ولیم پرایس نے کیے۔ تیسری مرتبہ جرمن ڈاکٹر روڈالف دوراک نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے مع اپنے عالمانہ مقدمہ اور تنقیدی حواشی کے شایع کیا۔ یورپ کی زبانوں کے علاوہ ترکی میں بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق کا خیال ہے کہ "وجہی" نے "سب رس" میں اسی نثری قصے "حسن و دل" کا چربہ اڑایا ہے۔ یہ نتیجہ انھوں نے اس طرح اخذ کیا کہ وہ مقامات جن کے نثری قصے میں تشریح نہیں وجہی کی "سب رس" میں بھی وہ تفصیلات مفقود ہیں۔

۱۔ مثلاً جب "حسن" و "دل" کی شادی ہوتی ہے تو مثنوی "دستور عشاق" میں فتاحی نے آلات موسیقی کے بڑے پُر لطف اور دلچسپ مناظر پیش کیے ہیں۔ اس کے برخلاف نثر کی کتاب میں یہ نہیں پائے جاتے ہیں۔ وجہی نے بھی ان حصوں کو اپنے نثری کارنامہ میں اڑادیا۔

۲۔ وجہی نے اسلوب میں بھی نثری قصے کی پیروی کی ہے۔ یعنی مسجع و مقفیٰ عبارت کا التزام رکھا ہے۔

لیکن پروفیسر عزیز احمد کا خیال ہے کہ وجہی نے عمداً اس تمثالیہ عشق (Allegory of Love) کو متصوفانہ توجیہہ سے بے نیاز رکھنے کی خاطر بعض حصے اڑادیے۔ مثلاً وہ حصہ جہاں "فقر" کا بیان ہے اور قصے کو قصہ ہی رہنے دیا ہے۔ اس کا سبب مصنف (وجہی) کی "دستور عشاق" سے ناواقفیت نہیں۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"ملا وجہی نے "سب رس" میں یہ ہوشیاری کی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان کی تشریحات کو حذف کر دیا ہے۔ اور تمثالیہ کو تمثالیہ رہنے دیا۔ علامت بندی اور رمز نگاری میں تحلیل نہیں کیا۔" [2]

---

[1] دیباچہ "سب رس" صفحہ ۸

[2] "سب رس: ماخذ اور مماثلات" اردو۔ اپریل ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۰۳

چنانچہ انھوں نے اپنے دعوی کی تائید میں "سب رس" کے خاتمہ سے ایک اقتباس بھی دیا ہے

"پچھین یک دیس دل ہور ہمت ہور نظر تینوں شراب پیے تینو مست بے خبر تماشا دیکھتے دیکھتے رخسار کے گلزار میں آئے۔ دہن آب حیات کا چشمہ پائے۔ وہاں دیکھتے ہیں ایک پیر سبز پوش کلام نہ تار بنا گوش صاحب ہوش۔ اس چشمے پر کھڑا ڈالتا ہے۔ جو کوئی اسے دیکھیا وہ بہلتا ہے دو بیر سو مکڑی کا پلچ۔ بہت خوب دلچ ولچ۔ بہت آلا چاروں طرف ہڑے نور کا اجالا۔ دیکھتیچ جیو جاتا بھی آتا۔ یو دیکھنا عاشق کو بہت بھاتا۔ اگر یو آب حیات یوں جیوتا کرے گا تو ایک بار کیا کہ عاشق ہر روز ہزار بار مریگا۔ آب حیات کا مدد ہر دم آتا ال عاشق کون مرنے کا کیا غم۔ ہو سان سون مرنے آتا۔ ہزار ہزار کچھ فکران کرنے آتا۔ ہمت بولیا دل کون کہ اے دل یہاں کچھ چت دہر۔ اس پیر سون روشن ضمیر سون قدمبوسی کر۔ کہ یو پیر خضر پیغمبر ہے۔ آب حیات کے چشمے ہے دل نے جون ہمت بولیا تھا۔ تیونچہ دوڑ کر اس پیر کی قدم بوسی کیا۔ ادب سون نزدیک بیٹھیا۔ اس پیر کی دعا لیا جو دل کے دل میں راز کا خیال آیا۔ خضر نے بھی انکھیاں سون اونچہ اشارت دکھلایا۔ دل ہور انکھیان سون بات ہوئی دلے وو بات دونوں کے سات ہوئی خضر تے فیض دل کون انپڑیا کہ اپنی مراد کی منزل کون انپڑیا۔ دل نے خاطر قرار کیا گھر دار کیا روزگار کیا۔ دل کو فرزندان ہوئے، فرزندان خردمندان ہوئے۔

اس فرزندان میں کا بڑا فرزند سو یو کتاب لایق قابل مستفید ہر باب۔"

اور اتنا کہہ کر ملا وجہی نے حضرت خضر کی تشریح کو ٹال دیا ہے۔ [1]

عزیز احمد صاحب کی توجیہہ قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ اس سے وجہی کی جدت اور اپچ

---

[1] "سب رس" : ماخذ اور مماثلات اردو۔ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۰۴

بھی اندازہ ہوتا ہے۔ گو اس نے چربہ فتاحی سے اڑایا لیکن نقل کو اصل سے بڑھا دیا۔ یہی وجہ ہے
ں کی داستان فتاحی سے بڑھ گئی ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں جتنے بھی قصہ لکھے گیے
اس بے مثل تصنیف یعنی "سب رس" ہی کے ترجمہ یا اس سے منقول تھے۔

اس قسم کے قصہ۔ نظم اور نثر دونوں میں لکھے گیے ہیں۔ اس کے منظوم ترجمے حسب ذیل
ہیں۔

۱۔ شاہ بیر اللہ مجرمی کی: گلشن حسن و دل: ۱۰۸۶ھ [1]

۲۔ شاہ حسین ذوقی کی: وصال العاشقین: ۱۱۰۹ھ

"سب رس" لکھے جانے کے پچاس سال بعد عہد عالمگیر میں محمد بیدل نے ۱۰۹۵ھ
ں قصہ کو پر تکلف فارسی نثر میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے جدت یہ کی کہ قصے کے اشخاص کو خطابات
ی عطا فرمائے ہیں جس سے تمثیل کا سارا لطف جاتا رہا۔ وجہی کا کمال ہی یہ ہے کہ اس نے
ثیل کو تمثیل رہنے دیا۔ جیسا کہ پروفیسر عزیز احمد نے لکھا ہے:

"تمثالیہ کا اردو میں بڑا نادر نمونہ "سب رس" ہے اس کے بعد اور
نمونے ملتے ہیں مگر وہ اس صنف ادب کا انحطاط ظاہر کرتے ہیں"۔ [2]

سی ادبی شاہکار کے مطالعہ کے دو پہلو ہوتے ہیں:

۱۔ اس کا مواد ۲۔ اسلوب

واد۔ مقامات تصوف

"سب رس" میں تصوف کے مراحل اور عشق کی واردات کو تمثیل کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے یعنے اس میں حکایت
بیان بیک وقت دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ ایک تو ادنی سطح جس کے ذریعہ عام قاری
ی توجہ حاصل کی جاتی ہے اور عشق مجازی کے بیان سے اس کی دلچسپی برقرار رکھی جاتی ہے۔

---

[1] اس کے سنہ تصنیف میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق دیباچہ "سب رس" میں ۱۰۹۶ھ اور ڈاکٹر زور "اردو شہ پارے" میں ۱۱۱۴ھ بتلاتے ہیں۔

[2] "سب رس" ماخذ اور مماثلات: رسالہ اردو (کراچی) جنوری ۱۹۵۰ء

Hanif Razvi

اور دوسرے اعلیٰ سطح جس کے ذریعہ فکر و نظر کی گہرائیوں کو ناپا جاتا اور تصوف کے مقامات و مراحل کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس کے مخاطب اہل بصیرت ہوتے ہیں عام قاری نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ آریائی زبانوں میں ایسے قصے کہانیوں کی کمی نہ تھی جن میں بیان دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ خود ہندوستان کی دیگر زبانوں بالخصوص سنسکرت میں حکایات: کلیلہ دومنہ (پنچ تنتر): سکا شپ تتی وغیرہ جیسے قصے بہت سے تھے جن سے دوسری زبانوں میں قصہ گوئی کا آغاز ہوا۔ لیکن اردو میں: سب رس: سے پیشتر اس قسم کے کسی قصے کا سراغ نہیں ملتا۔

ایک اور امتیاز: سب رس: اور دوسری تمثیلوں میں یہ بھی ہے کہ ان تمثیلوں (پنچ تنتر: کلیلہ دمنہ: کے کردار حیوانات ہوتے تھے۔ ہر حیوان کسی انسانی خصوصیت یا صفت کا مظہر ہوتا تھا۔ اس کے بعد مثالیہ نے اور ترقی کی اور بجائے حیوانی کرداروں کے انسانی کرداروں کو مثالیہ میں استعمال کیا جانے لگا جیسے: پدماوت: وغیرہ۔ پدماوت میں رتن سین اور پدماوتی۔ علاو الدین۔ ناگ متی وغیرہ کردار ہیں لیکن ان کے معنے کچھ اور ہیں شاعر نے: رمز: کے طور پر ان کو استعمال کیا ہے ؎۱۔ : چتوڑ: جسم ہے۔ : راجہ رتن سین: : دل: پدماوتی: عرفان سے مراد ہے۔ : طوطا: رہبر اور مرشد اس کے بغیر خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی: ناگمتی: قصہ میں رتن سین کی دوسری رانی ہے جو دراصل دنیا اور اس کے کاروبار ہیں۔ جس نے اس سے دل لگایا وہ بچ نہ سکا۔ : راگھو سین: شیطان ہے اور سلطان علاو الدین ماسواء اللہ۔ اس طرح عرفانی تعلیم ایک کہانی کے ذریعے دی گئی ہے۔ ؎۲

اس کے برخلاف: سب رس: میں یہ جدت ہے کہ اس کے کردار نہ حیوان ہیں نہ انسان اور نہ ہی اس میں تاریخ کا سہارا لیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے کردار مجرد صفات جیسے حسن۔ عشق۔ دل وغیرہ ہیں۔ ان کے ذریعے مصنف انسانی جذبات کی فلسفیانہ تاویل کرتا جاتا ہے

؎۱: ملک محمد جائسی: از راجندر ناتھ شیدا مضمون مطبوعہ آج کل دہلی
؎۲ انگریزی میں آرتھر اور گول میز کے امرا کی کہانیاں بھی اسی قسم کی ہیں۔

Hanif Razvi

بظاہر ایک دلچسپ تمثیل بھی ہے۔ عشق اور عقل کی کشمکش حیاتِ انسانی کی سب سے دلچسپ کشمکش ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ "سب رس" میں مصنف نے انھیں دو حریف بادشاہوں کے روپ میں پیش کیا ہے جس میں جیت عشق کی ہوتی ہے۔ لیکن عقل کو پھر بھی شکست نہیں ہونے پاتی بلکہ ایک طرح سے جیت عقل کی ہے وہ یوں کہ "عقل" کا بیٹا "دل"، "عشق" کی بیٹی "حسن" سے شادی کر کے اسے مفتوح کر لیتا ہے۔

سچ پوچھیے تو جیسا کہ پروفیسر عزیز احمد اور ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے یہ سلوک و معرفت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کرنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ جو بہت ہی دلچسپ ہے۔ "دل" جو اس داستان کا ہیرو ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں "قلب"[1] ہے۔ "آبِ حیات" جس کی تلاش میں "دل" جاتا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد کے خیال میں "عین شریعت" یا "سخن" ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ صوفیا کی اصطلاح میں "بقا" کا مرتبہ ہے۔ جب بندہ خدا کو بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھ سکتا ہے جب مادہ کی دیوار آڑے نہیں آتی۔ "حسن" کا مفہوم "جلوہ خداوندی" یعنے "حسنِ کامل" ہے۔ جس کی تلاش دل (سالک) کو ہے۔ پروفیسر عزیز احمد نے اس کی تاویل "حسنِ اخلاق" سے کی ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ "حسنِ کامل" ذات باری تعالیٰ ہے۔ "غمزہ" "ابلیس" ہے۔ جو سالک کو معرفت کی راہ سے بھٹکاتا ہے۔ "عشق" "حسن" کا باپ ہے۔ یعنے وہ جس سے "عرفان الٰہی" حاصل ہوتا ہے۔ صوفیا کے پاس "عشق" کی خاص اصطلاح ہے۔ وہ خدا کو محبت یا عشق ہی سمجھتے ہیں۔ "شہر دیدار" صوفیا کی اصطلاح میں "شہود حضرت" یا "دیدار الٰہی" ہے۔ جب بندہ اپنی خودی کو فنا کر کے خدا میں گم ہو جاتا ہے۔ قصہ میں بھی "دل" "شہر دیدار" ہے۔ جہاں "حسن" رہتی ہے دل وہاں جا کر وہاں کے نظاروں میں گم ہو جاتا ہے اس میں "دل" کے چند مددگار اور "حسن" کی چند سہیلیاں ہیں جو "قامت" "خال" "وہم" "غمزہ" "نظر" وغیرہ سے موسوم کیے گیے ہیں۔ "دل" کے مددگار "قامت"

۱؎ ملاحظہ کیجیے "اسٹڈیز ان تصوف" کا تتمہ "ٹیکنیکل ٹرمس ان تصوف" صفحہ ۱۷۷

Hanif Razvi

: ہمت : : غمزہ : ہیں ۔ : قامت : اصل ہیں : طریقِ اعتدال : ہے اور : ہمت : فیض ۔ : غمزہ : عین لطفِ حق ہے جس سے سالک کو عرفان حاصل ہوتا ہے ۔ منفی صفات : وہم : : رقیب : ہیں جو دل : کے مخالف ہیں یعنی سالک کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں ۔ : وہم : : نفسِ وحشت افزا : اور رقیب : نفس دون : ہے ۔ اسی طرح : حسن : کی سہیلیاں : زلف ! : خال : : مہر : ہیں ۔ : زلف : دراصل : حبل اللہ : سے استعارہ ہے ۔ : خال : سے : سواد الوجود : مراد ہے : مہر : مہرالٰہی : ہے ۔ اسی طرح ساری تمثیل میں صوفیا کے عرفانِ الٰہی کو پانے کے مدارج قصے کے پیرائے میں بیان کیے گیے ہیں ۔

لیکن : سب رس : صرف عشقِ حقیقی ہی کی اچھی تمثیل نہیں جیسا کہ پروفیسر عزیز احمد نے بھی لکھا ہے ۔ : عشقِ مجازی : کا بھی بیان ہے جس میں بقول ان کے : ۔

: عاشق معشوق کے خصائص اور علامت لیکر
انہیں مثالی کرداروں میں ڈھالا گیا ہے :

اور جیسا کہ خود : فتاحی : نے جو اس داستان کا مصنف ہے اور جس سے وجہی نے قصہ اخذ کیا ہے اپنے دیباچہ : دستورِ عشاق : میں لکھا ہے ۔

: مطلع و مقطعش حل دقایق عشق بازی می نماید :

: عشقِ شائستہ : یعنی (courtly love) کے یہ بیانات بقول پروفیسر عزیز احمد : قرونِ وسطی کے یوروپی ادب میں بھی عام تھے : اس کی مثال انھوں نے قصہ : رومانِ گل : (Roman Hela Rose) سے دی ہے ۔ ان کے خیال میں : سب رس : اور : رومانِ گل : میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں ۔

پہلے تو یہ کہ دونوں میں آداب و مراحل عشق کا بیان ہے اور دونوں نے اس بیان کے لیے مثالیہ قصہ کی ٹیکنیک استعمال کی ہے ۔ دونوں داستانوں کا مقصد کھوج یعنی ایک خاص قسم کی تلاش ہے ۔ : سب رس : میں یہ : تلاش : : آبِ حیوان : کی ہے آخر میں : آبِ حیوان : کو وجہی نے : کلام : یا : سخن : کا رمز بنا دیا جو انسان کو : حیاتِ جاوید : عطا کرتا ہے ۔

اس میں شک نہیں یہ :عشقِ مجازی: کا بھی بڑا اچھا مثالیہ ہے۔ :محبت: :رشک:
:فراق: :وصال: کے بڑے اچھے مرقعے اس میں ملتے ہیں۔ عام عشقیہ واقعات اور افسانوں کی طرح اس میں محبت کا :ابدی: :مثلث: (   ) بتایا گیا ہے۔ یعنے ہیرو، ہیروین اور رقیب۔ بقیہ کردار ذیلی ہیں جو یا تو "ہیرو" اور "ہیروین" کے معاون ہیں یا مخالف۔ مثبت صفات دوستوں کے روپ میں بیان کیے گیے ہیں اور منفی صفات مخالفین کے۔

مجازی معنوں میں دیکھا جائے تو :سب رس: کا ہیرو :دل: ہے اور ہیروین :حسن:
:دل: :حسن: کو پانے طرح طرح کے جتن کرتا ہے۔ بالآخر اس کی رسائی :حسن: تک ہو جاتی ہے۔ اور پھر :حسن: و :دل: عارضی طور پر مل جاتے ہیں۔ پھر :غیر: ان میں پھوٹ ڈال دیتی ہے لیکن یہ جدائی عارضی ہوتی ہے اور دوستوں کی مدد سے :حسن: و :دل: پھر مل جاتے ہیں۔ ان دوستوں میں :حسن: کی سہیلیاں :وفا: اور :ناز: پیش پیش ہیں۔ :وفا: سپہ سالار :مہر: کی بیٹی ہے اور وہی :دل: کو دارُوے بے ہوشی پلا کر :چھپے: یعنی :قصرِ وصال: پر لاتی ہے۔ :دل: بے خودی میں بے تکلفی کا خوب لطف اٹھاتا ہے۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد اس کی حالت مجنوں کی سی ہو جاتی ہے۔ اس اثناء میں :حسن: کی مصاحب :غیر: کو :دل: کا حال معلوم ہوتا ہے۔ قصہ میں :غیر: :رقیب: کی بیٹی ہے وہ :حسن: کا بھیس بدل کر :دل: کو اپنے پاس بلواتی ہے۔ :خیال: اس کیفیت کی اطلاع :حسن: کو دیتا ہے۔ :حسن: فرط غضب میں :دل: کو اس کی بے وفائی کی سزا کے طور پر :ہجران: کے :کوٹ: میں قید کر دیتی ہے۔ یہاں سے فراق کی منزل شروع ہوتی ہے جو اکثر عشقیہ داستانوں میں عام ہے۔
چنانچہ اس کے مانند دوسرے مثالیہ :رومانِ گل: میں بھی وصال عارضی کا مقام وہ ہے جہاں :زہرہ: (وینس) کی مدد سے :عاشق: :گلاب: کے قریب پہنچ جاتا ہے۔
اس کے بعد فراق کی وارداتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ :زبانِ خلق: اور :رشک: :خطرہ: (   ) کو ملامت کرتے ہیں کہ اس نے ادائی فرض میں کوتاہی کی وہ بہت سخت سخت گیر ہو جاتا ہے اور :گلاب: گرد ایک سخت حصار بنا دیا جاتا ہے۔ جس کے ایک برج

Hanif Razvi

میں (: خیال مہر : کو قید کر دیا جاتا ہے اور عاشق عالم فراق میں یاس اور اضطراب کے شکنجوں میں جکڑا جاتا ہے : سب رس : میں : دل : کے گوشت ہجران میں قید ہو جانے کے بعد : غیر : اپنی حرکت پر پشیمان ہو کر : حسن : کو ایک خط لکھتی ہے جس سے : حسن : پر دل : کی بے گناہی ظاہر ہو جاتی ہے ۔ : حسن : : دل : کو ایک خط لکھتی ہے جس کا : دل : جواب دیتا ہے ۔ اس دوران میں : عشق : و : عقل : میں لڑائی چھڑ جاتی ہے : ہمت : ہر طرح سے صلح کی تدبیریں کرتا ہے ۔ آخر ان دونوں میں صلح ہو جاتی ہے اور : عقل : اپنے بیٹے : دل : کی : عشق : کی بیٹی : حسن : سے شادی کر دیتا ہے ۔

: رومان گل : میں بھی : عاشق : کو گلاب مل جاتی ہے ۔ گویا دونوں مثالیوں میں تلاش بالآخر کامیاب رہتی ہے ۔ ان مثالیوں میں قصے کی رفتار کے مدارج یوں ہیں ۔ (ا) طلب ۔ (ب) وصال عارضی (ج) فراق (د) وصال حقیقی ۔

کردار وجہی نے کرداروں کی پیشکش میں نفسیاتی کیفیات کو بھی بہت اچھی طرح پیش کیا ہے ۔ اس کے ثبوت میں : حسن : اور : دل : کے کردار پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ پہلے : حسن : کی ظاہری صفات اس کے : عاشق : : دل : کی زبانی یوں کہلوائے ہیں ۔ : حسن : کی : خوبی : : محبوبی : کا ذکر تو بعد میں آئے گا ۔ ظاہری حالت یہ ہے :

: مکھ مقبول ہے ۔ متوالی آنکھ ہے ۔ قبول صورت ناک ہے ۔ نازک نرم لعل ہونٹاں ہیں ۔ مہندی رنگے ہاتاں ہیں ۔ نیاتاں جیسے دانتاں ہیں ۔ ابلوج (مصری) جیسی باتاں ہیں ۔ شرزی جیسی کمر ہے ۔ گھونگر والے بال ہیں : ۔ [۱]

صفات : حسن : میں نسوانی صفت ۔ یعنی : رشک : بہت ہے وہ : دل : کو غیر کے ساتھ دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتی ۔ ساتھ ہی عقلمند بھی ہے ۔ : خوش طبع اور خوش فام ہے [۲] : چتر چوسار : خوش گفتار اور خوش رفتار ہے [۳] شعر شاعری سے لگاؤ ہے [۴]

---

[۱] "سب رس" صفحہ ۲۷۸ [۲] "سب رس" صفحہ ۹۰
[۳] "سب رس" صفحہ ۸۵ [۴] "سب رس" صفحہ ۹۲ ۔ شعر گفتن حسن از فراق دل

Hanif Razvi

لکھ پڑھ سکتی ہے۔[1]

دل: صاحبِ صورت صاحبِ جمال ہے۔ صاحبِ ہنر صاحبِ کمال ہے:[2]۔ آفتاب جیسا مون ہے۔ بادل جیسے بالاں ہیں۔ چاند جیسے "گالاں" ہیں:۔ شجاع اور بلند ہمت ہے۔ آبِ حیات نام سن کر وہ گھر کا عیش آرام چھوڑ کر تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ مشکلات سے نہیں ڈرتا۔ آخر اپنا مطلب حاصل کر لیتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں: مرد: کی فطرت کی کمزوری بھی موجود ہے۔ یعنی وہ دھوکہ ہی میں سہی: غیر: کے دام میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اسے: حسن: سے بیحد محبت ہے۔

اس طرح وجہی کے ہاں مرد و عورت کے صحیح یا: حقیقی: کردار ملتے ہیں۔ جنھوں نے بعد میں: شعر: اور داستان میں اپنی ہیئت بالکل بدل دی ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے وجہی کی ہیروین: حسن: میں جہاں شرم و حیا ہے وہیں بیباکی اور جرات بھی ہے۔ اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نہیں کمزوریاں بھی ہیں۔ مثلاً جب وہ: غیر: کو: دل: کے ساتھ دیکھتی ہے تو برداشت نہیں کر سکتی۔

اس کے علاوہ وجہی نے بہت سے معاشرتی پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ نہ صرف نظر ڈالی بلکہ ان خامیوں کی اصلاح بھی کرتا ہے۔ مثلاً کثیر ازدواج: کو وہ معاشرہ کی خرابی کا سبب سمجھتا ہے۔ دو شادیوں کی برائی اس سے سنیئے۔:

: نہ من کا سواد نہ تن کا سواد سینہ جلتا دل میں تڑپھڑی پیچ میں آئی ہے جا کر دوزخ میں پڑی کیا جانے کیا گناہ کی تھی۔ اول زمانہ میں جو مین آگر پڑی اس عذاب پیلانے سوکن جیو پر اٹھے سوکن جیو لیوے سوکن نے محبت میں فتنوی اٹھے۔ سوکن نے جڑیا دل ٹٹے سوکن آئی دکھ سے سینہ بٹھیا۔ سوکن آئی محبت کا اٹھیا۔ دایم جھگڑتیاں۔ جلن بلیاں

---

[1] سب رس صفحہ ۲۷۶ - "مکتوب حسن بہ دل" [2] سب رس صفحہ ۲۲۱

لڑتیاں ادھر تے سالے ادھر تے سالیاں چاروں طرف تے برستیاں گالیاں۔
کوئی کنواں گرنی کوی بائین۔ گھر میں کھیلتیاں چائیں مائیں۔

سوکن کوں دیکھنے کا کسے تاب جی گھر میں سوکن آئی وو گھر خراب سوکن ادیکھی نیچ کی تقسیم داریوں جھل کوں سوے توبہ استغفار جن نے آسودگی کوں دسری عورت کیا۔ ان نے تیری الیس کوں عذاب میں دیا۔ کیتی جاگا آپس کوں بانٹ بھادے۔ یک دل دو جاگا کیوں لاوے۔ ایک سوں توڑنا تو دسرے سوں جوڑنا جھل تے دونوں سینا چاک یو بچارہ میانے میاں ہلاک ایک بولے دل ہور کہے ایک یار سک جیو کوں لگائے تھا دو ٹھار :۔

اس کے علاوہ "سب رس" کی دوسری بڑی خصوصیت مصنف تے مجلسی تعلقات درباری آداب۔ اچھی زندگی کے لوازم۔ حیاتِ عشق کی تفسیریں سب کا بیان نہایت خوبی سے کیا ہے۔

عورت کا کردار اس سے سنیئے :۔

عورت کا کردار

:۔ عورت اسے کہتے ہیں جو مرد کے دل کوں بہلاوے نہ مرد کا دل عورت تے واز ہو جائے پیار آتا ہے سو بی نہ آوے کھساٹیاں کا ناز توبہ استغفر اللہ ایسے نازاں تھے جیو واز عورت نے مرد کا جیو پکڑے تو آسودگی نہ دیکھیا اپنے تن کی خاطر رکھنا مرد کے من کی عورت ہیں مہر و محبت پیار اچھا۔ عورت چتر۔ چونسار اچھنا۔ عورت میں گفتار اچھنا۔ سواد سمجھن ہاری عورت کان ہے۔ سب کن ہیں ساری عورت کان ہے۔

گو وجہی کے خیالات مرد اور عورت کے بارے میں رجعت پسندانہ ہیں لیکن ان میں بڑی صداقت ہے :

اب سنیئے کہ وجہی مرد کے بارے میں کیا کہتا ہے :

مرد کی حالت

:۔ مرد کوں کوئی سنبھال رک سکیا ہے مرد آتش بھاتا مرد

Hanif Razvi

اپس تام دکھئیں عورت کی قید میں رہتا ہے۔ مرد ہزار جاگا جائے گا اسے کان کا جھل اجھینگا۔ یوں جھل کھاتے پھرے تو لوگاں دیوانے کہیں گے۔

شادی بیاہ کے طریقے

وجہی نے سماجی رسم و رواج کی بھی اچھی تصویر کشی کی ہے چنانچہ شادی بیاہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے :

: ڈیرے ٹھاریں ٹھار دیے۔ گھر سنوارے جا گا جا گا نقش نگارے۔ صدر بچھائے۔ پاچے۔ رنبھا ارنبی میکا پاتراں آ کر ناچے۔ ٹھاریں ٹھار آرائش کیے۔ دل سورج کا حسن چاند سوں جلوہ دیے۔ ناز غمزہ اغوا۔ لطافت مہر چھپندیو یوچندیاں ماریاں۔ اس سورج پر اس چاند پر تارے واریاں۔ عالم سب ہور عات دیس تے روشن ہوئی رات۔ مشتری تماشا دیکھنے آئی۔ زہرہ نے جلوہ گائی۔ :حسن : ہور : دل : کا عقد کیے۔ سب اہل بہار کباد دیئے سہلاں سوں سیج سنوارے ......:

عشق کی تفسیر

عشق کی تفسیر بہتوں نے کی۔ کسی نے زندگی کا لطف بتایا تو کسی نے سب سے برا غم۔ اس کی لذت وجہی سے سنیئے۔

: عاشقی حیران ہونے کی خاطر کرتے ہیں۔ عاشقی پریشان ہونے کی خاطر کرتے ہیں۔ ہسنے ترسنے خاطر کرتے ہیں۔ عاشقی انکھیاں میں تے انجھواں برسنے خاطر کرتے ہیں۔ فارسی میں ایک کون کنے پوچھیا کہ عشق کیا ہے کچھ مار دم۔ ان نے کہیا سوختم۔ سوختم۔ سوختم۔

عاشق ہے تو عاشقیت پچھان ہزار جمعیت اس عشق کی پریشانی پر قربان اگر عشق کی لذت کسے یاد ہے تو ایک ساعت کے رونے میں عالم عالم کا سواد ہے۔ کس آرام میں اس بے تابی کا راحت ہے۔ کس آسودگی میں اس محنت کا فراغت ہے۔ تنہا ترسنا لگیا سواد۔ تانا دل پکڑیا مجنوں۔

عشق عاجز۔ عشق توانا۔ عشق دانا۔ عشق دیوانا۔ عشق اپنے رنگ میں

آپی کھلنا۔ عشق اپس پر آپ بھلنا۔ عشق کے چالے کون نبھائے۔ عشق چند
عشق بھان۔ عشق دین۔ عشق ایمان۔ عشق حاکم۔ عشق سلطان۔

بعض اور امور پر بھی یہ کتاب بالواسطہ روشنی ڈالتی ہے۔ مثلاً اس نے پہلی مرتبہ اُردو اور برج بھاشا کا فرق واضح کیا۔ اُردو کو وہ ہندی یا زبان ہندوستان کہتا ہے۔ اور برج کو گوالیاری یعنی ایک مخصوص خطہ کی زبان سمجھتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مغلیہ عہد کے مصنفین ابوالفضل عبدالحمید لاہوری۔ محمد صالح بلکہ خان آرزو تک برج کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔ وجہی ان دونوں زبانوں سے دوہرے اور کہاوتیں نقل کرتا ہے ایک جگہ وجہی نے خسرو مندرجہ ذیل دوہرا بھی لکھا ہے۔

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
منجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ [1]

اسلوب

مواد سے قطع نظر اسلوب پر نظر ڈالیے تو "کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است" کے مصداق ہے۔ "سب رس" اور "قصہ حسن و دل" (جہاں سے اس نے قصہ مستعار لیا) کے تتبع میں اس نے مسجع و مقفیٰ عبارت میں پورا قصہ لکھا ہے۔ روانی میں کہیں فرق آنے پاتا۔ عموماً مقفیٰ اور مسجع طرز کی خامی یہ ہوتی ہے کہ اس میں "آمد" نہیں ہوتی۔ آورد کی وجہ سے تکلف پایا جاتا ہے۔ وجہی کے اسلوب یہ عیب مفقود ہے۔ اس کے مسجع و مقفیٰ جملوں میں "آمد" ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"عشق میں بدنامی جوں کھانے میں نمک۔ جوں دیوے میں جھمک جوں محبوب میں تھمک۔ عشق کا یہی ہے نشان بچارے جیتا پنہاں کرتے جاوے اتنا ہوئے آشکار سب کا حال ظاہر ہو آیا کون عاشق وہ جو عشق کو چھپایا"۔

وجہی کی دوسری خصوصیت بقول پروفیسر سروری [2] "وہ فقروں میں متزاد کا جوڑ لگاتا ہے"

---

[1] سب رس، صفحہ ۲۱۸

[2] تقریر: "قدیم کلاسیکی ادب کا ایک بے مثل نمونہ" نشر گاہ حیدر آباد۔

مثلاً : اس نور کی خبر کسے معلوم نیں۔ مفہوم نیں۔ جو کوئی مومن مسلمان ہے اس بات تے اس کا دل شاد ہے۔ یو دانایان کوں ارشاد ہے۔ انسان کون صورت ہے نیں۔ تحقیق جانتا ایک اپے رب العالمین :

مناظر کی بھی وجہی کے ہاں بڑی اچھی تفصیلات ملتی ہیں مثلاً : سب رس : میں : دل کی شادی کا سین لہ۔ ایک موقع پر صبح کا منظر اس طرح کھینچتا ہے :

: القصہ کتیک وقت کوں سورج نے سر کاڑیا آسمان کا پردا پھاڑیا اجالا سنچریا ٹھاریں ٹھار۔ روشن ہوا سب سنسار۔ اجھوں دیس چڑیا نیں پاو گھڑی جو صباح پڑی اس قلعہ کے دیدبان نے دیکھیا : ۲ہ

وجہی کی اسلوب کی ایک اور خصوصیت الفاظ کا برموقع استعمال ہے۔ اس کا یہ رنگ دورِ حاضر میں صرف نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار کے ہاں ملتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ فقروں کے پرے کے پرے جماتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً

: ناموس بادشاہ انو کوں دیکھتیچ مال ملک سب چھوڑیا کچھ لوڑیا۔ قلندر ہوا سمندر ہوا۔ فقیر ہوا بے تدبیر ہوا۔ اسیر ہوا۔ غم کے ہات میں سپڑیا۔ ناموس نے عشق میں ناموس گنوایا۔ لکھیا تھا سو انپڑیا : ۳ہ

مصنف کی دوسری زبانوں کے ادب سے واقفیت اور عام زندگی کے تجربہ نے اس کو اس بات کا اہل بنا دیا ہے کہ زندگی کے اخلاقی و معاشی مسایل فضایل و رذایل ۔ معائب اور اوصاف پر خاص طریقہ سے رائے زنی کر سکے۔ اس تعلق میں وہ آیات کلام پاک احادیث و اقوال۔ اساتذہ کے اشعار اور دیگر مختلف زبانوں کے امثال کے برمحل استعمال سے کتاب کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی طرف سے بھی پاکیزہ خیالات اور چست فقرات کا اضافہ کرتا ہے۔

لہ ملاحظہ ہو مقالہ ہذا صفحہ (   )
۲ہ "سب رس" صفحہ (۱۷۵)
۳ہ "سب رس" صفحہ (۱۷۷)

عربی اقوال کا استعمال ملاحظہ ہو :

۱۔ دانایاں ہیں بوجھی ہے بات : العقل نصف الکرامات :

۲۔ مرتضیٰ فرماتے ہیں جنو کی بات دایم قایم : عرفت ربی بہ فسخ العزایم :

۳۔ صبوری تے دنیا صبوری تے دین مصحف کی آیت ہے : ان اللہ مع الصابرین:

۴۔ پڑن رقعہ دیا جیو کے ہات : کتابت کتے آدھا ملاقات : المکتوب نصف ملاقات:[1]

وہ فارسی ضرب الامثال بھی بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ :

۱۔ مردی و نامردی ایک قدم ہے : مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد [2]

۲۔ اس بات پر یو بات آتی کہ علت جاتی ولے عادت نین جاتی۔

: علت می رود ولے عادت نمی رود : [3]

۳۔ جس نے لہو ا ہات پکڑیا اس کی دایم پیش بازی۔

: ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند : [4]

وجہی نے بعض جگہ حسب ضرورت مصادر فارسی سے ڈھالے ہیں جیسے تلاشیدن سے تلاشنا، فہمیدن سے فامنا مثلاً

: یو بات دانش کا محتاج اس بات کون فمنا کون : [5]

نگاریدن سے نگارنا اور اندیشیدن سے اندیشنا بھی قابل ذکر ہے۔

: یو کام اندیشتے ہیں سو کرنا گھر سنوارے جاگا جاگا نقش نگارے : [6]

۱؎ : سب رس : صفحہ ۲۷۶
۲؎ : سب رس : صفحہ ۱۷
۳؎ : سب رس : صفحہ ۴۵
۴؎ : سب رس : صفحہ ۱۵۴
۵؎ : سب رس : صفحہ ۱۵۰
۶؎ : سب رس : صفحہ ۱۹۶

Hanif Razvi

اس طرح "مواد" اور "اسلوب" ہر اعتبار سے "سب رس" دورِ قدیم کا بے مثل کارنامہ ہے وجہی نے تمثیل کے پیرایے میں جو "کتاب سب رس" کو "دل" کا بیٹا بنا کر اپنے وقت کا لقمان وافلاطون اپنے وقت کا "خسرو" اور فرہاد و مجنوں بنایا وہ چنداں غلط نہیں تھا۔

وجہی کی قادر الکلامی اور اس کے کارنامے بعد لکھنے والوں کے لیے آدرش بن گیے تھے۔ مثال کے لیے طبعی کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس نے ۱۰۸۱ھ میں اپنی مثنوی "بہرام و گل اندام" لکھی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وجہی اپنے پیشرو اساتذہ "فیروز" "محمود"[۱] وغیرہ کا ذکر اپنے نصب العینی شاعروں کے طور پر کرتا ہے۔ طبعی نے بھی وجہی کو وہی درجہ دیا ہے۔ طبعی کے اشعار حسب ذیل ہیں :

"گیا میں جو یو مثنوی بولنے — یو موتیاں نچل و ڈھال یو رولنے
یو وجہی میرے خواب میں آئے کر — مکھ اپنا سونا دکھلائے کر
سراسر سنیا جو میری مثنوی — کیا بات طبعی ہے میری نوی
ہو خوش حال یو سنکر باتاں میرے — آپس کے لیے ہاتاں میں ہاتاں میرے" [۲]

Hanif Razvi

۱۔ وجہی نے اپنی مثنوی "قطب مشتری" میں فیروز اور محمود کا ذکر کیا تھا کہ انھوں نے اس کے خواب میں آکر اسے بشارت دی تھی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگریزی ادب میں بھی کم و بیش اسی زمانے میں اکثر شاعروں نے اپنے رزمیہ نظموں میں اپنے پیشرو شاعروں کے خواب میں آنے کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ دیباچہ "بہرام و گل اندام" منقول از "اردو شہ پارے" صفحہ (۸۸)

۹

قدیم زبانوں کے ترجمے

مشرق میں قصّہ گوئی ۔ قصّوں کی ماخذ سنسکرت زبان ۔ :طوطی نامہ : (شکا ست تتی) ۔ : طوطی نامہ : کے فارسی خلاصے نخشبی ابوالفضل علامی ۔ سید محمد قادری ۔ مختلف اردو ترجمے :طوطی نامہ ابوالفضل : کے مترجم کے بارے میں غلط فہمیاں ابن نشاطی کا ترجمہ ۔ ملا سید محمد قادری کا طوطی نامہ — عبارت کے نمونے طوطی نامہ اور اس کی تکنک ۔ سنگھاسن بتیسی : ملک زمان و کلام کندلا ۔: کام روپ و کام لتا : : قصّۂ جنگ امیر حمزہ : طلسم ہوشربا : گل ہرمز انار رانی: :نوطرز مرصّع : ۔ : نو طرزِ مرصّع کا اسلوب : ۔ : بہار دانش: :نگار دانش : اور : مفرح القلوب : ۔: دلبر و مہر افروز : ۔ : چار چمن : — : گلستاں:

Hanif Razvi

۹

قدیم زبانوں کے ترجمے

قدیم دور میں مشرق داستان طرازی اور تخیل کی فلک پیمائیوں میں مغرب سے بڑھ کر آگے رہا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب "دنیائے افسانہ" میں لکھتے ہیں:

"مغرب نے مشرق سے قصہ نویسی کا فن سیکھا" [1]

اس حقیقت کا اعتراف اکثر مغربی مصنفین اور مولفین نے کیا ہے۔ ڈاکٹر مس آمنہ پوپ اپنے مقالہ "انڈیا ان پورچگیز لٹریچر" میں لکھتی ہیں۔:

"(Mofina Mendis) پرتگال کی ایک مقبول داستان ہے یہ دراصل سنسکرت کی "پنچ تنتر" یعنی "حکایات کلیلہ و دمنہ" سے متاثر ہے۔ اس میں "انوارِ سہیلی" والی تکنک یعنے قصہ در قصہ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے دیگر یوروپین زبانوں میں بھی یہ طرز مقبول ہوا"۔ [2]

یہ ایک حقیقت ہے کہ عربی۔ فارسی۔ اور سنسکرت زبانوں میں ایسے عظیم الشان قصے لکھے گئے اور اتنے مقبول و محبوب ہوئے کہ آج وہ عالمی کلاسیکی ادب میں شامل ہیں۔ اور دنیا کی تمام مشہور زبانوں میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ عربی اور فارسی سے بھی زیادہ سنسکرت ادب اپنے قصوں کی نوعیت اور ان کی خصوصیات کے سبب دنیا کی اکثر زبانوں کے قصوں کے لیے محرک یا ماخذ کا کام دیتا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عربی اور فارسی کے مصنفین نے سنسکرت سے

---

[1] : دنیا افسانہ : صفحہ (   )

[2] : انڈیا ان پورچگیز لٹریچر : صفحہ (   )

Hanif Razvi

ماخوذ ان قصوں میں ایسی رنگا رنگی اور دل فریبی پیدا کر دی کہ وہ ایک نئے روپ میں ڈھل گیے۔ عربی اور فارسی کے مصنفین نے ان قصوں کو اس طرح اپنایا کہ ان کی اصل عربی اور فارسی ہی سمجھی جانے لگی۔ اس کی نمایاں مثال: انوارِ سہیلی: اور: طوطی نامہ: وغیرہ کی حکایات ہیں۔

قدیم کہانیوں اور قصوں میں مندرجہ ذیل بہت مشہور اور کم و بیش: کلاسکی ادب: کا رتبہ حاصل کر چکے ہیں:

۱۔: انوارِ سہیلی: (پنچ تنتر) ۲۔: طوطی نامہ: (شک سپ تتی)۔

۳۔: سنگھاسن بتیسی: ۴۔: الف لیلیٰ: ۵۔: گلستان:۔

۶۔: عشقیہ افسانے جیسے: لیلیٰ مجنوں: : شیریں فرہاد: : یوسف زلیخا: وغیرہ۔

اُردو کے قدیم دور میں ان قصوں میں سے بعض کے ترجمے کیے گیے۔ ابھی تک عام خیال یہ تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل کا زمانہ نثری ادب کے اعتبار سے زیادہ زرخیز نہیں رہا۔ لیکن میری دسترس جس مواد تک ہوئی ہے اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قیاس صحیح نہیں تھا۔ قدیم اُردو میں نہ صرف قصوں کے ترجمے ہی کیے گیے بلکہ طبع زاد قصے بھی لکھے گیے ہیں۔ مترجم افسانوں میں: طوطی نامہ: کا نام اہم ہے جس کے بعد میں بھی کئی ترجمے اور خلاصے کیے گیے۔

طوطی نامہ

: طوطی نامہ: کا ماخذ سنسکرت زبان کی کتاب: شک سپ تتی: (یعنی طوطے کی کہی ہوئی ستّر کہانیاں) ہے۔ یہ قدیم زمانے کی ایک مقبول اور مشہور داستان تھی۔ اُردو میں اس کی کہانیاں کئی دفعہ لکھی گئیں نظم میں بھی اور نثر میں بھی نظم میں غواصی کا: طوطی نامہ: مشہور ہے اور نثر میں حیدر بخش حیدری کی: طوطا کہانی: کے بارے میں ہماری معلومات مکمل ہیں لیکن اس کے علاوہ اس کے تین اور نثری ترجمے ملتے ہیں۔ جن میں سے ایک ترجمہ[۱] ۱۲۱۴ھ کے بعد کا ہے۔ اور اس مقالے کے موضوع سے خارج ہے اس سے پہلے کے دو نثری ترجموں میں سے ایک کا مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ[۲] میں محفوظ ہے۔ اور دوسرا

---

[۱]: تذکرہ اُردو مخطوطات: جلد اول صفحہ ( )

[۲]: فہرست اُردو مخطوطات: جامعہ عثمانیہ صفحہ ( )

برٹش میوزیم[1] میں۔ لیکن جس طرح سنسکرت کے "طوطی نامہ" کے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح موخرالذکر دونوں نثری ترجموں کے لکھنے والوں کا پتہ نہیں چلتا۔ اصل سنسکرت تصنیف کے بارے میں پروفیسر ڈی۔ وارد ھاچاری اپنی کتاب "سنسکرت ادب کی تاریخ" میں لکھتے ہیں :

"یہ تصنیف جس کے مصنف اور تاریخ تصنیف کا پتہ نہ چل سکا۔ طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیوں پر مشتمل ہے جو وہ اپنی مالکہ کو بدراہ ہونے سے بچانے کی خاطر ہر رات کہتا جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ آٹھویں صدی ہجری یعنے چودھویں صدی عیسوی میں فارسی میں بھی ہوا۔ مشہور جینی عالم ہیم چندر کے عہد تک یہ کتاب تصنیف ہو چکی تھی کیونکہ اس نے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وہ سنہ ۱۱۰۰ء کے قبل کی تصنیف ہے" [2]

فارسی میں بھی "طوطی کہانی" کو کئی مصنفین نے لکھا۔ ان میں ایک ضیاالدین نخشبی[3] کا ترجمہ بھی ہے جس کے بارے میں حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں :

"مولانا ضیاءالدین نخشبی نے ان ستر کہانیوں میں سے باون کہانیوں کا انتخاب کر کے فارسی میں ان کا ترجمہ کیا ہے یہ ترجمہ ۷۳۰ھ میں تمام ہوا" [4]

ضیاءالدین نخشبی کی زبان مشکل تھی۔ اس وجہ سے فارسی میں اس کے متعدد خلاصے لکھے گئے۔ شیخ ابوالفضل علامی نے اکبر کے حکم سے دسویں صدی ہجری کے وسط میں اس کا سلیس اور آسان فارسی میں خلاصہ کیا۔ ابوالفضل کے خلاصہ کا ترجمہ اردو میں بھی کیا گیا تھا جو

---

[1] کیٹلاگ مرتبہ بلوم ہارٹ نمبر (۱۰۵۸۹) نیز "یوروپ میں دکنی مخطوطات"

[2] "ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" از ڈی۔ وارد ھاچاری صفحہ ۱۲۶

[3] رسالہ "مخزن" بابتہ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء

[4] "اردوئے قدیم" صفحہ ۱۳۴ ۔

Hanif Razvi

اصل خلاصہ کے ساتھ لکھا ہوا مخطوطے کی شکل میں برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ مخطوط اس مقالے کے تعلق سے بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس پر آگے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

ابو الفضل کے بعد ملا سید محمد قادری نے مولانا نخشبی کی باون حکایات میں سے پینتیس ۳۵ کا انتخاب کر کے گیارہویں صدی ہجری میں فارسی روزمرہ میں لکھا۔ یہ خلاصہ بھی: طوطی نامہ: کے نام سے مشہور ہے اور عام طور پر ملتا ہے۔ لیکن ابو الفضل علامی کا خلاصہ اب کمیاب ہے۔

اردو میں نخشبی اور سید محمد قادری کی کتابوں کے ترجمے نظم اور نثر دونوں میں ہوئے۔ دکھنی نظم میں غواصی کا: طوطی نامہ: مشہور ہے۔ برٹش میوزیم اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں مخزونہ ترجمے فورٹ ولیم کالج سے بہت پہلے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے نسخے پر: قدیم دکھنی اردو: لکھا ہوا ہے۔ عبارت درج ذیل ہے:

: دکھنی ترجمہ آج سے دو سو سال پہلے کی اردو کا نمونہ ہے۔ مولانا آزاد نے نثر اردو میں سب سے پہلے ۱۱۴۵ھ کی تحریر کردہ فضلی کی: دہ مجلس: بتائی ہے۔ یہ ترجمہ: دہ مجلس: سے پہلے کا ہے۔ یعنی ۱۱۴۲ھ کا۔ :

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کا یہ مخطوط سید محمد قادری کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

برٹش میوزیم کے مخطوطے پر کوئی سنہ درج نہیں لیکن جیسا کہ کیٹلاگ کے مرتب کے وضاحتی نوٹ سے پتہ چلتا ہے۔ یہ قدیم دکھنی اردو میں لکھا ہوا ہے۔ مرتب کیٹلاگ بلوم ہارٹ نے لکھا ہے:

: طوطی نامہ: یا طوطے کی کہانی فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے۔ اصل مخطوطہ ابو الفضل کا اختصار ہے۔ جو نخشبی کے: طوطی نامہ: سے کیا گیا تھا۔ دکھنی ترجمہ پوری کتاب کا نہیں ہے۔ بلکہ سو صفحات تک چھتیسویں حکایت تک ہوا ہے۔ اس دکھنی مترجم کا نام نہیں معلوم ہوتا۔ ایک اور دکھنی ترجمہ غواصی نے کیا ہے :[۱]

---

[۱] کیٹلاگ برٹش میوزیم مخطوطہ (۱۰۵۸۹)

برٹش میوزیم کے "طوطی نامہ" کی زبان بھی گیارھویں صدی ہجری کی زبان سے بہت قریب اور ملتی جلتی ہے۔ اس طرح ان دونوں نثری ترجموں کے زمانہ کا تعین ہو جانے کے بعد ایک اور مسئلہ مترجم کا حل طلب رہ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں میرے خیال میں مندرجہ ذیل چند امور غور طلب ہیں :

گارساں دتاسی[۱] ۔ اسٹیوارٹ[۲] ۔ اور حکیم شمس اللہ قادری[۳] نے لکھا ہے کہ ابن نشاطی نے "طوطی نامہ" کے نام سے بھی ایک مثنوی لکھی تھی۔ لیکن ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری کو اس بیان سے اتفاق نہیں۔ چنانچہ "اُردو شہ پارے" میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں :

"عام طور پر مشہور ہے کہ ابن نشاطی ایک اور منظوم "طوطی نامہ" کا بھی مصنف ہے۔ مگر راقم الحروف کو اس کے ماننے میں تردد ہے اور کوئی ثبوت ایسا نہیں جس سے "طوطی نامہ" کو ابن نشاطی کی تصنیف تسلیم کر لیا جائے"[۴]

پروفیسر سروری جنھوں نے ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کو ایک بسیط مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شایع کیا ہے لکھتے ہیں :

"اگر ہم دی تاسی کے قیاس کے بموجب ۱۰۴۹ھ کے "طوطی نامہ" کو ابن نشاطی کی تصنیف مان لیں تو خود ابن نشاطی کے اس بیان کی تکذیب ہوتی ہے جو اس نے "پھول بن" کے خاتمہ کے اشعار میں دیا ہے کہ میں نے اس سے پہلے کوئی نظم نہیں لکھی۔ دنیا پر اپنا جوہر طبع ظاہر کرنے کے خیال سے ایک نمونہ پیش کیا ہے"[۵]

۱؎ : ہسٹری دی لٹریچر ہندوستانی : جلد اول صفحہ ۲۵۶

۲؎ : فہرست کتب خانہ ٹیپو سلطان : مطبوعہ سنہ ۱۸۰۲ء صفحہ (۱۸۰)

۳؎ : اُردوے قدیم : صفحہ (۶۹) ۴؎ : اُردو شہ پارے : صفحہ (۱۰۹)

۵؎ : مثنوی "پھول بن" : سلسلہ یوسفیہ شمارہ (۳)

اس کی تائید "پھول بن" کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے جن میں ابن نشاطی نے صاف طور پر بتایا ہے کہ اسے شاعری سے زیادہ رغبت نہیں اور صرف ایک نمونہ اپنے کمال فن کا دکھانے کے لیے یہ مثنوی لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے :

منجے گر شعر پر رغبت جو اچھتا
ہزاراں سونچ بیتاں لکھ کو اچھتا

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم بات، وہ یہ بھی لکھتا ہے اس کو ہمیشہ انشا سے رغبت رہی۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوگا :

ہے انشا پو میرا میل دایم
طبیعت کوں مری ہے خط ملایم

مندرجہ بالا بیانات سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔

۱۔ "پھول بن" جو ۱۰۶۹ھ کی تصنیف ہے۔ اس سے پہلے ابن نشاطی نے کوئی نظم نہیں لکھی۔

۱۰۴۹ھ کا "طوطی نامہ" جو نظم میں ہے اس کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی انشا پردازی کے کارناموں کا کیا حشر ہوا۔ اس سلسلے میں شاید گارساں دتاسی۔ اور اسٹیوارٹ کے بیانات سے ہماری رہبری ہو سکتی ہے۔ کیا یہ "طوطی نامہ" جس کا ذکر مذکورہ بالا دونوں علماء نے کیا ہے۔ برٹش میوزیم کا محولہ بالا نثری "طوطی نامہ" تو نہیں ہے؟ جسے دتاسی اور اسٹیوارٹ نے غواصی کے منظوم "طوطی نامہ" کے اشتباہ سے منظوم لکھ دیا۔

گارساں دتاسی اپنی تاریخ ادب اردو میں لکھتا ہے :

"اسی مصنف (ابن نشاطی) کی ایک اور تصنیف بھی ہے۔ جس کا نام "طوطی نامہ" ہے۔ اس قسم کے قصے اہل ہند کو بہت مرغوب ہیں یہ مثنوی ۱۰۴۹ھ میں تصنیف کی گئی ہے۔"

لیکن آگے چل کر وہ لکھتا ہے :

:: دکھنی زبان میں نخشبی کی فارسی تصنیف کی ، نقل ، اتاری گئی ہے ۔

سنہ ۱۰۴۹ھ میں ابن نشاطی کے معاصر غواصی نے ، طوطی نامہ ، منظوم لکھا تھا۔ اسی لئے محققین کی رائے ہیں ، طوطی نامہ ، جو ابن نشاطی کے کارنامہ میں شمار کیا جاتا ہے ابن نشاطی کا نہیں غواصی کا ہے۔

میرا قیاس یہ ہے کہ غواصی نے ، طوطی نامہ ، کو منظوم کیا تھا اور ابن نشاطی نے اسے نثر میں لکھا تھا ممکن ہے کتب خانہ ٹیپو سلطان کے مخطوطات کی فہرست کے مرتب اسٹیوارٹ کو ناموں کی یکسانیت کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہو۔ اس قیاس کو دتاسی کے اس بیان سے اور تقویت ہوتی ہے کہ وہ ابن نشاطی کے ، طوطی نامہ ، کو نخشبی کے ، طوطی نامہ ، کی ، نقل ، (IMITATION) کہتا ہے اور نخشبی کا ، طوطی نامہ ، نظم میں نہیں نثر میں ہے ۔

ابن نشاطی نے ، پھول بن ، سنہ ۱۰۶۶ھ میں لکھی ۔ گو اس کے صحیح سنہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ پروفیسر سروری نے اس کا سنہ ۱۰۷۶ھ بتایا ہے [1]۔ تاہم سنہ ۱۰۶۶ھ ہو یا سنہ ۱۰۷۶ھ دونوں بھی ، طوطی نامہ ، کے سنہ تصنیف سنہ ۱۰۴۹ھ کے بعد کے نہیں ہیں اور ابن نشاطی نے ، پھول بن ، میں صاف طور پر بتایا ہے کہ ، پھول بن ، اس کا پہلا کارنامہ ہے اور اس سے پہلے وہ انشا پردازی کی طرف مائل رہا ہے ۔

ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ ابن نشاطی کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا۔ اس کی مثنوی ، پھول بن ، بھی ایک فارسی تصنیف ، بساتین ، ہی کا ترجمہ ہے ۔ ، پھول بن ، میں اس نے اپنی فارسی میں مہارت اور ترجمہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :

: تجے ہے فارسی میں دستگاہ آج   نہ کرسے ترجمہ بھی کوئی تجہ باج
تجے معلوم ہے سارے صنائع   نکو اوقات کر تو اپنا ضائع :

ابن نشاطی کی فارسی مہارت اس کے انشا پردازی کے ذوق ، اور اسٹیوارٹ

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات : صفحہ ۵۶۵ و ۵۶۶

اور گارساں دتاسی کے اشاروں سے شاید یہی مستنبط ہوتا ہے کہ ابوالفضل کے فارسی: طوطی نامہ: کا دکھنی نثر میں ترجمہ غالباً ابن نشاطی کا ہوگا۔ اسٹیوارٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن نشاطی کا : طوطی نامہ: اس کی مثنوی: پھول بن: کے ساتھ مجلد تھا۔ ذیل میں: طوطی نامہ: (برٹش میوزیم) سے ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔:

: پچھے سین تعریف صاحب زمانہ کے اور زمین کے یعنی خدائے کے تعریف کے بعد از اور پچھے سین تعریف صاحب جان اور تن پیدا کرنے ہارے کے

جس سے آگے یہ مضمون ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابوالفضل کے خلاصہ کا ترجمہ ہے۔

: چلنے ہارے برے راہ بندگی کو یعنے بندگی رکھتے ہارے کو وہ کون ابوالفضل بیٹا شیخ مبارک کا اوس کی تین پاک حکم بادشاہ جاری ہونے کے پایا۔ یعنی بادشاہ حکم فرمایا کہ یہ کتاب کتیں یعنے طوطے نامہ کو سات عبارت تازی کے سات روشن تھوڑی عبارت کے نقش ترتیب کا دیوے یعنی مختصر عبارت سین بناوے: [۱]

جیسا کہ ڈاکٹر زور نے: شہ پارے: میں لکھا ہے۔ اس کا رسم الخط بھی عجیب ہے یعنی : ڑ: اور: ڈ: کو ہمیشہ: ر: اور: د: ہی لکھا گیا ہے۔ ترجمہ تحت اللفظ ہے جس سے پیچیدگی بھی پیدا ہو گئی ہے چھٹی کہانی کا اقتباس دیکھیے:

: نقل چھٹی سنار اور برائی کی اور پرہیزگار اور درزی کی۔ اور صورت لکڑی کی اور عاشق ہونا سات عاشقاں کا اوپر اس صورت کے اور جانا ان سات عاشقاں پیکر چوب کا آگو جہار کے اور بے نصیب رہنا وہ سب عاشقاں کا۔ جب ستارا برا (یعنی آفتاب) طرف مغرب کے دوریا اور اندھارا رات کا میدان جہان کے تین کالا کیا خجستہ واسطے طلب کرنے رخصت کے دوریا طوطی کے گی۔ طوطی بولی کب تک عاشق کے نین بیچہ جلن کے

---

[۱] : یورپ میں دکھنی مخطوطات : صفحہ ۵۶۵ و ۵۶۶

چاہے گی توں دیکھنے جلا پا (یعنے ملاقات کر) ایسا نہ ہووے کہ خبر مرد کو تیرے پہنچے۔ اور میرے تیں مانند جڑ جھاڑ کے کاٹے۔ اور توں مانند سات یار کے محروم رہے۔ خجستہ پوچھی کیونکر تھی وہ نقل طوطی بولی ۔۔۔۔ :

ڈاکٹر زور نے : اُردو شہ پارے : میں اس کا کچھ اور اقتباس دیا ہے۔ جو یہاں نقل کیا جاتا ہے ، :۔

: بڑائی اور سنار درزی پرہیزگاری مسافری کو نکلے اور ایک رات بیچ جنگل دہشت بھرے کے ہووے کے پتا باگان کا ڈر سیں اس جنگل کے پانی ہوتا تھا۔ یکایک اپنا اس جاگا میں پڑیا (یعنی ہوا) وہ چاروں یار مصلحت کرے کہ ہر ایک موافق باری کے یکایک پہر نگہبانی کرے اول بڑائی جاگتا تھا۔ لکڑی ایک بیچ نہایت بہتری کے چھلیا (یعنی اچھی صورت بنایا) اور پھر دو گھڑی سنار اس صورت کے تیں زیور سیں سنوار یا۔ تیسری پہری میں درزی اس کے تیں سات لباس کے زینت وار کیا۔ چوتھی پہری میں زاہد موں عاجزی کا طرف قبلہ کے لایا دعا کیا اور جان بدن بیچ اس کے پھوکے گیا ہوا۔ جب جاگا قبول کیا گیا تاریخ کا (یعنے آفتاب آ رہی ہیں تھا سو ڈیرے ہیں کالی رات کے نکل کر سات قصد عالم روشن کرتے۔ منزل اپنے بارا آسمان کا ہوا۔ ہر ایک کوئی یعنی ان چاروں یار سیں ہر ایک یار جنبل لڑائی کا بیچ دامن ایک ایک دوسرے کے مارے (یعنی ہر ہر شخص وہ عورت کوں اپنے لیوں گا بولتا تھا) بعد از لڑائی بہوت قرار پایا کہ اوپر سر راہ کے کھڑے رہیں انوں (یعنی سب مل کر راستہ پو کھڑے رہنا) کوئی ایک کے اول پونچا اس سیں فیصلہ قضیہ کا طلب کریں اونو سات اس نیت کے اوپر سر راہ کے کھڑے رہے۔ مسافر ایک پونچیا او اوپر لڑائی کی کیفیت کے خبردار ہوا۔ جلدی جنگل دشمنی کا اور لڑائی بیچہ دامن ان چار یار کے مار یا کہ غیرت میری کے تیں تم چاروں ڈانکا پڑ کر (یعنی واہ تبی کر کر

لے گیے ہیں۔ آگو کوتوال کے آو توکیا انصاف بولتا ہے۔ آگو کوتوال کے گیے۔
کوتوال بھی عاشق اس عورت کا ہوا اور بولیا ہے عورت بھائی سیں میری
ہے۔ (یعنی میرے بھائی کی عورت ہے) تمیں بیچ فلانی جاگا کے لوٹ
لے گیے ہیں۔ عورت کے تیں پایا میں حال اس کے تیں جواب بولو (یعنے
میرے بھائی کا مال دیو) وہ کوتوال آگو بادشاہ کے لیے گیا اور داد چاہا۔ بادشاہ
اس وقت باندے گیا زلف کے سر بچے اس ہوا (یعنی بادشاہ بھی عاشق اس
کا ہوا) عالم ایک واسطے تماشا کے جمع آوے۔ اور انصاف قضیہ کے تیں بوڑے
ایک جہاں دیدہ سے چاہے وہ بوڑا بولیا چالیس کوس اس شہر سیں جھاڑ حکم کرنے
ہار اگر کر نام جھاڑ ایک کا ہے۔ قضیہ نیں فیصل ہونے ہارا اس جاگا فیصل پاتا ہے۔
اس جاگا جاؤ تمیں۔ تمام لوگ دعوی کرنے ہارے اس عورت کے نزدیک اس جھاڑ
کے پہونچے اور مدعا اپنا ظاہر کرے۔ انتظار سخن نادر غیب کا رکھے (یعنے نادر
بات غیب سے کیا آتی ہے سو انتظار کرے) بیچ اس پہنچے کے (یعنی دیسے میں پیڑ
جھاڑ کی چیرے گئی اور عورت بیچ جھاڑ کے اندر آئی اور دڑاڑ مل گئی۔ اور پاتال
سیں جھاڑ کے آواز یہ آیا کہ تمام چیز رجوع کرتی ہے طرف اصل اپنے یعنی وہ
تصویر لکڑی سیں ہوئی تھیں آخر پھر لکڑی میں مل گئی)، تمام دعوی کرنے ہارے
نا امید ہوئے اور پھر کر ائے۔ اے خجستہ تو بھی سات جلدی کے اس محبوب کے تیں پا
خجستہ چاہی ویسا کرے یعنی جاوے۔ آفتاب نکل آیا قصد جانے کا اس کا
موقوف ہوا ::

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں مخزونہ : طوطی نامہ : کا ماخذ ابوالفضل علامی کا خلاصہ نہیں بلکہ سید
محمد قادری کا خلاصہ ہے۔ جو گیارھویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ مترجم خود کہتا ہے۔ :

:: واسطے معلوم ہونے تمام لوگاں کوں محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ
مرتبہ اونو کا یہچہ عبارت سلیس و آسان کے مل ہوئی اوپر خطان کی ہوئے و دور مر

Hanif Razvi

-جواب وسوال کہ دولت مند انکتیں لایق ہوے لکھے ہیں۔ایک داستان وہ داستان سے یو ہے :

اس مخطوطہ کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے :

: پچھے سین طرح طرح صفت وثنا پیدا کرنے زمین آسمان کے کیفیت وحقیقت یو ہے کہ داستان قصہ ہاو حکایات حضرت نخشبی کہ بیچہ طوطی نامہ کے عبارت سخت ودقیق کے لکھے ہیں سکتین مفصل وبیان واز واسطے معلوم ہونے تمام لوکان کوان محمد قادری نیک کرے مرتبہ اونوکا سینچہ عبارت سلیس وآسان کے کہ ملی ہوئی اوپر عبارت خطان کی ہودی وہ روزمرہ جواب وسوال کہ دولت مند انکتیں لایق ہوئی لکھے ہیں ایک داستان وداستان سے یو ہے۔

قصۂ اول در پیدایش وعاشق شدن برجستہ

ایک دولت مند الوگ کے احمد سلطان نام رکتا تھا۔بھوت مال ومتاع و بھوت لشکر وکھوڑے ایک ہزار پانچ صدہاتی وسواونتان بوجا اوٹھانے ہاری اس کے نزدیک حاضر تھے لیکن اس کو اولیاد نین تھا۔وہ ہمیشہ خدمت میں خدا پرستان کے جاتا۔وصبح وشام واسطے اولیاد کے دعا منگتا آتا پچھے کتیک روز کے اوس پادشاہ نین ایک لرکا خوبصورت وآفتاب چہرہ وماہ جبین اسکتین بخشیا۔تب او پادشاہ اس خوشی سون شگفتہ دل ہوکر کتے ہزار روپیہ درویشان وفقیران کو خیرات کیا اور تین مہینے تک وزیران وامیران ودانایان وفاضلان واستادان کون اس شہر کے ضیافت کیا۔خلعتان بھاری قیمت کے دیا جب لرکا سات برس کی عمر کا ہوا استاد کامل کے نزدیک پڑنے بہتایا۔ اولرکا تھوری روز میں الف وآمدن نامہ وانشاء ہرکرن۔وگلستان وبوستان وجامع القوانین وانشاء ابوالفضل ویوسفی ورقعات جامی تحصیل کیا بلکہ

Hanif Razvi

علم عربی و فارسی کچھ باقی نہیں رکھا۔ و قاعدہ نشست و برخاست مجلس بادشاہی و قانون گفتار و رفتار بزم شاہنشاہی سیکیا اور نظر میں بادشاہ خاصہ گان درگاہ کے پسند آیا تب بادشاہ اس فرزند کا نام میمون رکھیا اور ایک عورت ماہ بدن خورشید رخسار سے شادی کردیا۔ نام اس عورت کا خجستہ تھا۔ درمیانے خجستہ و میمون کے دوستی زیادی ہوئی جیسا کہ ہر روز ہور صبح شام یکجا گا رہتے و یکجا گا سوتے۔ یکجا کا بیٹھتے۔ میمون یک روز پالکی سوار ہوکر واسطے تماشائے بازار کے گیا۔ اور وہاں دیکھیا کہ ایک شخص بازار میں طوطے کا پنجرا ہات میں لیکر کھڑیا ہے میمون طوطا بیچنے ہارے کیتیں پوچھیا۔ اس طوطے کی قیمت کیا ہے۔ طوطا بیچنے ہارا جواب دیا کہ اس کا مول ہزار ہون ہے۔ میمون سنکر کہا کہ یک موٹھی پر و یک نوالہ ہی۔ کون اتنا مول دے گا۔ طوطا بیچ سے جواب دینے نین سکیا اس وقت طوطا چلایا کہ دولت مند مجے مول نیں لیا تو بھوت قباحت ہے۔ بعد ازاں طوطا جواب دیا کہ اے خوش جمال وای دولت مند صاحب کمال اگرچہ میں تیری نظر میں موٹھی بھر دستا ہوں لیکن عقل و دانائی سوں اوپر آسمان کے اوڑتا ہوں۔ اور خوش گفتار شیریں سخنان میرے سنکر تعجب ہوتے ہیں اور ادنی چیز میری سین یہ ہے کہ کام اگو کا ہونے ہارا خوب سمجھتا ہوں ہیں۔ اب کہ سوداگران کابل شہر کے آتے ہیں واسطے مول لینے تیل کے اور تو تمام تیل اس شہر کا مول دے کر و یکجا کا جمع کر رکھ۔ او سوداگران اے بعد ازاں کیتیں بیچ کہ اس سوداگری سوں تجے بھوت فایدہ ہووے گا۔ میمون سخن طوطے کا سن کر نقد ایک ہزار ہون مول دیکر اس طوطے کون لیکر اپنے گھر کون گیا۔ اور اپنے شہر کا تمام تیل مول لیکر یکجا کا منگا کر اس کا مول پوچھیا۔ دوکان داران اس تیل کا مول دس ہزار ہون بولے۔ اوس وقت نقد دس ہزار ہون اس کا مول دیکر اس تیل کو یکجا گا سوں رکھیا۔ سیوم روز طوطا بولے موافق سوداگران کابل شہر کے پونچے اور دوکانداران

Hanif Raza

سوان مانگے۔ دوکان داران تمام کہے کہ تیل ہمارے نزدیک نین ہے۔ تمام تیل ہمارے شہر کا میمون مول لیکر رکھیا ہے۔ بعدازاں تمام سوداگران سمجھ کر آگو میمون کے آئے اور تمام تیل پچاس ہزار ہون کو مول لیکر اپنے شہر کون گیے۔ پیچھے میمون سخن پر طوطی کے بہوت خوش ہوکر شاروک تین مول لیکر نزدیک طوطے کے رکھیا۔ کس واسطے کہ وحشت تنہائی کا اس کے دل سون نکل جاوے اور طوطی اور شارک دوقوں مل کر خوش رہیں۔ جیساکہ بزرگان فرماتے ہیں:

: کند ہم جنس باہم جنس پرواز :

یک روز میمون خجستہ سون کہا کہ دل میرا چہتا ہے کہ سفر دریا اور مالکان اور بندران کا کرنا جس وقت تیرے تین کام ایک پیش اوی سوائے مصلحت طوطی اور شاروک نہ کر۔ اسی طرح کے سخنان بول کے مسافرت گیا۔ میمون کے بعد خجستہ بہوت غم کرنے لگی اور جدائی سون شوہر کے رات کون نین۔ اور کھانا نیں کھاتی۔ اس وقت طوطا کئی طرح قصے کہانیاں تیر بولکر خجستہ کے دل کون خوش کرتا۔ پیچھے چھ مہینے کے یک روز خجستہ نہا کر اپنے کتین سنوار کر مہاری پر سوار ہور دریچے مہاری کے تماشا کو جھانکا کرتی تھی۔ یک بادشاہ زادہ دوسرے شہر کا واسطے سیر کے اس شہر کون آیا تھا۔ اونے خجستہ کا چہرہ دیکھ کر دیوانہ ہوا اور خجستہ بھی اس کون دیکھ کر عاشق ہوئی۔ اور بادشاہ زادہ ایک عورت کٹنی کو بلا کر اس کے ہات نزدیک خجستہ کے پیغام بھیجا کہ ایک رات میرے نزدیک آوے گی تو عوض میں اس کے لکھوتی لاک ہون کے جواہر تجھے دیونگا۔ اول سن کر نامنظور کیے۔ بعدازاں ورغلانے سے کٹنی کے راضی ہوکر جواب اس کا کھلائی کہ آدھی رات کے وقت تماری حضور میں آوں گی آوتی ہیں۔ جب رات ہوئی خجستہ لباس بہتر پہن کر روبرو شاروکے آئی در اوپر کر کے بیٹھ کر اندیشہ کی کہ میں عورت ہون۔ شارو بھی عورت ہے البتہ سخن پر آئیں گی۔ اور شاہزادے کے نزدیک جانے کون حکم دیگی۔

اس اندیشہ سوں تمام کیفیت روبرو شارو کے ظاہر کی۔ شارو سن کر تعجب کی کہ ایسا کام نہ کرنا کہ تماری قوم میں سخت عیب ہے۔ اور شرم ہے اس واسطے کہ عشق خجستہ پر غالب تھا منع کرنے سوں شاروک کے غصہ بہوت آیا۔ پنجرے میں سے شارو کنتیں باہر نکال کر دونوں پانواں کے ہات سوں مضبوط لیکر ایسا اوپر زمین کے ماری کہ جان شاروک کا نکلیا۔ اور مر گئی بعد از اں سان غصے کے طوطے کے نزدیک آئی۔

لیکن طوطا عقلمند تھا اس نے سوچا کہ اگر میں روکوں تو یہ بگڑے گی۔ ساتھ ہی وہ اس کو جانے بھی نہیں دینا چاہتا تھا کہ یہ اپنے آقا سے نمک حرامی تھی اس لیے اس نے ایک کہانی کا حوالہ دیا کہ میں بھی اس طوطے کی طرح عمل کروں تو میرا بھی حشر فرخ نیک کے طوطے کا سا ہوگا۔ خجستہ نے پوچھا اس طوطے نے کیا کیا۔ اس پر طوطے نے کہانی سنانی شروع کی اور رات ختم ہو گئی۔ اسی طرح ہر رات جب خجستہ اجازت لینے آتی طوطا ایک نئی کہانی چھیڑ دیتا اس طرح اس نے کہانیاں (۳۴) راتوں تک بیان کیں۔ پینتیسویں دن میموں سفر سے واپس آگیا اور شاروک کا حال پوچھا۔ طوطے نے تمام قصہ اول تا آخر کہہ سنایا۔ میموں کو بھوت غصہ آیا اور اس نے خجستہ کو مار ڈالا۔

یہ حکایتیں بڑی دلچسپ ہیں اور زیادہ تر عورتوں کی بیوفائی سے متعلق ہیں۔ چند کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

۱۔ : حکایت طوطے کی :

۲۔ : حکایت پاسبان کی وفاداری کی :

۳۔ : حکایت سنار اور بڑھئی کی :

۴۔ : حکایت زن لشکری و امیر زادہ :

۵۔ : حکایت سنار بڑھئی درزی اور زاہد کی :

Hanif Razvi

۶۔ : حکایت رائے رایان و دختر رائے فنوج :

۷۔ : حکایت طوطی اور کاروشاہ :

۸۔ : حکایت عورت سوداگر زبان دراز :

۹۔ : حکایت عورت دہقان :

۱۰۔ : حکایت دختر سوداگر :

۱۱۔ : حکایت برہمن :

۱۲۔ : حکایت شیر باگ کی :

۱۳۔ : حکایت شاہ پور مینڈک کی :

۱۴۔ : حکایت شیاہ گوش :

طوطی نامہ : کی تکنک اس کی تکنک میں بھی دور قدیم کے اکثر افسانوں کی طرح قصہ در قصہ کا سہارا لیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک مختصر افسانہ طویل داستان بن جاتا ہے۔ چونکہ ابھی لکھنے والوں میں اتنی مہارت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ایک پلاٹ کو پھیلا کر ایک ہی قصہ کی شکل میں لکھ سکیں اسی لیے وہ اس طرح کی تکنک اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ اصل داستان محض تمہید کے طور پر بیان کی جاتی تھی جو دوسری تمام داستانوں کو مربوط کرنے کا کام بھی دیتی تھی۔ اس طرح ایک ادب پارے میں : تنوع میں وحدت :۔ (unity-in variety) برقرار رہ سکتی تھی۔ جو کولرج کے نزدیک اعلیٰ ادب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

: طوطی نامہ : میں بھی اصل داستان جو خجستہ کی امکانی بے وفائی کا قصہ ہے۔ بہت مختصر ہے لیکن یہی قصہ ایک ایسی ڈوری ہے جس میں دوسری تمام کہانیوں کے منکے پروئے گیے اور اس طرح ایک خوبصورت مالا تیار کی گئی ہے۔ اس میں ہر قصہ اپنی جگہ مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے قصہ کی تمہید کا کام بھی دیتا ہے۔

یہ قصے دراصل ایک خاص تھیم یا موضوع (Theme) پر لکھے گیے ہیں۔ ان میں پلاٹ (Plot)

زیادہ اجاگر نہیں ہونے پاتا اسی لیے کئی قصوں کے اس طرح یکجا کر دیے جانے کے باوجود کسی قسم کا سقم پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ قصہ کی جاذبیت اور بڑھ جاتی ہے۔

خود قصہ میں کہانی کی جاذبیت اور اس کے اثر کے جادو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ کہانی کی دلکشی کے سامنے دوسرے تمام جذبات اور خواہشات ماند پڑ جاتے ہیں یہاں تک کہ "محبوب" سے ملنے کی خواہش پر بھی کہانی سننے کی خواہش غالب آجاتی ہے۔ مشرقی داستانوں میں کہانی کے اثر کو مبالغہ سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ "الف لیلیٰ" میں ملکہ شہزاد بادشاہ کو اپنے قتل سے محض کہانی کے ذریعہ ہی روکے رکھتی ہے۔

نہ صرف مشرقی ادب میں بلکہ دیگر آریائی زبانوں مثلاً لاطینی۔ انگریزی وغیرہ میں بھی اس قسم کی کہانیاں ملتی ہیں۔ اس خصوص میں بکاچیو (Boccaccio) کی "ڈی کیمرون" اور چاسر کی "کنٹربری ٹیلز" (Canterbury Tales) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جن میں اسی طرح کے مختلف قصے یکجا کیے گئے ہیں۔ لیکن "طوطی نامہ" کی تکنک ایک طرح سے اپنے مغربی مماثلات پر فوقیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس میں اصل کہانی کا ایک ہی کردار کہی جانے والی دوسری کہانیوں کا "داستان گو" (Narrator) ہے۔ حالانکہ مغربی داستانوں میں چند اتفاقاً یکجا ہو جانے والے شخص اپنی اپنی کہانیاں سنانے لگتے ہیں جن کا مقصد وقت گزاری کے سواء اور کچھ نہیں یہ کہانیاں "چار لوگوں کی چار باتیں" ہیں۔ مگر طوطی نامہ کی کہانیاں ایک مخصوص موضوع کے دائرے میں حرکت کرتی ہیں۔

سنگھاسن بتیسی

"طوطی نامہ" کے بعد دوسرا مقبول عام قصہ "سنگھاسن بتیسی" ہے جس کا ماخذ سنسکرت ہی کا ایک قصہ ہے۔ سنسکرت میں بھی اس کے مصنف کا نام نہ معلوم ہو سکا۔ پروفیسر وردھا چاری لکھتے ہیں[1] کہ یہ قصہ بکرماجیت سے متعلق قصوں میں سے ہے۔ یہ بتیس[۳۲] کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے بکرماجیت کے دربار کی پتلیاں

---

۱ : اے ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر؛ از ڈی۔ وردھا چاری صفحہ ۱۲۰

Hanif Raza

بیان کرتی ہیں۔ وکرمادتیہ کے تخت تک پہنچنے ۳۲ سیڑھیاں تھیں اور ہر سیڑھی پر ایک پتلی تھی۔ جب بکرماجیت تخت پر بیٹھنے کے لیے جاتا تو ہر سیڑھی پر پتلی روک کر اسے کہانی سنانے لگتی اس طرح بکرماجیت کو ۳۲ دن تک تخت پر بیٹھنا نصیب نہ ہو سکا۔ "سنگھاسن بتیسی" کو "وکرم چرتر" سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے ترجمے ہندوستان کی تقریباً سب ہی زبانوں میں ہوئے۔ چینی زبان میں کسما کیرانے اس کا ترجمہ کیا جو چودھویں صدی عیسوی (ساتویں صدی ہجری) میں ہوا ہے۔[1]

بنگالی میں اس کا ترجمہ ورار وچی نے کیا تھا۔ جس کی گرام قدیم ترین گرام سمجھی جاتی ہے جنوبی ہند کی زبانوں میں بھی "وکرم چرتر" کے نام سے اس کے ترجمے ہوئے۔ سنسکرت سے فارسی میں اس کا سب سے پہلا ترجمہ چتر بھوج داس نے جو مہر چند بھاٹ کا بیٹا تھا اکبر کے زمانے میں کیا تھا۔ اور اس کا نام "شاہنامہ" رکھا تھا۔

اس کے بعد بہاری مل اور راج مل نے جہانگیر کے زمانے میں ایک اور ترجمہ کیا۔ شاہ جہاں کے دور میں ابن ہرکرن نے جس کا نام کبراے ہرکرن داس کابنتھ بھی بتایا گیا ہے مذکورہ بالا فارسی ترجموں سے مدد لے کر ایک اور فارسی ترجمہ کیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی (مصنف "منتخب التواریخ") نے بھی ایک برہمن کی مدد سے "سنگھاسن بتیسی" کا ترجمہ فارسی نظم و نثر میں "خرد افروز" کے نام سے ۹۸۲ھ میں کیا تھا۔[2]

چتر بھوج داس کے "شاہنامہ" کا ایک ترجمہ دکھنی میں بھی ملتا ہے۔ جو کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ ابھی تک "سنگھاسن بتیسی" کے اس دکھنی ترجمے کا حال کسی محقق نے نہیں لکھا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد للو لال نے "سنگھاسن بتیسی" کا اردو میں ترجمہ کیا۔

---

[1]: اے ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر از وی۔ وردھاچاری صفحہ ۱۲۰

[2]: کیٹلاگ مرتبہ ریو

اور یہ کتاب : ہندی اور اُردو دونوں رسم الخط میں چھپی تھی ۔ : للولال جی کے ترجمے[۱] میں ہندی الفاظ بکثرت ہیں ۔ سالار جنگ کے مخزونہ مخطوطہ کا کچھ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

سالار جنگ کے کتب خانہ میں مخزونہ مخطوطے میں مترجم کا نام درج نہیں ۔ مترجم اُردو کو دکھنی کہتا ہے ۔ ابتداء میں اس قصہ کے ترجمہ کی یہ وجہ بتاتا ہے :

: کئی شخص فارسی زبان سے آشنا نہیں ۔ اس واسطے ترجمہ اس کا دکھنی زبان میں اس طرح سے لکھا گیا ۔ اب مجکو دانش مندوں اور صاحب کمالوں سے التماس یہ ہے کہ اگر کچھ فراموشی اور خطا اس میں ظاہر ہووے اپنی عنایت سے معاف فرمائیں کہ مجھے بزرگی اور اعتبار ہووے اور اپنی مراد کو پہنچے ۔ :

معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کے پیش نظر چتر بھوج داس کا : شاہنامہ : ہی تھا کیونکہ دیباچہ میں خدا کی حمد و نعت کے بعد بادشاہ اکبر کی مدح کی گئی ہے ۔ پھر مترجم نے اس کہانی کے ماخذ اور ترجموں کی تھوڑی سی تاریخ بھی مندرجہ ذیل لفظوں میں دیدی ہے :

: اول یہ کتاب چتر بھوج داس بیٹا سرپ چند بھاٹ کا فارسی زبان میں لکھ کر نام اس کا : شاہنامہ : رکھا ہے اور ۳۲ حکایتاں بھوت فصاحت اور نزاکت سے ظاہر کیا ہے ہندی زبان میں اس کتاب کو : سنگھاسن بتیسی : کہتے ہیں :

اس تمہید کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے ۔ ابتداء میں راجہ بھوج کے والد اور اس کی پیدائش کا حال مذکور ہے ۔ پھر اصل قصے شروع ہوتے ہیں ۔ یعنے جس وقت راجہ بھوج تخت پر بیٹھنا چاہتا ہے تب ایک ایک پتلی اس سے ایک نئی کہانی کہتی ہے ۔ اس ترجمہ سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

: یوں نقل کرتے ہیں کہ ایک شہر عظیم الشان اور آبادان نام اس شہر کا دھارا نگر

---

[۱] : داستان تاریخ اُردو صفحہ ۱۳۹

مشہور تھا اور قلعے اس کے نہایت خوبصورت اور دروازے بہوت مضبوط تھے آدمی ہر قوم کے اس شہر میں جمعیت اور دولت سے محفوظ رہتے تھے۔ سونا اور روپا جواہر اور لعل موتی اور الماس کھوڑی ہاتیوں کا شمار نہ تھا۔ بہوت خوبی اور زینت سی زندگانی کرتی تھی۔ ہر ایک محل اور رستوں ہیں محل اور حویلیاں نقاشی فرما کر رنگین اور آراستہ کی تھی۔ تمام عالم زمانے کے حادثے اور آفتوں سے امینت پاکر عیش و عشرت سے رہتے تھے۔ اس شہر میں راجہ بھوج نام ایک راجہ کا تھا۔ وہ راجہ بہوت قابل اور لایق چودہ علم سی واقف تھا۔ یادشاہ ہے اس شہر کی وہ راجہ کرتا تھا۔ اور اپنی بادشاہت میں خلق کو بہوت راضی رکھا تھا۔ اور سب راجے ملکوں کے متابعت اور فرمانبرداری اس کی کرتے تھے اور ہر سال خزانہ اور تحفہ نذرانہ اس کو بھیجتے تھے خویشاں اور دوستاں اس جماعت کے ہمیشہ بیچ خدمت کے حاضر رہتے تھے۔ بھائیاں اس کے صاحب شجاعت اور فرزنداں اس کے تخت نشین اور امیران دانشمند اور وزیران صاحب عقل اور شاعران پاکیزہ طبیعت کے اور حکیمان نادر حکمت کے نجومیان غیب کی جاننے والے اور رانیاں کمال کے کھولنے والے اور ہم نشیناں دل کی خوش کرنے والی مانند تاروں کے جمع رہتے تھے۔ اور وہ راجہ درمیان ان کے چاندی کی مانند روشن نظر آتا تھا۔ یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک وقت مہادیو اوپر یہ کیلاش پہاڑ کے بیٹھا تھا وہ پہاڑ مہادیو کے رہنے کا مکان تھا۔ اور پاربتی نام ایک عورت تھی ہاتھ باندھ کر خدمت میں کھڑی تھی کہ آج کی روز دل میرا یوں چاہتا ہے کہ قصہ کوئی راجہ پرہیزگار کا کہ سخاوت اور شجاعت میں بے مثال ہو میری صاحب کے زبان سے سنوں میں کس واسطہ کہ میری پر مہربانی کرتے ہیں اس سبب یہ التماس کرتے ہوں کہ دگرنہ کیا قدرت میری کہ اس گستاخی سے عرض کروں میں۔ امیدوار فضل و کرم سے ایسا ہے۔ زبان مبارک بہتر آب حیات کے ہے۔

وو قصہ ظاہر فرما کر دل میرا خوش وقت فرمائیں اور زندگانی تازہ بخشیں جب
وہ عورت پاربتی ایسی عاجزی سے التماس کری کہ سری مہادیو فرمای اور ایسی
تو خدمت کرنے والی ہماری ہی جو کچھ مطلب تیرا ہو ضرور ہے کہ بجالاؤں میں
تب کہے کہ آگی اس بات کے ایک تخت واسطے ہمارے بناتی تھی اور اس
کے لعل زیادہ قیمت کے زمرد اور الماس بہوت نادر جوڑ کر آراستہ کیے تھے۔
وہ سنگھاسن راجہ اندر کو دیا تھا۔ میں ہور راجہ اندر پیچھے گئی روز کے دو تخت
بکرماجیت کو دی تھی بکرماجیت کا ایک بھائی بڑا تھا۔ سرہری نام رکھا تھا۔
وہ راجہ اجین کا تھا تب پاربتی نے پوچھی کہ نام اس راجہ کے باپ کا کیا تھا۔
اور کس طرح راجہ اندر نے وہ سنگھاسن دیئے تھے تب سری مہادیو جواب دیے کہ
دیو کندا نام اس کندرپ سین کا تھا۔ جب اندر نے معلوم کی کہ کئی مرتبہ اس سے
بدعملی ظاہر ہوئی ہے اور حوروں کو بدنظر سے دیکھتا ہے۔ تب غصہ ہوئی اور
بددعا کی اور یوں فرمائے کہ اس کو اندر لوک سے یعنی ہماری مجلس سے باہر کریں
اور اوپر زمین جاری اور گدھے کی صورت میں پیدا ہوئے۔ کندرپ سین اس
بات سے بہوت غمگین ہوا ہات باندھ کر کھڑے رہا اور التماس کیا کہ ای صاحب
جیسا عمل کیا تھا ویسی سزا کو پہنچا میں اور صاحب کے حکم سے کچھ علاج نہیں
رکھتا ہوں میں جیسی رضا حکم ہووے اسی طرح بندا ہوں گا میں لیکن امیدوار اس بات
کا ہوں کہ میری تین ظاہر فرما دیں کہ پھر کب خدمت میں آوں گا۔ اور کتی روز
رہوں گا میں۔ دوسری غرض یہ ہے کہ دن کو گدھے کی صورت میں اور وقت
رات کے اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوں میں اور غسل فرما کر اللہ تعالیٰ کی عبادت
میں مشغول رہوں میں۔ جب راجہ اندر جواب دیا جس طرح تو کہتا ہے ایسا ہی
ہووے گا۔ لیکن جب تو گدھے کی صورت میں آوے گا ایک راجہ پوست تیرا
جلا دے گا وہ راجہ کے لڑکے سے تجھ کو فرزند پیدا ہوگا پیچھے اس گدھی کے صورت

Hanif Raza

سے خلاصی پاکر پھر اندر لوک میں آوے گا۔ کندرپ سین یہ بات سنا اور راجہ اندر کے حضور سے رخصت ہوکر زمین پر آیا اور ایک کمار کے گھر میں گدھے کی صورت میں پیدا ہوا۔ :

اس طرح قصہ میں بتایا گیا ہے کہ اس شخص سے راجہ بھوج پیدا ہوتا ہے وہ تخت پر بیٹھنا چاہتا ہے تب اسے پتلیاں کہانیاں سناتی ہیں آخری پتلی کی کہانی ذیل میں دی جاتی ہے :

: ایک پتلی ان پتلیوں میں سے پدمنی نام رکھتی تھی ایک مرتبہ ہنسی اور کہی کہ راجہ بھوج یہ تخت شاہی کا اس راجہ بکرماجیت کا ہے جو کوئی مانند اس کے سخاوت کرے اور کام مشکل کو آسان فرماوے وہ شخص لایق ہے کہ اس تخت پر بیٹھے راجہ بھوج وہ حقیقت کس طرح ہے تب پتلی کہی کہ راجہ بکرماجیت اوجین کے شہر میں تخت پر بادشاہی کے بیٹھا تھا۔ اس کے بادشاہت کو میں ایک سنار بہت نادر کاریگر تھا ایک روز آیا سنار راجہ کی خدمت میں اور زمین بوسی کیا اور تسلیمات بجالایا موافق اپنے مرتبہ کے ہات باندھ کر کھڑا پیچھے یک ساعت کے بادشاہ اس کو نزدیک بلایا حکم کیا کہ تخت بہوت تحفہ سونے اور روپے کا شتابی سے تیار کر اور اس پر لعل و جواہر کا کام آراستہ کرکے ہمارے واسطے لے آ۔ وہ سنار تسلیمات کیا...... :

آخر کار پتلی بتاتی ہے کہ یہ وہی تخت ہے جو راجہ بھوج کو ملا۔ اختتام اس عبارت پر ہوتا ہے :

: رحمت اوپر راجہ بھوج کے اور تعریف کالی داس شاعر کو وہ مجلس کے دانشمندوں کی فرمایا اور وہاں سے رخصت ہوکر طرف راجہ اندر کے روانہ ہوا۔ بعد از رخصت ہونے اس کے راجہ بھوج سبھوں کو خلعتاں بخشا اور انعام بہوت فرمایا۔ تمام خوش وقت ہوئے اور دعا کیے کہ اے پروردگار اس راجہ کو سلامتی دے اور ہمیشہ درست قایم رکھ :

کام روپ و کام لتا | یہ قصہ بھی ہندوستان کے مشہور قدیم قصوں میں سے ہے۔ اس کے

مصنف کا پتہ نہیں چلتا۔ مرتب مقالہ کو اس کا مواد اور ترجمہ کتب خانہ سالار جنگ میں دستیاب ہوا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے ایک انشا پرداز میر محمد کاظم حسین کریم نے کام روپ وکام لتا کے قصے کو : کام روپ : کے نام سے لکھا تھا[۱]۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میر محمد کاظم حسین کے قصے کا ماخذ کیا ہے۔

اورنگ زیب کے عہد میں میر بخشی ہمت خان میران نے اس قصہ کو فارسی نثر میں لکھا تھا۔ لیکن قصہ مکمل کرنے کے بعد ہی ہمت خان کا انتقال ہو گیا اور ان کی یادگار میں ان کے ہم صحبت محمد مراد نے ۱۰۹۶ھ میں ہمت خان کی تصنیف کو : دستور ہمت : کے نام سے نظم کیا۔ ریو نے اپنے کیٹلاگ میں اس کا سنہ تصنیف ۱۰۹۶ھ لکھا ہے[۲]۔ گارساں دتاسی کے قول کے مطابق یہ مثنوی ۱۱۱۵ھ میں لکھی گئی۔

اُردو میں اس کا منظوم ترجمہ پہلے تحسین الدین نے کیا اور اس نظم کا نام : قصہ کام روپ وکام لتا : رکھا۔ اس کے متعلق گارساں دتاسی لکھتا ہے :

: یہ وہ قصے ہیں جن میں تخیل نے تاریخ سے مل کر اپنی صنعت دکھائی ہے۔ ان کے بعد ایسے قصے آتے ہیں جن کی بنیاد محض تخیل پہ ہے۔ میرے خیال میں کام روپ کا قصہ بھی اسی تحت میں آتا ہے۔ یہ عجیب قصہ ہے اور ہندستانی نظم ونثر میں بہت سے مصنفوں نے اسے لکھا نظم میں تحسین الدین۔ ضیغم۔ آرزو۔ حسن۔ اور سراج الدین پانی پتی نے طبع آزمائی کی۔ :[۳]

آگے چل کر ڈی تاسی لکھتا ہے :

: کتنے ہیں سندباد کا قصہ جو : الف لیلیٰ : میں ہے اور سن بران دین کا قصہ جو میری دی فرانس کی تالیف ہے ان کی اصل یہی ہے[۴] :

---

[۱] کیٹلاگ برٹش میوزیم مرتبہ ریو

[۲] " " " "

[۳] خطبات گارساں ڈی تاسی صفحہ ۱۵۵

[۴] " " " صفحہ ۱۵۵

اس کے منظوم اُردو ترجموں کے علاوہ مندرجہ ذیل نثری ترجمے ملتے ہیں :

۱- دکھنی ترجمہ جس کے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتہ نہ چل سکا۔

۲- اُردو نثر میں کندن لال لاہوری نے ۱۸۴۹ء میں اس کو لکھا۔ کندن لال نے محمد مراد کی مثنوی : دستورِ ہمت : کے پہلے باب کا ترجمہ کیا ہے۔

۳- تیسرا : مرغوب الطبع : کے نام سے سید حسین علی خان نے ۱۲۴۸ھ میں اُردو نثر میں ترجمہ کیا۔ جس کے متعلق ڈاکٹر زور : تذکرہ اُردو مخطوطات : جلد اول میں لکھتے ہیں :

: یہ کتاب دراصل فارسی قصہ : کام روپ : کا اُردو نثر میں ترجمہ ہے۔ اس کے مولف سید حسین علی خان حیدرآباد کے طبقہ شرفا و جاگیرداروں میں سے تھے : [۱]

چونکہ ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۴۹ھ کا زمانہ فورٹ ولیم کالج کے بعد کا ہے۔ اس لیے یہاں صرف اُس دکھنی ترجمہ پر روشنی ڈالی جائے گی جس کا مخطوطہ [۲] کتب خانہ سالار جنگ میں دستیاب ہوا۔ مخطوطہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تاریخ تصنیف ۱۱۸۰ھ ہے۔ اس کا کاتب ابو القاسم ہے۔ لیکن اس کے مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ مخطوطے کے کل ۶۲ صفحات ہیں۔ ان کی اصل یہی ہے۔

اس کا قصہ شہزادہ کام روپ اور کلا کی داستانِ عشق ہے جس میں شہزادہ ایک شہزادی کو خواب میں دیکھ کر اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

: ایک بادشاہ تھا جو ملک اودھ پر حکومت کرتا تھا۔ وہ مسلمان نہیں تھا جس طرح آج کل اس علاقے کے نواب ہیں وہ رام کی اولاد میں تھا۔ مگر شاعر نے اس کا نام نہیں بتایا وہ ہمیشہ اس کا ذکر مہاراجہ کے نام سے کرتا ہے۔ اس کے

۱- اس کا مخطوطہ ادارہ ادبیاتِ اردو میں محفوظ ہے۔ فہرست اُردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۱۶۴

۲- مخطوطہ نمبر ۹۲

Hanif Razvi

کوئی اولاد نہیں تھی۔ اولاد کی خاطر اس نے اپنے دارالسلطنت اودھ پور میں فقیر فقرا میں خوب خیرات تقسیم کی۔ دیس دیس کے درویش اس کے ہاں جمع رہتے تھے۔ بالآخر ایک درویش نے اسے : شری : کے پھل کا تحفہ دیا۔ اور رانی سے اسے کھانے کی درخواست کی۔ رانی کا نام سُندر روپ تھا اس نے یہ پھل چکھا اور معاً اسے اس کا اثر محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ اعلیٰ عہدہ داروں کی چھ بیویوں نے بھی اس پھل کو چکھا وہ سب کی سب حاملہ ہو گئیں۔ راجہ کے ہاں جب ایک شہزادہ روشن تولد ہوا تو اسی روز ان سبھوں کے ہاں بھی لڑکے تولد ہوئے شہزادے کا نام کام روپ تجویز ہوا اس مبارک گھڑیوں کے بعد کئی دن تک خوشی کے شادیانے بجے اور سونے چاندی کے ڈھیر بطور نذرانہ بادشاہ کو پیش کیے گیے رقص و سرور کی محفلیں منعقد کی گئیں۔ نوخیز لڑکوں اور خوش ادا ناچنے والیوں نے اپنے ناچ رنگ سے اہلِ محفل کے دلوں کو خوب گرمایا پنڈتوں نے شہزادے کا جنم پتر دیکھ کر بتایا کہ بارہ سال کی عمر میں اس کا دل محبت کی کسک سے آشنا ہو گا۔ اور ساتھ ہی اسے بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے بادشاہ کے دل کو بڑی تشویش ہوئی۔ دن رات اسی ادھیڑ بن میں رہتا چنانچہ اس نے حکم دیا کہ شہزادے کو ١٢ سال کے سن تک ایک قصرِ عالی شان میں ان چھ بچوں کے ساتھ رکھا جائے جو اس کے ساتھ تولد ہوئے تھے اس محل کے چاروں طرف باغات تھے یہاں ہر وقت اس کی حفاظت کی جاتی تھی کام روپ اور اس کے چھ ساتھیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی پورا خیال رکھا گیا۔ جب شہزادے نے عمر کی پانچویں سال میں قدم رکھا تو اسے ننھی سی سونے کی تختی پر لکھنا سکھایا گیا۔ اسے پہلا سبق فنِ حکومت پر دیا گیا۔ وزیر کے بیٹے متر چند کو انتظام ملکی۔ بادشاہ کے طبیب کے بیٹے کنول روپ کو فنِ طب اور جوہری کے بیٹے مانک کو ہیرے جواہرات کی پرکھ سکھائی گئی۔ دربار کے منجم کے بیٹے اچھا راج کو

اختر شناسی اور دینیات کی تعلیم دی گئی۔ بادشاہ کے نقاش کے بیٹے چترمان کو فن نقاشی سکھایا گیا اور درباری کے بیٹے رس رنگ کو فن موسیقی کی تعلیم دی گئی۔ یہ سب بچے خوش وقتی سے اپنے وقت صرف کرتے۔ کبھی پڑھتے لکھتے کبھی سیر تفریح کو جاتے اور کبھی شکار کھیلتے مگر قسمت کا لکھا مٹائے نہیں مٹتا۔ جب شہزادہ بارھویں سال میں قدم رکھا تو ایک دن ہونے والی بات گرمی شدت کی تھی۔ کامروپ کی آنکھ لگ گئی خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک دلفریب باغ میں بیٹھا ہے۔ اس باغ میں ایک شہزادی رہتی تھی جو اپنے حسن وجمال میں نظیر نہیں رکھتی تھی۔ اس کا نام کلا تھا۔ وہ سراندیپ کے راجہ کی بیٹی تھی۔ اس کی گردن ہنس کی سی منہ کنول کا سا اور قد و قامت شیرنی کے مثل تھا۔ اس کے پاؤں میں گھونگرو پڑے ہوئے تھے۔ جب وہ چلتی تھی تو اس سے آواز نکلتی تھی۔ اس کے ہاتوں میں حنا لگی ہوئی تھی۔ سر کے بال جواہرات سے آراستہ تھے۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں کو مسّی نے باکیف بنا دیا تھا۔ اس کی حسین سہلیاں باغ کے گھنے درختوں میں چہلیں کرتی پھرتیں۔ اور وہ سب کی سب سرخ جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھیں یہ عجیب بات ہے کہ ادھر تو کامروپ نے کلا کو خواب میں دیکھا اور ادھر کلا نے شہزادے کو خواب میں دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے پر دل وجان سے فریفتہ ہو گئے۔ عشق کے تیر نے دونوں کو گھائل کیا پہلے ان دونوں نے اپنا اپنا احوال ایک دوسرے کو سنایا اور پھر وہ دونوں ابدی محبت کی زنجیر میں جکڑ گئے۔

کامروپ کی آنکھ کھلی تو وہ بوکھلایا ہوا سا تھی اس کے دل

میں کلا کے سوا کسی جگہ نہیں تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کی تصویر پھرتی تھی۔ اسے اس کی میٹھی سریلی آواز رہ رہ کے یاد آتی تھی۔ باوجود ان تمام باتوں کے کامروپ کے ذہن سے اس پری جمال کا نام بالکل محو ہو گیا اسے کلا کے خد و خال بخوبی یاد تھے۔ وہ تو اس کے دل ایسے نقش ہو گئے تھے جیسے پتھر پر لکیر۔ ادھر کلا کی بھی یہی حالت تھی۔ شہزادے کے ہم جلیسوں نے جب اس کا یہ حال دیکھا جب انھیں اس کی اندرونی کیفیت کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ شہزادے کی آنکھیں ہر وقت آنسوؤں سے تر رہتی تھیں۔ کوئی اس سے بات کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ سنتا ہی نہیں۔ بالآخر بڑی کوششوں سے مترچند نے شہزادے کے دل کا بھید معلوم کر لیا۔ اسے شہزادے سے بڑا انس تھا۔ بادشاہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس تدبیر پر عمل کرنے کی ٹھانی۔ جو وہ پہلے بھی ایک دفعہ کر چکا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کی ساری دولت خیرات میں بے دریغ لٹا دی جائے ملک ملک کے پردیسیوں کو دعوتیں دی جائیں۔ جب پردیسی لوگ اس کے ہاں جمع ہوئے تو اس نے ان سے فرمائش کی کہ کامروپ کے روبرو اپنی اپنی سرگزشت بیان کریں اسی سلسلہ میں ایک برہمن بھی آیا۔ یہ برہمن اس مندر کا نگران کار تھا جہاں کلا خواب کے بعد پوجا کرتے گئی تھی۔ کلا نے اس برہمن سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی خاطر گم شدہ شہزادے کو ڈھونڈ لائے جس نے اس کے دل کے سینے میں موہ لیا تھا۔ چنانچہ بادشاہ راجپت نے کامروپ کو اس کے چھ رفیقوں کے ہمراہ سراندیپ جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہاں پہنچ کر وہ پری

Hanif Razvi

جمال کلاَ سے بہ نفس نفیس درخواست کر سکے۔ پنڈتوں نے روانگی کی نیک گھڑی مقرر کی شہزادہ اپنی ماں سے رخصت لینے کی غرض سے گیا۔ ماں نے نیک شگون کے لئے اس کے ماتھے پر دھی کا نشان لگا دیا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ پہلے وہ سب مقام ہنگلی گئے۔ اس مقام پر سے سراندیپ نظر آتا ہے۔ بلکہ ایک سمت سے دور سے وہ مندر بھی دکھائی دیا جس میں کلاَ پوجا کیا کرتی ہے۔ اسی دوران میں سمندر میں بلا کا طوفان اٹھا۔ ان کا جہاز موجوں کے تھپیڑوں سے پاش پاش ہو گیا۔ اور آٹھوں مسافر ایک ایک تختے پر بیٹھے رہ گئے۔ سمندر کے لہریں انھیں کبھی ادھر کبھی ادھر لئے پھرتی تھیں کچھ عرصے کے بعد کامروپ کا تختہ کنارے پر آلگا۔ اترا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں سوائے جنگل کے کچھ نہیں۔ جنگلی پھل کھا کر رات میں وہ ایک درخت پر چڑھ گیا۔ دوسرے دن پھرتا پھراتا ایک باغ میں پہونچا۔ یہ باغ تریا راج کی رانی راوتا کا باغ تھا۔ یہاں کسی آدمی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ کامروپ کی خوش قسمتی کہ اس نے راوتا کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ وہ خود کلا کو اس نئی محبت میں بھول چلا تھا۔ ایک رات کلاَ خواب میں آئی اور اس نے کامروپ کو خوب لعنت ملامت کی اور کہا کہ وہ عزت سچائی اور انصاف کے اصول سے بالکل بیگانہ ہے۔ اس خواب کے بعد کامروپ راوتا کے باغ سے نکل بھاگا کچھ دور چل کر وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا ایک پری اسے کوہ قاف اٹھائے گئی۔ کوہ قاف دیوؤں اور رکھشوں کا مخزن ہے۔ اس پری کا جو کامروپ کو اٹھا کر لے گئی تھی ایک چاہنے والا تھا۔ اس کے سینے میں آتش حسد بھڑک اٹھی ایک دن موقع پا کر

وہ کامروپ کو اٹھا لے گیا۔ اور اسے سمندر میں پھینک دیا۔ بہتا بہتا وہ سراندیپ کے ایک جزیرے کے کنارے آلگا۔ اس جزیرہ میں تینار رہتا تھا۔ اس جزیرے والوں کی یہ خصوصیت تھی کہ اگر وہ کسی بھولے بھٹکے مسافر کو پکڑ پاتے تو اس سے سواری کا کام لیتے چنانچہ کامروپ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ ایک شخص اس کے کاندھے پر سوار ہو گیا اور کوڑے مار مار کر اسے ہانکنے لگا۔

اتفاق کی بات ایک دن کامروپ کو کچھ انگور مل گئے اس نے اس کا عرق نکال کر شراب بنائی اور اہل جزیرہ کو پلائی اور جزیرے والوں کو شراب کا چسکا لگ گیا تو ایک دن ان سبھوں نے خوب جی بھر کے پی کامروپ اور ان بدقسمت لوگوں نے جو اس سے پہلے یہاں گرفتار ہو چکے تھے اس موقع کو غنیمت سمجھا جس نے شراب پی تھی اس کی عقل ٹھکانے نہیں رہی تھی پھر کیا تھا ان لوگوں نے بہت بدمستوں کو چن چن کر قتل کیا اور پھر خود آزاد ہو کر بھاگ نکلے ان میں سے ایک شخص جب شہزادہ کامروپ کو دیکھا تو وہ اس کے پاؤں پر آکر چمٹ گیا۔ یہ شخص متی چند وزیر کا بیٹا تھا۔ جو کامروپ جگری دوست تھا۔ اسے ایک دیو اٹھانے گیا تھا بہت دنوں وہ ایک غار میں رہا اس کے ساتھ جو دوسرے غار میں تھے انھیں سب کو دیو چٹ کر گئے۔ مگر اسے چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنی جان کی زیادہ فکر اور پروا نہیں تھی راکشسوں کو اس کی یہ ادا پسند آئی انھوں نے اسے رہا کر دیا۔ اور ایک نے اپنے سر کے تھوڑے سے بال دے اور کہا کہ جب کبھی تجھے کوئی مصیبت پیش آئے تو ان بالوں کو جلانا اور وہ فوراً اس کی

مدد پر پہنچ جائے گا کامروپ اور منوچند آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ایک طوطا اڑ کر شہزادے کے ہاتھ پر آبیٹھا۔ جیسے وہ پہلے سے اس سے واقف تھا۔ طوطے کی ٹانگ میں ایک دھاگا بندھا ہوا تھا۔ اس کے کھلتے ہی وہ طوطا آدمی بن گیا۔ ان دونوں دوستوں نے پہچان لیا کہ ہو نہ ہو یہ اچھا راج ہے۔ اس نے اپنی سرگزشت یوں بیان کی کہ اسے ایک پری اٹھا لے گئی اپنی خوشی سے اس نے اسے طوطے کی روپ میں تبدیل کر دیا اور اس کی ٹانگ میں ایک طلسمی دھاگا خوب مضبوطی سے باندھ دیا ایک دن وہ پری کو دھوکا دیکر اس کے پاس سے اڑ آیا یہ تینوں دوست جا رہے تھے کہ راستے میں ایک برہمن سے مڈبھیڑ ہوئی برہمن نے جانے کا سبب پوچھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ کامروپ اس رانی کا بیٹا ہے جسے اس نے پُراسرار پھل کھلایا تھا تو بہت خوش ہوا اور اسے ایک پارس پتھر دیا۔ اس طرح وہ پتھرے کر آگے بڑھے کہ انہیں ایک نیا مسافر ملا جو چترمن تھا۔ چترمن کلا کے باپ کے دربار میں ملازم تھا کامراج بھی اس کی ہنرمندی سے بہت خوش تھا ایک مرتبہ وہ بہت بیمار پڑ گیا اس کا علاج کرنے جو طبیب آیا وہ اتفاق سے کنول روپ تھا اس طرح بچھڑے دوست مل گئے۔ چترمن نے اس وقت کی ایک تصویر بنائی اسے دیکھ کر کلا جو فراق میں بیمار پڑی تھی بہت خوش ہوئی اور اس اس کی حالت بہتر ہو گئی۔ کامراج بیٹی کی صحت یابی سے مسرور ہوا اور اس نے سوئمبر منعقد کروایا۔ سوئمبر میں کلا نے کامروپ کے گلے میں مالا پہنائی آخر دونوں کی شادی ہو گئی۔

اس طرح کامروپ کا کردار ہومر (   ) کے مشہور ہیرو یولی سس (   )

Hanif Razvi

سے بہت ملتا جلتا ہے اس کے کچھ واقعات "رانی سن کرمو" سے بھی ملتے جلتے ہیں اس کی زبان صاف ستھری اور جدید دور کی زبان سے بہت قریب ہے ذیل میں اس حصہ کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے :-

"کنور کام روپ وہاں سیر و شکار کو جاتا تھا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ راجہ شکار سے فارغ ہو کر عمارت میں آبیٹھا اور چھ شخص جو اس کے رفیق تھے وہ بھی حاضر تھے مترچند کا بیٹا جو بہت عاقل تھا۔ دوسرا بدیا چند پنڈت کا بیٹا کہ نجومی خوب تھا۔ تیسرا دنتر حکیم کا بیٹا کہ حکمت میں پورا تھا۔ چترمن مصور کا بیٹا کہ تصویر کھینچنے میں ہوشیار تھا۔ پانچواں نانک چند جوہری کا بیٹا کہ جواہر خوب پرکھتا تھا۔ چھٹا رنگ رس کلانوت کا بیٹا کہ خوب گاتا تھا"۱

قصہ ملکہ زماں و کام کندلا فارسی کی ایک داستان "جواہر سخن" کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ مترجم کا نام معلوم نہ ہوسکا سنہ کتابت ۱۲۳۴ ہجری ہے اندرونی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فورٹ ولیم کالج سے قبل کی تصنیف ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں بھی مظہر علی خان ولا نے موتی رام کیشو کے ہندی قصے "مادھونل اور کام کندلا" کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ لیکن یہ قصہ مختلف ہے اس کا نام "ملکہ زماں اور کلم کندلا" ہے مترجم اردو کو "کرناٹکی" سے موسوم کرتا ہے۔ اور اپنا ماخذ ایک فارسی تصنیف "جواہر سخن" کو بتاتا ہے۔ جبکہ مظہر علی خاں ولا کا ماخذ موتی رام کیشو کا ہندی قصہ ہے۔ "مادھونل اور کام کندلا" مکمل نہیں چھپی مظہر علی ولا نے مادھونل اور کام کندلا میں ایک برہمن مادھونل اور رقاصہ کام کندلا کی عشق و محبت کی داستان بیان کی ہے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے بیاض ہندی میں اس کا ایک اقتباس شامل کیا کیا تھا اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۲ قصہ ملکہ زماں و کام کندلا میں

---

۱ ارباب نثر اردو صفحہ ۱۷۴
۲ " " " ۱۷۴

Hanif Razvi

کام کندلا راجہ اندر کے اکھاڑے کی ایک پری ہے اسے ملکہ زماں کے بیٹے یعنی شہزادے سے محبت ہو جاتی ہے۔ بڑی کوششوں اور ملکہ زماں کی عقلمندانہ ترکیبوں سے بالآخر دونوں کا بیاہ ہو جاتا ہے۔ اس قصہ میں کل چودہ حکایتیں ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:۔

آغاز:۔ خدا کا حمد اور پیمبر کا نعت بشر کہاں کر سکتا ہے اس واسطے اس عاصی نے اپنی مدعا بر آ بیان کرتا ہے"

جواہر سخن یک قصہ عجیب نظم سے ہے۔ اس کو نثر میں کرناٹکی محاورے سے نو آموز سرداران والاشان کی پڑھنے کی خاطر لکھا ہوں اگر اس میں کچھ ہوا دی تو دیکھنے ہاری کو لازم ہے اپنی مہربانی سے درست کر مجھ پر احسان فرمانا عین سرفرازی ہے

یہ کل چودہ حکایتیں ہیں

پہلی حکایت	شہزادہ پیدا ہوا سو بیان ہے۔
دوسری حکایت	شہزادہ نامہ وزیرزادہ کے نام سے لکھتے ہیں۔
تیسری حکایت	وزیرزادہ کا شہزادی کا جواب لکھ روانہ کرتا ہے۔
چوتھی حکایت	شہزادہ اور وزیرزادہ مل سفر کرنا اس بیان میں ہے۔
پانچویں حکایت	شہزادہ اور وزیرزادہ پھر کر آنا شہر کو اس بیان میں
چھٹی حکایت	ملنے جانا بادشاہ کام بخش سوداگر کامیاب سے شہزادے کی نسبت مانگنی اس بیان میں ہے۔
ساتویں حکایت	رخصت ہو جانا ملکہ زماں اپنی گھر اس بیان میں ہے۔
آٹھویں حکایت	اقرار نامے لے جانا ملکہ زماں رضامندی کا اور شادی ہونا۔
نویں حکایت	روانہ ہو جانا شہزادہ باغ سے حاصل کر حکمت

کی سواری باغبان سے اپنے دل کا مقصد حاصل کرنے اس بیان میں ہے۔

دسویں حکایت — طلب کرنا راجہ اندر کام کندلا کیتین اپنی حضور اس بیان میں ہے۔

گیارہویں حکایت — جانا شہزادہ باغبان پاس اور ظاہر کرنا چار خواب کا بیان اور مشورت کا اس نے اس بیان میں ہے۔

بارہویں حکایت — مصلحت دینا کام کندلا شہزادی کیتین اس بیان میں ہے۔

تیرہویں حکایت — بلانا راجہ اندر کام کندلا کو اپنی حضور دوسری دفعہ۔ اور اطلاع پا جانا شہزادہ اس کی ہمراہ اس بیان میں ہے۔

چودھویں حکایت — رخصت ہونا شہزادہ اور کام کندلا مقصد بار راجہ اندر سی اور اپنی محل کو آنا بڑی شان سے۔ اس بیان میں ہے۔

قصہ جنگ امیر حمزہ — امیر حمزہ کی بہادری کی داستانیں قدیم قصوں کا دلپسند موضوع ہے۔ چنانچہ فارسی اور عربی میں ان کی شجاعت اور بہادری کے متعلق کئی قصے لکھے گئے۔ ببلیوتھک نیشنال پیرس میں امیر حمزہ کی داستان کا ایک خلاصہ ہے جو ۲۲ ابواب پر مشتمل ہے[1]۔ اس کی تاریخ کتابت سنہ ۱۱۹۸ ہجری ہے۔ اس داستان کو فورٹ ولیم کالج کے انشاپرداز خلیل علی خاں اشک نے بھی

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۶۲۵

ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمایش پر اُردو میں لکھا تھا اس کے متعلق اشک کا بیان یہ ہے۔

مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے۔ انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیاں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک داستان حضور میں سناتے تھے۔ انعام و اکرام پاتے تھے اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سنہ ۱۲۱۵ ہجری سنہ ۱۸۰۱ع کے خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشک ہے حسب خواہش مسٹر گل کراسٹ صاحب عالی شان والامناقب بنا بر آموزان زبان ہندی اس قصے کو اُردوئے معلی میں لکھا تاکہ صاحبان مبتدیاں کے پڑھنے کو آسان ہوئے۔

خلیل علی خاں کے بعد داستان امیر حمزہ کو منشی نول کشور نے حافظ سید عبداللہ بلگرامی سے مرتب کرا کے شایع کیا۔ پھر مطبع نول کشور کے مشہور مصنف سید تصدق حسین نے اس کو اپنے طرز پر فسانہ عجائب کے رنگ میں مقفی و مسجع لکھا۔

امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا

بعد کے لوگوں نے اس ایک قصے کو طول دے کر بڑی ضخیم کتابیں طلسم ہوش ربا طلسم ہفت پیکر وغیرہ تیار کرائیں نہ صرف یہ بلکہ اس داستان کی مقبولیت نے اسی طرح کی طویل داستانوں کی تصنیف کا ذوق پیدا کر دیا ایسی داستانوں میں فارسی بوستانِ خیال مصنفہ میر تقی خیال کا اردو ترجمہ "دو حتہ الابصار" خاصے مشہور ہیں جس کا مرزا محمد عسکری نے ترجمہ کیا ہے۔

امیر حمزہ اور دوحتہ الابصار

یا بوستانِ خیال اس کتاب کی شانِ نزول جیسا کہ مصنف میر تقی خیال نے خود لکھا ہے کہ یہ تھی وہ

گجرات کے رہنے والے تھے کسب معاش کی خاطر دہلی گئے وہاں ایک زن مطربہ رہتی تھی اس کی فرمائش تھی کہ وہ اسے روزانہ ایک قصّہ سنایا کرے۔ چنانچہ وہ روزانہ ایک قصّہ سناتے تھے اس مکان کے پچھواڑے میں ایک جلسہ ہوا کرتا جس میں داستانِ امیر حمزہ روزانہ پڑھی جاتی تھی۔ ایک وزیر صاحب وہاں موجود تھے۔ جب جلسہ برخاست ہوا تو انھوں نے کہا کہ اس سے بہتر کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کو تحریر کرکے اس جلسہ میں پڑھا۔

اس کے کرداروں میں ایک دلچسپ کردار عمر عیّار کا ہے جو اسم با مسمیٰ بے حد عیار ہیں۔ ایک خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کی تہذیب و تمدن کے علاوہ ہر سوسائٹی کا نقشہ ہو بہو پیش کرتی ہے۔ رزم بزم کے واقعات کے علاوہ عورتوں اور مردوں کی حالت مخصوص نسوانی اصطلاحات وغیرہ اچھی طرح بتائے ہیں۔ عبادت کا رنگ اور صحیح ہے۔

"قصہ جنگ امیر حمزہؒ" کے بارے میں مرتب مقابلہ کی معلومات کا ماخذ نصیر الدین ہاشمی کی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" ہے۔ موصوف نے اس کی عبادت کا کچھ اقتباس بھی دیا ہے جو درج کیا جاتا ہے۔

داستان اول ابراہیم خلیل اللہ خدا کے دوست ان کے عہد میں جتا بادشاہ اور وزیر سب رہتی تھی۔ آگ کے پوجنے والا قباد نام بادشاہ کے دو وزیر تھا ایک کا نام خواجہ بخت جمال دوسرے کا نام النقش ان دونوں میں بڑی دوستی تھی۔

داستان چہارم بزرجمہر حکیم کا اون مکہ اور پیدا ہونا امیر حمزہ مہتاریکی شکم سوں۔ اس کی باتیں کتاب کے موافق بیان کرتے ہیں مکہ کے درمیان اسمٰعیل پیغمبر کی اولادوں میں یک مرد بزرگ عبدالمطلب نام رہتے تھے۔ بڑا جہان پرست اور خدا دوست"

Hanif Razvi

قصۂ گل و ہرمز یہ قصہ اصل میں فارسی میں تھا جس کا دکھنی نثر میں ترجمہ کیا گیا ہے اس کتاب کا مخطوطہ انڈیا آفس کتب خانہ میں ہے۔ جس کا حال نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" سے معلوم ہوتا ہے[1]۔

راقم الحروف کو اس کا کوئی نسخہ نہیں مل سکا نصیر الدین صاحب ہاشمی نے مخطوطہ کے مصنف کا نام اور سنہ تصنیف نہیں بتایا لیکن شمس اللہ قادری اپنے مضمون "کتب خانہ انڈیا آفس کے اردو مخطوطات"[2] میں مصنفین کے نام محمد خاطر اور شمشیر علی درج کئے ہیں۔ قصہ کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

روم کے ایک بادشاہ کو اولاد نہیں تھی جس سے وہ متفکر رہا کرتا تھا۔ آخر ارکان دولت سے مشورہ کیا تو انھوں نے ایک روشن دل فقیر کا پتہ بتایا بادشاہ فقیر سے رجوع ہوا فقیر نے پڑھنے کے لئے ایک دعا دی اور کہا کہ خواب میں شہدا کا دیدار ہوگا ان سے اپنی مراد مانگ بادشاہ نے اس ہدایت پر عمل کیا جس کے بعد ہرمز تولد ہوا لیکن سوتیلی ماں کی وجہ سے اس کی پرورش محل میں نہ ہو سکی۔ ایک مالی نے پالا پوسا خوارزم کی شاہزادی گل اس پر عاشق ہوئی۔ بڑی دقتوں کے بعد دونوں کی شادی ہو گئی۔

زبان گیارھویں صدی کی طرح کسی قدر صاف ہے مثلاً:-

"نقل ہے کہ ایک بادشاہ تھا روم شہر میں جہاں ووکے تابع تھا اور سب ملک کے بادشاہ اس کی تابعداری کرتے تھے اور خزانہ بھیجتے تھے۔ اس کو لوگ چھوٹے بڑے اس کو قیصر رومی کہتے۔ اسکو سب اسباب خوشی کا اور دولت وحکومت میسر تھا"

---

[1] "یورپ میں دکھنی مخطوطات" صفحہ ۵۹۵ [2] "مطبوعہ رسالہ اردو"

قصہ انار رانی

اس قصہ کی معلومات بھی مرتب مقالہ کو نصیر الدین صاحب ہاشمی کی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" سے ہوئیں۔

راقم الحروف کو اس کا مخطوطہ دستیاب نہ ہو سکا۔ یہ مخطوطہ کتب خانہ انڈیا آفس کا مخزونہ ہے۔ اس کے مصنف اور تاریخ تصنیف کے بارے میں ہاشمی صاحب کو بھی کچھ پتہ نہ چل سکا۔ سرنامہ کی عبارت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نثر میں لکھی گئی ہے۔ زبان کے انداز اور اسلوب کے لحاظ سے یہ بھی فورٹ ولیم کالج سے قبل کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیٹ لاک میں حسب ذیل صراحت کی گئی ہے۔

"دکھنی نثر میں شہزادی انار کی داستان جو ایک پریوں کی کہانی ہے[1] یہ کہانی بھی "سب رس" اور "گل بکاولی" کی طرح کھوج کی کہانیوں سے تعلق رکھتی ہے۔"

قصہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ کو اولاد نہیں تھی۔ منت مراد کے بعد چار بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے چوتھا بیٹا ( ) ثابت ہوتا ہے۔ اسے کہیں سے انار رانی کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور وہ اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ ایک جوگی کی مدد سے شہزادی تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ راستہ میں اسے بہت سے مصائب سے گزرنا اور دیو پریوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جوگی کے بتائے ہوئے طریقے سے شہزادہ ان مشکلات پر قابو پا لیتا ہے۔ اور اس طرح انار شہزادی اسے مل جاتی ہے۔

جب وہ انار شہزادی کو ساتھ لے کر وطن واپس ہوتا ہے تو راستہ میں اس کے غیاب میں ایک بدصورت دھوبن انار شہزادی کو کنوئیں میں ڈھکیل کر خود اس کے کپڑے پہن لیتی ہے شہزادہ واپس آکر بڑا پریشان ہوتا ہے کہ انار جیسی

---

[1] "یورپ میں دکھنی مخطوطات" صفحہ ٦١٣

Hanif Raza

حسین شہزادی یکایک اس بدصورت میں کیسے تبدیل ہوئی۔ لیکن مجبوراً اُسے اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔ اس اثنا میں انار نقل روح کر کے ایک خوب صورت پھول بن جاتی ہے جس کی اتنی شہرت ہوتی ہے کہ ہر شخص اس کے حصول کے درپے ہوتا ہے۔ یہ شہزادہ بھی قسمت آزمائی کے لئے پہنچتا ہے اور خوش قسمتی سے پھول حاصل کر کے لوٹتا ہے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد نقلی انار رانی یعنی دھوبن کو اس پھول کی حقیقت کا علم ہو جاتا ہے اور وہ اسے بھی ایک کنوئیں میں پھنکوا دیتی ہے۔ اس طرح متعدد بار انار رانی یعنی دھوبن کا راز فاش ہو جاتا ہے اور شہزادہ اسے موت کے گھاٹ اتار کر اصلی انار رانی کو دوبارہ پا لیتا ہے۔

پورا قصہ نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کا ماخذ بھی کوئی فارسی کتاب تھی کیونکہ (   ) یا تبدیلیت اور نقل روح کی یہ داستانیں یونانی ادب کی طرح[1] فارسی ادب میں بھی بہت مقبول رہی ہیں۔

قصہ کی زبان گیارہویں صدی ہجری کے اواخر یا بارہویں صدی کے اوائل کی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہے:-

"کہنے ہارے خبروں کے ہور عاقلاں آگے نے کہے ہیں کہ بیچ ملک ہندوستان کے ایک بادشاہ تھا کہ سخاوت جوانمردی اور عدالت میں مانند اس کے دنیا میں کم اور خزانے اور سونا روپیہ اور زر و جواہرا اور اسباب و سپاہ حد سے زیادہ تھے۔"

قصہ بندگان عالی

اس قصے کا نسخہ بھی انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور اس کے بارے میں معلومات مولوی نصیر الدین ہاشمی

۱؎ اوڈ کی "میٹا مارفوسس" اس کی بہترین کتاب ہے۔

Hanif Razvi

کی تصنیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات"[1] سے ماخوذ ہیں۔ یہ کہانی خلیفہ ہارون رشید سے متعلق ہے۔ اس کے مصنف اور سنہ تصنیف کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اس قصہ میں بھی ہارون رشید کو برطانیہ کے شاہ آرتھر کی طرح ایک پُراسرار شخصیت کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جس کے اطراف کئی کہانیوں کے جال بنے گئے ہیں چنانچہ عربی کی مشہور داستان "الف لیلیٰ" میں بھی بعض کہانیوں کا ہیرو ہارون رشید ہی ہے۔

یہ کہانی بہت زیادہ دلچسپ نہیں اور اس زمانے کے مقبول عام قصوں کے برخلاف کہانی کو آگے بڑھانے کے لیئے "طلسمات جادو" "نقل روح یا تلاش" وغیرہ کا سہارا بھی نہیں لیا گیا۔ اس قصہ میں ہارون رشید کی شب کوری اور انصاف کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جب خلیفہ حسب معمول رات کو گھومنے نکلتا ہے ایک بوڑھیا کو دیکھتا ہے جو اپنی بیٹی کی شادی کے لیئے متفکر ہے۔ ایک چور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ دیکھ کر خلیفہ خود اس لڑکی سے شادی کر لیتا ہے اور بوڑھیا اور اس کے خاندان کو آلام و فکر سے نجات دلاتا ہے۔

ہشت گلشت قدیم دور کے قصوں میں یہ کہانی کافی اہم ہے۔ اس کہانی کا ماخذ فارسی زبان میں ہے ایران کے بادشاہ بہرام گور کے اطراف بھی کنگ آرتھر ہی کی طرح کئی قصوں کے پلاٹ تیار کئے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بہرام کی سات یا آٹھ بیویاں تھیں جن کے لیئے اس نے آٹھ محل بنوا رکھے تھے[2]۔ بہرام کے متعلق فارسی میں جتنی مثنویاں لکھی گئی ہیں ان میں اس بات کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مثلاً امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت" نظامی کی مثنوی "ہفت پیکر" ہاتفی کی مثنوی "ہفت منظر" وغیرہ۔

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات" صفحہ ۱۷، [2] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۱۵۰

قدیم ادب میں اس کو جو اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ دکھنی میں بھی اس قصے کو مندرجہ ذیل شاعروں نے نظم کیا۔

۱۔ بیجاپور کے دو شاعروں امین اور دولت تھے سنہ ۱۰۵۰ ہجری میں "بہرام و حسن بانو" کے نام سے اس قصہ کو لکھا۔

۲۔ ملک خوشنود نے امیر خسرو کی "ہشت بہشت" کا ترجمہ "ہشت بہشت" ہی کے نام سے سنہ ۱۰۵۶ھ میں کیا تھا جس کے مخطوطے اکثر کتاب خانوں میں موجود ہیں۔

۳۔ دوسرا ترجمہ طبعی کا ہے جو ابوالحسن تانا شاہ کا درباری شاعر اور شاہ راجو حسین کا مرید تھا۔ اس نے نظامی کی "ہفت پیکر" کو "بہرام و گل اندام" کے نام سے سنہ ۱۰۸۶ھ میں اردو کا جامہ پہنایا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد حیدر بخش حیدری نے "ہفت پیکر" ہی کے نام سے نظامی گنجوی کی مثنوی کو اردو نظم میں منتقل کیا یہ مثنوی اب ناپید ہے۔ اس مثنوی کی تاریخ تصنیف مرزا کاظم علی جوان نے کہی تھی جو مندرجہ ذیل ہے۔

"جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی"[1]

مذکورہ بالا مصرعہ سے سنہ ۱۲۲۰ھ برآمد ہوتا ہے۔

حقیقت بریلوی نے بھی سنہ ۱۸۱۰ء (۱۲۲۵ھ) میں "ہشت گلزار" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ جس کے متعلق گارساں دی تاسی لکھتا ہے۔

غالباً یہ نام آٹھویں آسمان کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ ورنہ نظامی کی "ہفت پیکر" اور ہاتفی کی "ہفت منظر" کی مناسبت سے ہفت گلزار ہونا چاہیے تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ایران کے بادشاہ

---

[1] "داستان تاریخ اردو" صفحہ ۹۵

Hanif Razvi

بہرام گور پسر یزد جرد کا قصہ ہے جس کی سات بیویاں تھیں جو سات باغوں میں الگ الگ رہتی تھیں[1]"

نثر میں اب تک اس کے دو ترجموں کا پتہ چلا ہے

۱- "ہشت گلشت" مصنفہ غلام احمد

۲- قصہ بہرام گور" مصنفہ" فرخندہ علی رضوی بنو موی ۱۲۶۲ھ م ۱۸۴۵ء[2]

ہشت گلشت" :- مصنفہ غلام احمد کے متعلق حکیم شمس اللہ قادری نے اپنے مضمون "کتب خانہ انڈیا آفس کے اردو مخطوطات" میں حسب ذیل صراحت کی ہے

غلام احمد دہلوی نے ہنری مارٹن کی فرمایش سے ۱۲۱۸ھ میں سید حسین خفیقت کی "ہشت گلزار" کا ترجمہ کیا۔ "ہشت گلزار" نثر ہے۔ امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت کی (۱۴۱۰) ورق

حکیم صاحب نے غالباً کسی انگریز مرتب کی ترتیب دی ہوئی فہرست مخطوطات سے مخطوطوں کے نام اور تصریحی نوٹ کا ترجمہ کیا ہے لیکن موصوف کا محولہ بیان صحیح نہیں سید حسین خفیقت کی کتاب کا نام تو "ہشت گلزار" ہی ہے لیکن وہ اردو نظم میں ہے اور امیر خسرو کی نظم کا ترجمہ ہے۔ ممکن ہے کہ غلام احمد نے اس نظم کو نثر میں لکھا ہو۔ چونکہ یہ مخطوط راقم الحروف کی دسترس میں نہیں ہے اس لیے اس بارے میں کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔

یورپ میں "دکھنی مخطوطات" کے مولف نے بھی اپنی تالیف میں اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے۔

---

[1] خطبات گارستان دی تاسی" صفحہ ۱۵۰

[2] مضمون چند فراموش شدہ داستانیں" مطبوعہ رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۰۱

"ہشت گنشت" ہی کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں بھی دستیاب ہوا ہے ۔ یہ ترجمہ کسی ولیم ہیم مارٹن کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ مترجم کا نام کمترشاہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ کمترشاہ نے خود یہ بات بتائی ہے کہ شاہجہاں آباد میں انھیں ایک حادثہ عظیم پیش آیا جس کی وجہ سے انہیں کلکتہ جانا پڑا۔ کلکتہ میں ولیم مارٹن کی فرمائش پر انہوں نے اس قصہ کا ترجمہ اردو زبان میں کیا۔

یہ کتاب بھی آٹھ گنشت پر منقسم ہے۔ پہلے "گنشت" میں بہرام گور اور دلارام کے شکار کھیلنے کا قصہ ہے اور لقب "گور" کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ بہرام کو گورخر کا شکار کھیلنے کا شوق تھا اس وجہ سے اس کا لقب "گورخر" پڑ گیا تھا۔

بہرام کی بیبیوں کے نام مختلف قصوں کی طرح اس میں بھی بتائے گئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ گل اندام۔ حسن بانو۔ دلارام وغیرہ۔

اس کہانی میں آٹھ "گنشت" ہیں پہلے گنشت میں جیسا کہ کہا جا چکا ہے بہرام گور اور دلارام کے شکار کھیلنے کا قصہ اور "گور" کی وجہ تسمیہ دی گئی ہے۔

دوسرا باب سات گنشتوں کے آراستہ ہونے کے بیان میں ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب بہرام کا شوق شکار حد کو پہنچ گیا تو وزیر اور امیر بہت پریشان ہوئے اور کوئی ایسی ترکیب نکالنی چاہی جس سے بادشاہ کا شکار موقوف ہو جائے آخر لقمان بن منذر نے جو بادشاہ کا ہم مکتب رہ چکا تھا۔ ایک تدبیر سمجھائی۔ اس نے سات اقلیم کی سات شہزادیاں فراہم کیں۔ سات گنبد سات رنگ کے بنائے۔ اور ان گنبدوں کو ان کے دنوں کی نسبت سے آراستہ کیا۔ مثلاً پہلے برج کو جو شنبہ سے منسوب تھا ہمرنگ زحل سیاہ کیا۔

دوسرے کو جو یکشنبہ سے منسوب تھا اور متعلق آفتاب سے تھا زعفرانی بنایا۔

تیسرے کو دوشنبہ کی نسبت ہونے کی وجہ سے سبز ریحانی نیلانی بنایا۔

چوتھے کو سہ شنبہ کی نسبت سے لال بنایا۔

پانچویں کو چہارشنبہ کی نسبت سے بنفشہ گوں
چھٹے کو پنجشنبہ کی نسبت سے صندلی
ساتویں کو جمعہ کی نسبت سفید کافوری بنایا

جب سات شہزادیاں بیاہ کر آئیں تو انہیں ان سات برجوں میں الگ الگ رکھا گیا اور بہرام کو اس کی خبر دی گئی۔ بہرام بہت خوش ہوا اور ان کے ساتھ رہنے اس شرط پر تیار ہو گیا کہ جس برج میں جائے وہاں کی شہزادی سے ایک دلچسپ حکایت سنائے اس طرح مختلف دلچسپ حکایات دی گئی ہیں:-

برٹش میوزیم کے مخطوطے کا ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں جو اقتباس دیا ہے راقم الحروف نے اس کا مقابلہ کتب خانۂ آصفیہ میں دستیاب شدہ مخطوطے سے کیا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ عبارت ایک ہی ہے۔ اس کے علاوہ وجہ تصنیف بھی ایک ہی ہے۔ صرف مترجم اور ممدوح کے ناموں میں اختلاف ہے۔ برٹش میوزیم کے نسخہ کے مترجم کا نام غلام احمد بتلایا گیا ہے جنہوں نے ہنری مارٹن کی فرمائش پر وہ ترجمہ کیا تھا۔

کتب خانۂ آصفیہ کے مخطوطے میں مترجم کی حیثیت سے کمترشاہ کا نام دیا گیا ہے جنہوں نے ولیم ہیم مارٹن کی فرمائش پر یہ ترجمہ کیا تھا۔

لیکن چونکہ دیے ہوئے اقتباس کی عبارت اور وجہ تصنیف بالکل یکساں ہے اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ دونوں نسخے ایک ہی کتاب کے ہیں یا تو غلام احمد مصنف کمترشاہ کاتب ہے یا کمترشاہ مصنف اور غلام احمد کاتب ہے۔

اس کی زبان فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات کی زبان سے بہت مشابہ ہے اس لیے اس کا سنہ تصنیف فورٹ ولیم کالج کے قیام کے زمانے کے لگ بھگ ۱۲۱۱ھ معلوم ہوتا ہے۔

حکایات زیادہ تر عشق و محبت کی ہیں کہیں کہیں ابتذال بھی آ گیا ہے۔

کہانیوں کے موضوع مختلف ہیں۔ کسی میں مردوں کی ذکاوت عقلمندی کا بیان ہے تو کسی میں عورتوں کی چالاکی مکاری اور بدچلنی کا ذکر ہے۔ جادو اور طلسم کا بیان بھی ہے۔ لیکن اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ کہانی کے اختتام پر داستان گو شہزادی اپنے رنگ کی خوبیاں ضرور بتاتی ہے مثلاً آخر کی کہانی عورتوں کی مکاری اور بدچلنی کے متعلق ہے اس کہانی میں پاک دامن عورت کا لباس سفید بتلایا گیا ہے اور سفید رنگ جمعہ کا ہے یعنی آخری برج کا۔

ذیل میں اس مخطوطے کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

عرص کی ملک سراندیپ میں ایک بادشاہ تھا عادل۔ اور اس عہد میں نہ تھا کوئی اس کا مقابل۔ غریب نواز ظالم کش میزان عدالت میں ہر ایک کام موزوں اور نام مبارک اس کا ہمایوں بادشاہوں کو تاج دیتا اور ان سے باج لیتا دانا اور ہنرمند کی محبت کا راغب اور تمام دانش مند اور اہل کمال اس کے مصاحب اس کے تین بیٹے تھے خوب صورت اور خوب سیرت کہ ہر ایک علم و ہنر میں علامۂ عصر تھا اور بزرگ خوردہ شناسی میں سترگ اور خود دانش و بینش سے بزرگ ان کی کارروائی سے سلطنت کا کام بخوبی انتظام تھا۔ اور بادشاہ کو دن رات عیش و آرام تھا۔ ایک دن صبح ہوتے ہی جو کچھ خیال دل میں آیا۔ ہر ایک کو جدا جدا بلایا۔ تا راز قلب ہو ایک کا محک امتحان میں لائے اور دریافت کرے کہ خیال بادشاہی اور عزم سلطنت کیسے ہے۔ پہلے بڑے بیٹے سے پوچھا کہ اب میری شب جوانی سحر ہوئی اور صبح عمر کی شام سلطنت اب تجھے مبارک ہو، رعیت داد و دہش سے خوش رکھنا اور بنائے ظلم جہاں سے اٹھانا اس سعادت مند دانش ور نے یہ جواب باصواب عرض کیا

Hanif Razvi

خدا آپ کو صد وسی سال اور یہی ہمارے سر پہ قائم رکھے۔

بادشاہ جی میں بہت خوش ہوا۔ اور ہزار آفریں کی لیکن ظاہر میں بہت سی نفریں کر اپنے پاس سے اٹھا دیا۔ پھر منجھلے بیٹے کو بلایا.....

اس طرح تینوں کو بلایا جاتا ہے آخر میں بادشاہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے باہر جا کر کچھ دن سیر و سیاحت میں گزاریں۔ الگ الگ روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن اتفاقاً ایک جگہ مل جاتے ہیں وہاں ایک زنگی جس کا اونٹ گم ہوگیا تھا آتا ہے اور ان سے اونٹ کے بارے میں پوچھتا ہے۔ کہ ان کو اونٹ کے متعلق کچھ معلوم نہیں رہتا لیکن محض قیاس سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اونٹ جو کھو گیا ہے کانا ہے۔ دوسرا کہتا ہے اس کے دانتوں میں کچھ نقص ہے۔ تیسرا کہتا ہے اس کے پاؤں میں لنگ بھی ہے۔ غرض اس طرح اور نشانیاں بھی گناتے ہیں۔ جب زنگی یہ دیکھتا ہے کہ ان کی بتائی ہوئی نشانیاں سب درست ہیں تو وہ اونٹ واپس دلانے کے لیے منت کرنے لگتا ہے۔ جب شہزادے اونٹ کا کوئی پتہ نہیں بتا سکتے تو وہ ان پر اونٹ کی چوری کا الزام لگاتا ہے اور انھیں حاکم شہر کے سامنے لے جاتا ہے۔ شہزادے ہرچند یہ یقین دلاتے ہیں کہ اونٹ کو انھوں نے دیکھا تک نہیں۔ لیکن حاکم شہر ان کی ایک نہیں سنتا اور انھیں قید میں ڈال دیتا ہے کچھ دنوں بعد زنگی کو گم شدہ اونٹ مل جاتا ہے۔ وہ جا کر بادشاہ کو بتاتا ہے اور شہزادوں کو رہا کرنے کی درخواست کرتا ہے بادشاہ ان کو چھوڑ دیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اونٹ کو دیکھے بغیر وہ اس کی نشانیاں کس طرح بتا سکے وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ زمین پر دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ پاؤں گھٹتا گیا ہے۔ جس پر انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اونٹ لنگڑا ہے۔ اس کے دانتوں کا نقص اس طرح معلوم ہوا کہ سرِ راہ جو درخت نظر آیا شاخ و برگ اس کا نیم خوردہ پایا یقین ہوا کہ دانتوں میں کچھ نقصان ہے

بادشاہ تینوں کی عقلمندی پر آفرین کہہ کر اپنی ملازمت میں رکھ لیتا ہے لیکن ایک دن وہ شراب وکباب پر اسی طرح اپنے ذہن لڑاتے ہیں۔ اور بادشاہ کو مطبخ زادہ بتاتے ہیں جو تحقیق پر صحیح نکلتا ہے بادشاہ ان کی عقلمندی سے خائف ہو کر انھیں بہ عزت و احترام رخصت کر دیتا ہے۔

اسی طرح اور سات حکایتیں ہیں آخر میں بہرام کی موت پر کتاب کا خاتمہ ہوتا ہے اس کی عبارت کہیں کہیں اور مسجع بھی ہے لیکن زیادہ تو قصہ صاف زبان میں لکھا گیا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے اس قصہ کے اسلوب بیان پر روشنی پڑتی ہے۔

شکار کھیلنے والے رمز اسمار اور نخچیر گیر صید گاہ گفتار آہوان بے آہو اس قصے کے دام بیان میں یوں لائے ہیں کہ جب بہرام گور کے پدر لطف گستر نے طرف گور کے رخت ہستی کا باندھا بہرام نے تاج فرمان روائی سر پر رکھا۔ ہاتھ کرم کا کھولا۔ سات قانون عدالت اور زر فشانی کے دوستوں کو سرفراز کیا اور گانون سیاست وجانفشانی سے نقد قلب دشمنوں کا گداز بہانی عدالت آباد اور اہل جہاں اس کی جود و سخا سے دل شاد ......

انوار سہیلی

"سنگاسن بتیسی" اور "سنگھاسن بتیسی" کی طرح یہ بھی دور قدیم کا ایک مشہور قصہ ہے۔ اصلی قصہ "پنج تنتر" جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے۔ سنسکرت میں ہے لیکن فارسی نثر میں ترجمہ کر کے مولانا حسین واعظ کاشفی نے اسے آخر شہرت دے دی۔ چنانچہ دنیا کی تقریباً تمام ادبی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔[1]

---

[1] انڈیا ان پورچگیز لٹریچر صفحہ ( )

کسریٰ نوشیرواں (۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) کے زمانے میں سنہ ۵۷۰ء میں اس کا ترجمہ سنسکرت سے پہلوی زبان میں ہوا پھر پہلوی سے یہ کتاب سریانی اور عربی زبانوں میں ترجمہ کی گئی عربی ترجمہ خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں سنہ ۷۶۰ء کے قریب عبداللہ ابن المقفع نے ”حکایاتِ کلیلہ و دمنہ“ کے نام سے کیا عبداللہ ابن المقفع بڑا عالم تھا وہ عربی اور فارسی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جانتا تھا۔ اصلی سنسکرت اور پہلوی ترجمہ دونوں مفقود ہیں۔ ”پنچ تنتر“ کے بعد میں جتنے بھی ترجمے ہوئے ان کی اصل یہی عربی ترجمہ ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ امیر نصر بن احمد کی فرمائش پر ابوعبداللہ رودکی نے نظم میں کیا تھا۔

اس کے تقریباً دو سال بعد نصراللہ متوفی نے اسے سنہ ۶۰۰ھ کے قریب فارسی نثر میں لکھا جو بہرام شاہ کے دورِ حکومت میں دارالانشار کا افسر تھا۔

پھر مولانا حسین واعظ کاشفی نے نصراللہ کے ترجمے کو پیش نظر رکھ کر اپنے انداز میں ”انوارِ سہیلی“ تصنیف کی یہ کتاب سلطان حسین مرزا کے سپہ سالار امیر نظام الدین احمد سہیلی المتوفی کی فرمائش سے لکھی گئی اس مناسبت سے مولانا نے اس کا نام ”انوارِ سہیلی“ رکھا۔

اکبر کے زمانے میں ابوالفضل نے ”انوارِ سہیلی“ کا خلاصہ ”عیارِ دانش“ کے نام سے کیا تھا۔ اردو میں عیارِ دانش کے بھی کئی ترجمے ہوئے فورٹ ولیم کالج سے پہلے اور بعد۔ انوارِ سہیلی کے بہت سے ترجمے مختلف ناموں سے کئے گئے جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

۱۔ ”بستانِ حکمت“ فقیر محمد خاں گویا نے ۱۲۵۱ھ میں لکھی

۲۔ ”ضیائے حکمت“ عمر علی خان وحشت کا ترجمہ

۳۔ ”دکھنی ترجمہ“ ”انوارِ سہیلی“ محمد ابراہیم بیجاپوری

۴۔ ” ” ” مصنف نامعلوم

Hanif Raza

۵۔ "خود افروز" حفیظ الدین احمد نے جو فورٹ ولیم کالج میں مدرس تھے ابوالفضل کے خلاصے "عیار دانش" سے ترجمہ کیا ہے۔

"انوار سہیلی" کے چھ اردو ترجمے کتب خانہ انڈیا آفس میں محفوظ ہیں جن کی صراحت کیٹلاگ میں حسب ذیل دی گئی ہے[۱]

"انوار سہیلی" کا دکھنی ترجمہ جو فارسی کتاب ملا حسن بن علی سے کیا گیا ہے ایک اور دکھنی ترجمہ منشی محمد ابراہیم بن حسن خان نے ۱۸۲۲ء میں مرتب اور ۱۸۲۴ء میں مدراس سے شائع کیا۔

اس ترجمہ کی زبان قدیم اور املا مانوس ہے۔ ترجمہ میں روانی اور شگفتگی نہیں ہے اس کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"ابو جعفر منصور ہمیشہ اش کتاب کو مطالعہ کے بیچ رکھ کر اس کی نصیحت و حکمت کے مطابق عمل کرتا تھا۔

سلطان حسین بادشاہ کے عہد موں شیخ احمد نے ایک امیر اس کا سہیلی وہ آوردہ امیر سارا امیروں کا سردار بڑا دیانت دار تھا ہمت و فضیلت کا رکھن والا خیر و خیرات کا کرن والا.....

خلق اللہ کہ فائدہ کہ واسٹ مجھ غریب کو اس وجہ فرمایا کہ اے محمد حسین ملا محمد علی واعظ کے فرزند تم اش کتاب کو پارسی زبان موں کہو اور اش باغ کے درمیان اس وجہ معنی کا درخت لگا دو[۲]

محمد ابراہیم بیجاپوری نے "انوار سہیلی" کا جو ترجمہ کیا ہے اس میں شک نہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ۲۴ برس بعد اور میر امن کی "باغ و بہار" کے

۱۔ "یورپین دکھنی مخطوطات" صفحہ ۵۷۹

۲۔ " " صفحہ ۵۷۹

۳۔ " " صفحہ ۵۸۰

Hanif Razvi

(۲۳) برس بعد ہوا۔ لیکن اس پر نئے اسالیب کا بالکل اثر نہیں تھا۔ یہ دکھنی زبان اور قدیم اسلوب ہی میں لکھا گیا ہے یہ ترجمہ محمد ابراہیم بیجاپوری نے مدراس رجمنٹ کے فوجی افسروں کے لیئے کیا تھا۔ چنانچہ سرنامہ پر ذیل کی وضاحت درج ہے

"ترجمہ بہ زبان دکھنی فارسی" انوار سہیلی" کا فوجی افسروں کے لیئے"

محمد ابراہیم کتاب کے ترجمہ و تالیف کا یہ سبب لکھتے ہیں :-

جب میں نے اپنا عجز و انکسار بتلایا تب حضرت دل سے خطاب مستطاب ہوا کہ اے میاں محمد ابراہیم بن ملک حسین خان بن شیخ محمد بیجاپوری جمعدار دکھنی ہزار سواری کو نے کیا کہ اگر کوئی مجھ سا نقیر زمان و کیف دوراں اس جہان بے پایاں میں لفور تمام ملاحظہ کیجئے تو بھی اس کا دست ارادت دامن مقصود تک نہ پہنچے" [۱]

"انوار سہیلی" کے ترجموں کی زبان سے اردو ادب کے عہد بہ عہد ارتقاء کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

ستارہ ہند معروف بہ اردو انوار سہیلی ضیائے حکمت عمر علی خاں وحشت یا وحشی کی تصنیف ۱۲۷۹ھ کی ہے۔ اس اثنا تک زبان کافی منجھ چکی تھی اس کا اسلوب گذشتہ دونوں ترجموں کے مقابلے میں کافی ترقی یافتہ ہے مثلاً یہ جملے :-

"اب فارسی کا رواج ختم ہو جانے سے زبان اس کی سخت اور عبارت ایسی پیچیدہ خیال کی جاتی ہے" ..... وغیرہ

کہانی کی عبارت کا ایک اقتباس یہ ہے :-

نقل ہے کہ مملکت چین میں ایک بادشاہ تھا عالی جاہ فرخ فال

۱؎ مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ

Hanif Razvi

نام اور اس کا ایک وزیر تھا۔ نیک تدبیر موسوم خجستہ رائے ایک دن بادشاہ اور وزیر پہاڑوں کی طرف شکار کھیلنے گئے"...[1]

نوطرز مرصع

اس دور کی ایک مقبول عام کہانی قصہ "چہار درویش" ہے جس کے اردو میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ اصل قصہ فارسی میں تھا۔ جو بہت دنوں تک امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا رہا۔ لیکن ریو نے ڈبلیو۔ ایم۔ اوسلے کی سند پر اس کے مصنف کا نام محمد معصوم بتایا ہے۔

ریو لکھتا ہے:-

یہ قصہ عرصہ دراز تک امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا رہا۔ لیکن ڈبلیو ایم اوسلے نے اپنی فہرست میں مصنف کا نام محمد معصوم تحریر کیا ہے[2]

اس کے کئی ترجمے نظم و نثر میں ہوئے۔ چند ترجموں کا حال نیچے لکھا جاتا ہے:-

۱۔ "نوطرز مرصع" کے نام سے عطا حسین خاں تحسین نے اس قصہ کا ترجمہ کیا
۲۔ "باغ و بہار" " " میر امن دہلوی " " "
۳۔ "نوطرز مرصع" " " محمد عوض زرین " " "
۴۔ "چہار درویش" " " سید حسین علی خان " " "

منظوم ترجموں میں ابھی تک صرف محمد علی خاں کے ترجمہ "قصہ چہار درویش" کا پتہ چل سکا ہے۔

قصہ باغ و بہار فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں لکھا گیا۔ حسین علی خاں نے "چہار درویش" "باغ و بہار" کے طبع ہونے کے بعد سنہ ۱۸۲۲ء میں لکھا تھا[3]۔ عطا حسین خاں کے قریبی زمانے میں محمد عوض زرین نے بھی اسی نام سے "قصہ چہار درویش" کا ترجمہ

---

[1] مخطوطات مخزونہ کتب خانہ آصفیہ   [2] کیٹلاگ ریو صفحہ ۷۶۲

[3] فہرست اردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۱۷۵۔ اس کا نمونہ ادارہ ادبیات کتب خانہ میں محفوظ ہے

Hanif Razvi

اب کمیاب ہے۔

اس کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں تھا۔ عطا حسین خاں تحسین کا ترجمہ بہت مشہور ہے اور جیسا کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحقیقات سے واضح ہوتا ہے[۱] میرامن نے اس ترجمہ کو سامنے رکھ کر ۱۸۰۱ء م ۱۲۱۷ھ میں "باغ و بہار" لکھی

"نوطرز مرصع" کے سنہ تصنیف کے بارے میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔

محمد یحییٰ صاحب تنہا نے "سیر المصنفین" میں سنہ تصنیف ۱۷۹۸ء م ۱۲۱۳ھ بتایا ہے[۲] حامد حسین قادری نے اپنی کتاب "داستان تاریخ اردو" میں اس سنہ کو معتبر مانا ہے ڈاکٹر عبدالحق دیباچہ باغ و بہار میں اسے ۱۷۷۵ء م (۱۱۷۵ھ) کے قبل کی تالیف بتاتے ہیں۔ یہ تاریخ قرین قیاس بھی سمجھی جا سکتی ہے کیونکہ انھوں نے باغ و بہار ۱۸۰۱ء م ۱۲۱۶ھ میں شروع کی جو ۱۸۰۲ء م ۱۲۱۵ھ) میں ختم ہوئی

"نوطرز مرصع" اس سے پیشتر لکھی جا چکی تھی۔ اس لیے یہ سنہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

تحسین کی "نوطرز مرصع" کے متعلق ڈاکٹر زور "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں کہ وہ چھپی بھی تھی[۴] لیکن اب اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ نہیں ملتا اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے۔ جس سے تحسین اور "نوطرز مرصع" پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

حالات زندگی

میر عطا حسین خاں تحسین محمد باقر خاں شوق کے بیٹے تھے۔ جنرل اسمتھ کے میر منشی ہو کر ان کے ساتھ کلکتہ گئے۔ جب جنرل اسمتھ ولایت گئے تو تحسین پٹنہ آ گئے پھر وہاں سے فیض آباد آ کر شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے

۱۔ مقدمہ "باغ و بہار" صفحہ ۵
۲۔ سیر المصنفین صفحہ ۵۱
۳۔ مقدمہ باغ و بہار صفحہ ۵
۴۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۹۲

Hanif Razvi

تحسین خوش نویس تھے اس وجہ سے "مرصع رقم" کے لقب سے مشہور ہیں جیسا کہ حامد حسین قادری لکھتے ہیں :- [۱]
نام میں "مرصع" کا لفظ طرز عبارت کے علاوہ مصنف کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے
تحسین اردو کے علاوہ فارسی کے بھی اچھے انشار پرداز تھے فارسی

تصانیف میں ان کی مندرجہ ذیل تصانیف مشہور ہیں۔

۱۔ "انشائے تحسین"

۲۔ "تواریخ فارسی"

۳۔ "ضوابط انگریزی"

اردو میں ان کی ایک ہی کتاب "نو طرز مرصع" کا پتہ چلتا ہے۔ غالباً اس ایک کتاب کے علاوہ اردو نثر میں انھوں نے اور کوئی کتاب نہیں لکھی۔
تحسین نے یہ کہانی جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں سفر میں دل بہلانے کی خاطر لکھی تھی اس کی تفصیل خود انھیں کی زبانی درج ذیل ہے۔

نواب مبارز الملک افتخار الدولہ جنرل اسمتھ رئیس بہادر صولت جنگ بجرہ میں کلکتہ جا رہے تھے لیکن بہ سبب مسافرت دور و دراز کے جس وقت طوطی فارغبال دل خفگی مکان کیسے بیچ قفس کشتی کے آتی اس وقت واسطے شغل طبیعت اور قطع منازل کے ایک عزیز سراپا تمیز کہ بیچ رفاقت میری ... کے قمری وار حلقہ محبت اور اخلاص کا اوپر گردن کی رکھتا تھا۔ عندلیب زبان کے تئیں بیچ داستان سرای حکایات عجیب و غریب کی اوقات خوش رکھتا تھا۔ ایک روز بلبل نما داستان اس حکایت دلفریب تن بیچ ..... کہانی کے مترنم کیا۔ جوہر

---

[۱] "داستان تاریخ اردو" صفحہ ۵۸

ایک صدر سے ترنم اس کی دل کے تئیں بے طرح لبھاتے ہیں کہ سُننے سے تعلق ہے۔ طاوس نگارین خیال کا بیچ دماغ خاطر کی جلوہ گر ہوا۔

لیکن اب "نوطرز مرصع" کی اہمیت کہانی سے زیادہ اس کے اسلوب کی بدولت ہے۔ قبل اس کے کہ "نوطرز مرصع" کے اسلوب پر بحث کی جائے۔ تحسین کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے ترجمے کے لیے ایک ایسی کہانی منتخب کی جس میں ذہن انسانی کو متاثر کرنے اور مسرت زای کی صلاحیت بدرجہ اتم ہے۔

اچھی کہانی کی صفت یہ ہے کہ اس میں "تعطل" ہوتا ہے۔ یعنے واقعات پے بہ پے ایسے ہوتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے شخص کا دھیان ان کی طرف سے نہیں ہٹتا یہ خصوصیت "نوطرز مرصع" میں بدرجہ غائت موجود ہے۔

یوں تو یہ قصہ پانچ الگ الگ قصوں کا مجموعہ ہے مگر ان پانچوں میں اسی طرح کا ایک اتحاد پیدا کیا گیا ہے۔ جیساکہ بکاچیو (　　　　) کی "ڈی کیمرون"

(　　　　) یا چاسر کی کینٹربری ٹیلز (　　　　)

میں ملتا ہے یعنی چار درویش اور ایک بادشاہ ایک مقام پر جمع ہو کر اپنا اپنا قصہ سناتے ہیں۔ ہر ایک کا قصہ نامکمل رہ جاتا ہے اور ہر ایک سے علی مرتضیٰؑ۔ یونانی ڈراموں کے دیوتا (　　　　) کی طرح نمودار ہو کر قصہ کو اس کی خواہش کے مطابق تکمیل کو پہنچانے کا وعدہ کرتے ہیں چنانچہ سب قصوں کی تکمیل ایک ساتھ ہوتی ہے اور جس طرح سب اشخاص سے دلچسپی ایک وقت میں شروع ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ہی وقت میں ختم بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو ایک "اجتماعی قصہ" کہنا بیجا نہ ہو گا۔ کیونکہ اس کے مختلف سلسلوں کو ایک ربط میں گوندھنے کی اس کے مصنف نے وہ ساری کوشش کی ہے جو اس سے ممکن تھی اپنی جگہ مکمل اور دلچسپ ہے اور سب قصوں کی ایک مجموعی دلچسپی بھی ہے۔

اس قصے کو تحسین اگر عام فہم زبان میں لکھتے تو میر امن کے ترجمے "باغ و بہار" کی

طرح قبولیت عام حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن تحسینؔ کی ادق زبان موٹے موٹے عربی اور فارسی الفاظ کے استعمال، اور قافیہ اور سجع کی رعایت نے اس قصّے کی اتنی شہرت نہ ہونے دی جتنی اس کے دوسرے ترجمے "باغ و بہار" کو حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالحق "نوطرز مرصع" کا مقابلہ "باغ و بہار" سے کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"نوطرز مرصع" اور "باغ و بہار" کے طرز بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ "نوطرز مرصع" کی عبارت نہایت رنگین اور سرتاپا تشبیہات واستعارات سے مملو ہے یہاں تک کہ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے جی متلانے لگتا ہے۔ تحسین نے اپنے بیان میں عام نقّہ گوؤں کا طرز اختیار کیا ہے آج کل اس کا پڑھنا طبیعت پر بار ہوتا ہے۔ زبان کا ڈھنگ پرانا ہے اور فارسی ترکیبوں اور الفاظ سے بھرپور ہے [1]

پہلے درویش کے قصہ کا خاکہ یہ ہے کہ ایک واقعہ ہمارے سامنے لایا جاتا ہے۔ مگر اس کا راز پنہاں ہی رکھا جاتا ہے۔ اور اس واقعہ سے متعدد اور واقعات کی کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں مگر راز ہر ایک کا پنہاں ہی رہتا ہے۔ درویش خود اس راز سے ناواقف ہے اور آخر کا ایک بیان سے یہ سب راز کھل جاتے ہیں۔ ذیل میں پہلے درویش کی سیر کا کچھ اقتباس دیا جاتا ہے۔ جس سے تحسینؔ اسلوب کا اندازہ ہو سکتا ہے

درویش اول نے غزال رعنائی داستان ندرت بیان احوال صدق مقال اپنے کے تئیں بیچ چراگاہ صحرائی ... نے ساتھ لطافت اور ظرافت کی زبان سخن گوئی کیسے اس طرح جلوہ گر تحریر تقریر کا کیا۔"

تحسینؔ عبارت میں موقع بہ موقع اشعار بھی لکھے ہیں مثلاً پہلے درویش کی داستان میں نثر کی مدد کے لئے انھوں نے اشعار سے جو مدد لی ہے اس کا ایک

---

[1] مقدمہ "باغ و بہار" صفحہ ۱۸

Hanif Razvi

نمونہ حسب ذیل ہے۔

دوستاں ویے سنو حال دل انگار کے تئیں
حالت گریہ اس دیدہ خوں بار کے تئیں

تجھ کو شفقت سے جو پاتا ہوں میں غمخوار اپنا
پس بجا ہے کہ کروں درد کا اظہار اپنا

اے یاران غمگسار مولد وطن اس سرگشتہ بادیہ آشوب کا بیچ خطہ پاک عجم کے ہے اور والد اس عاجز کا ملک التجار سوداگر تھا نہایت مالدار اور آسودہ روزگار اور اس قدر گنج فراواں بیچ بساط جمعیت کے موجود تھا کہ صراف سپہر کا بیچ صندوق کہکشاں کے خزانہ ستاروں کا نہ رکھتا ہوگا دو فرزند تولد ہوئے ازآں یہ عاجز اور دوسری وہ ہمشیرہ عزیز کہ اوس کی تئیں قبلہ گاہ نے بیچ نبد حیات اپنی کے ساتھ ایک سوداگر بچہ عالی خاندان کے منکوح کردیا تھا

اُردو نثر کی باعتبار الفاظ چار قسمیں قرار دی گئی ہیں[1]

۱- موجز ۲- مقفی ۳- مسجع ۴- عاری

۱- مرجز اس نثر کو کہتے ہیں جس میں وزن شعر تو ہو مگر قافیہ نہ ہو
۲- مقفی وہ نثر ہے جو مرجز کے برعکس ہے یعنی قافیہ تو ہوتا ہے لیکن وزن نہیں ہوتا۔
۳- مسجع ایسی نثر جس کے فقروں کے الفاظ وزن میں برابر ہوں اور حروف آخر میں موافق ہوں۔
۴- نثر عاری جس میں نہ الفاظ کی قید ہے نہ وزن کی نہ قافیہ کی یعنی ان سب باتوں سے عاری ہو۔ آج کل نثر عاری ہی کا رواج ہے۔ معنی کے اعتبار سے بھی

---

[1] اُردو کے اسالیب بیان صفحہ ۱۱۲

اس کی چار قسمیں مقرر ہیں۔

۱۔ سلیس سادہ ۲۔ سلیس رنگین ۳۔ دقیق سادہ ۴۔ دقیق رنگین

۱۔ سلیس سادہ :۔ وہ نثر ہے جس کے معنی آسانی سے سمجھ میں آجائیں

۲۔ سلیس رنگین :۔ گو معنی سہل ہوتے ہیں لیکن ادائے مطالب میں مناسبات الفاظ کی رعایت ہوتی ہے۔

۳۔ دقیق سادہ :۔ جس کے معنی دقت سے سمجھ میں آئیں۔

۴۔ دقیق رنگین :۔ وہ نثر جس کی عبارت کے معنی بھی مشکل ہوں اور ادائے مطالب میں مناسبت الفاظ کی رعایتیں بھی ہوں۔

ان تشریحات کی روشنی میں "نو طرز مرصع" بہ اعتبار الفاظ مقفی اور بہ اعتبار معنی "دقیق رنگین" کی ذیل میں آتی ہے۔ اور اس بارے میں تحسین کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ جیسا کہ ڈاکٹر زور صاحب بھی لکھتے ہیں[1]۔ اس زمانے کا رواج اور ادبی مذاق ہی اس نہج کا تھا۔ چنانچہ میر امن نے جن کے ترجمے کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی جب "باغ و بہار" نثر عاری میں لکھی اس عہد کے مشہور انشا پرداز رجب علی بیگ سرور نے اس کا مذاق اڑایا۔ "نو طرز مرصع" میں تحسین نے قصہ چہار درویش کو اردو میں منتقل کرتے وقت اس کا خیال ضرور رکھا ہے کہ رسم و رواج۔ ساز و سامان۔ کھانے پوشاک وغیرہ ہندوستانی ہوں اور یہ ان کے لیے ایک فطری بات تھی۔ قصے کے افراد وہ کہیں سے لا سکتے تھے لیکن قصے قضا کو ہندوستانی بننے سے وہ نہیں روک سکتے تھے۔

بہار دانش کے ترجمے شیخ عنایت اللہ دہلوی نے ۱۷۵۱ء م ۱۱۶۵ھ میں بہار دانش کے نام سے ایک قصہ لکھا تھا جس میں

---

[1] اردو کے اسالیب بیان صفحہ (۱۱۰)

جہاں دار شاہ اور بہرہ ور بانو کی محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد حیدر بخش حیدری نے بھی اس کا ترجمہ "گلزار دانش" کے نام سے کیا۔ لیکن ان سے پہلے اس کے بہت سے دکھنی ترجمے ملتے ہیں۔ جن کی تفصیل ڈاکٹر گیان چند لکچرار حمیدیہ کالج بھوپال نے اپنے مضمون۔ "چند فراموش شدہ داستان"[1] میں دی ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل مشہور ہیں

۱۔ داستان جہاں دار دکنی نثر میں فارسی کا ترجمہ ہے اس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو میں موجود ہے۔

۲۔ "بہار دانش" بھی دکنی نثر میں ہے لیکن یہ اول الذکر داستان جہاں دار سے مختلف ہے۔ اس کا بھی مخطوطہ انجمن ترقی اردو میں تھا

۳۔ "ہمیشہ بہار" حسین علی نے اس کا ترجمہ سنہ ۱۲۵۰ھ میں کیا اس کا قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ چونکہ یہ فورٹ ولیم کالج کے بعد کی تصنیف ہے اس لیے اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ مذکورہ بالا دو مخطوطوں تک راقم الحروف کی رسائی نہ ہو سکی۔

نگار دانش و مفرح القلوب اس کا ماخذ بھی سنسکرت زبان کا قصہ ہے۔ جسے "نگار دانش" اور "مفرح القلوب" کے نام سے فارسی کا جامہ پہنایا گیا۔ فورٹ ولیم کالج میں میر بہادر علی حسینی نے "اخلاق ہندی" کے نام سے اس کا ترجمہ اردو نثر میں ہو چکے تھے چنانچہ ان کا مجموعہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے[2] نصیر الدین ہاشمی نے ان کی تفصیل لکھی ہے:۔

---

[1] اردو کی چند فراموش شدہ داستانیں مطبوعہ رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۵۱ء

[2] ملاحظہ ہو یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۷۰۱

انڈیا آفس کے کتب خانہ میں "بہار دانش" کی حکایتوں کے دو مخطوطات ہیں جن میں دکھنی نثر میں اس کی بعض حکایات کا ترجمہ کیا گیا ہے بلوم ہارٹ نے اس کی اس طرح صراحت کی ہے :-

دکنی زبان میں یہ حکایات ہیں۔ ان کا مصنف مرزا محمد اسمٰعیل ہے ڈاکٹر نے انگریزی میں سرورق پر مصنف کا نام لکھا ہے۔ یہ حکایات فارسی بہار دانش سے ترجمہ کی گئی ہیں[۱]

جس میں بہار دانش کی بارہ حکایات میں سے صرف چھ حکایات ترجمہ کیا گیا ہے حکایات یہ ہیں۔

۱۔ حکایت سوداگر ۲۔ چوہوں کا بادشاہ ۳۔ قصہ احمق برہمنی

۴۔ احمق عورت ۵۔ خوبی قسمت ۶۔ حکایت جنگلی شہزادہ۔

یہ قصہ دکہنی میں لکھا گیا تھا اس کا اقتباس درج ذیل ہے،

"روایت کرنے ہارے خبروں کی ایسے روایت کرتی ہیں کہ بیچ ملک دکہن کے ایک بادشاہ رہتا تھا۔ اس بادشاہ کو سات بیٹے تھے ایک روز وہ ساتوں شہزادے واسطے شکار کی بادشاہ سے آکر بادشاہ رضا دیا۔ اور فوج اپنی ہمراہ کیا جب یہ ساتوں شہزادے واسطے شکار کی طرف ایک جنگل کے گئے، لاکن کہیں ایک جانور چرند پرند نہیں نظر آیا"

مذکورہ قصوں کے علاوہ جن میں سے اکثر فارسی یا سنسکرت کے ترجمے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں طبع زاد افسانے بھی کافی لکھے گئے۔ ان میں سے ایک عیسیٰ خاں کا قصہ "دلبر و مہرافروز" ہے جس کا مخطوطہ آغا حیدر حسین صاحب کے

---

[۱] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۷۰

ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ قصے کے پیرائے میں "جشن مہتابی" کا بڑا دلچسپ حال لکھا ہے۔ جشن مہتابی مغلوں کے عہد کا خاص جشن تھا۔ جو چاندنی رات میں منایا جاتا تھا۔ اس مصنف کی ایک اور تصنیف بھی ہے جس کا موضوع اخلاقیات ہے اس کا مخطوطہ بھی آغا صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

عیسٰی خاں کے حالات کا پتہ نہ چل سکا۔ رامپور کے کتب خانہ میں عیسٰی خاں کی ایک مثنوی "قصہ بخشی طوائف" کا حال پروفیسر سروری کی بیاض سے معلوم ہوا ہے۔ اس مثنوی میں ان کا تخلص جرأت تبلایا گیا ہے۔ یہ مثنوی سنہ ۱۱۹۱ء میں لکھی گئی ممکن ہے کہ یہ عیسٰی خاں قصہ "دلبر و دل افروز" ہی کے مصنف ہوں۔

چہار چمن

ڈاکٹر گیان چند کے مضمون "اردو کی چند فراموش شدہ داستانیں"[1] سے ایک اور قصہ "چہار چمن" کا سراغ ملتا ہے جو نواب سعادت علیخاں کے عہد میں سنہ ۱۷۹۶ء م سنہ ۱۱۹۱ھ میں لکھا گیا تھا۔ اس کا مخطوطہ دستیاب نہ ہوسکا ڈاکٹر گیان چند نے جو تفصیلات دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورق پر اس کا نام "چار چمن" درج ہے۔ لیکن دیباچے میں اس کا نام "دلفریب" بھی لکھا گیا ہے اس کا مصنف عاجز یا فاخر نامی کوئی شخص تھا۔ قصہ "الف لیلیٰ" کے قصوں کی طرح کا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک بادشاہ ہر شام ایک عورت سے شادی کرتا تھا اور ایک رات بعد اسے طلاق دے کر دوسری شادی کر لیتا۔ ایک عورت "بزم افروز" نے شہرزادہ کی طرح ہر شب ایک نئی کہانی سنانی شروع کی اور اس طرح بادشاہ کو دوسری شادی کرنے سے باز رکھا۔ اس کی زبان کافی رنگین ہے

پروفیسر گیان چند نے دو اور داستانوں کا حال لکھا ہے جو اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں[2]

---

[1] مطبوعہ رسالہ "اردو" جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

[2] اس کا علم راقم الحروف کو ڈاکٹر گیان چند جین ایم اے۔ ڈی فل لکچرار حمیدیہ کالج کے خط سے ہوا۔

Hanif Razvi

۱۔ "جذبۂ عشق" یہ داستان شاہ حسین حقیقت نے ۱۱۱۱ھ میں لکھی تھی اس میں ۱۲۰۷ھ کی ایک عشقیہ داستان کو قلمبند کیا گیا ہے۔

۲۔ "قصہ ہائے قلمی" یہ تصنیف مکمل داستان نہیں بلکہ قصص کا ایک نامکمل مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اڈنبرا یونیورسٹی میں (۴۹) صفحوں کا ایک مخطوطہ ہے جس میں پرندوں کی عقلمندی کی کہانیاں درج ہیں آخری کہانی میں مصنف نے اس وقت کے کلکتہ اور مونگھیر کا حال بتایا ہے۔ زبان شمالی ہند کے قصبات کی سی ہے مثلاً:۔

"دو کبوتر ایک کونارہ کے درمیان رہتے تھے"

قصص کے علاوہ ایسی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا گیا ہے جن کا موضوع اخلاقیات ہے۔ ان میں سعدی کی مشہور کتاب "گلستاں" کے ترجمے قابل ذکر ہیں سعدی کی اس تصنیف کا دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو کے پانچ مختلف[1] ترجموں کا حال نصیر الدین صاحب ہاشمی کی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" سے معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۷۰۹

Hanif Razvi

(۱۰)

دہلی کے شعرا اور اردو نثر

مغلوں کا دکن پر تسلط۔ ریختہ کا رواج۔ میر جعفر زٹلی کا نثری کارنامہ۔ محمد حسین کلیم۔ فضلی کی "دہ مجلس" دہ مجلس کے نسخے۔ سراج الدین علی خاں۔ آرزو کی تصانیف۔ عبد الولی عزلت۔ مرزا رفیع سودا۔ قتیل۔ سعادت یار خاں رنگین۔ انشاء اللہ خاں انشاء۔ مرزا جان طپش۔ اس دور کی نثر پہ تبصرہ۔

Hanif Razi

دہلی کے شعرا اور اردو نثر

شمالی ہند کے تہذیبی مرکزوں، خاص طور پر دہلی میں، ایرانی اثرات اور فارسی ادب اور شاعری کی مقبولیت کی وجہ سے ادبی اظہار کے لیے اعلیٰ طبقہ کے لوگ فارسی ہی کو اختیار کرتے تھے، اور ہندوستان کے عام باشندے، ہندو اور مسلمان، مقامی بولیوں، جیسے برج بھاشا، اودھی، راجستانی وغیرہ میں لکھتے تھے[1] اس کا نتیجہ یہ تھا شمالی ہند میں سترھویں صدی عیسوی سے پہلے اردو کو ایک ادبی زبان کے طور پر سنجیدگی کے ساتھ کبھی اختیار نہیں کیا گیا۔ مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ، فارسی عمل دخل بھی ادبی فضاء سے ہٹنے لگا، اور اس خلا کو پر کرنے کے لیے اردو آگے بڑھنے لگی، یہاں تک کہ خود مغلوں کے آخری دور میں اس نے زبان اردوِ معلےٰ، کا رتبہ بھی پا لیا۔ عالمگیر کے فتح دکن کے بعد شمال اور جنوب میں حد فاصل پھر ناپید ہو گئی، اور ایک مرتبہ پھر شمال اور جنوب کی تہذیب اور ثقافت میں میل ملاپ رونما ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ادبی روایات بھی شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کو سفر کر کے پہنچنے لگے۔ انھیں میں دکھنی اردو شاعری کی روایات بھی تھیں، جو کئی راہوں سے شمال پہنچیں۔ میر کے نکات الشعرا میں دکھن کے شعرا کی روایات عبدالولی۔ عزلت کے ذریعہ پہنچیں۔ اس طرح سے

۱۔ انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۲۰۷

رفتہ رفتہ شمال کی ترقی یافتہ زبان دکن پہنچنے لگی۔ عالمگیر کے بارے میں فتوت اپنے تذکرہ ریاض حسینی میں لکھتا ہے کہ جب اس نے دکن فتح کیا تو نصرتی کے کلام سے متاثر ہو کر اسے خطاب بھی عطا کیا تھا۔ فتوت کا بیان حسب ذیل ہے:-

"وقتیکہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی انار اللہ برہانہ ولایت دکن را در تسخیر آورد حکم بہ نفاذ پیوست کہ سخن سنجاں ایں ملک را در نظر بگذرانند بموجب حکم گزرانیدند کلام نصرتی را بر ہمہ افضل فرمودہ بہ خطاب ملک الشعراء ہند سرفرازی یافت"[1]

عالمگیر کی مدح دکن کے اکثر شعرا نے لکھی ہے۔ انھیں میں ایک ضعیفی بھی تھا۔ وہ قطب شاہی دور کا آخری شاعر تھا اس نے کئی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے ایک مثنوی "ہدایت نامہ" بھی ہے جس میں اس نے فقہ حنفی کے عقاید قلمبند کیے اس میں وہ اورنگ زیب کی مدح اس طرح کرتا ہے۔

یہہ دور جہاں دار اورنگ زیب + کہ جس نے ہوا رس زمانے کو زیب
شہنشاہ عادل رہے در امور + کہ بدعت ضلالت ہوا جس تھے دور
دیا حق تعالیٰ نے یوں جس کو جس + جو دشمن ہوا اس انگے خوار وخس
دھریا سو پیو جیں شہی کا وو تاج + دلی ہور دکھن کا ہوا ایک راج[2]

دکھن کے اردو شعرا کی ان مدحوں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب ہی کے زمانے سے اردو مغلیہ دربار میں بھی رسوخ پانے لگی تھی۔ یعنی علماء نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اکبر اور شاہ جہاں بھی ہندی میں شعر کہتے تھے۔ پروفیسر حسن عسکری نے اپنے مضمون "شمالی بہار کے ایک شطاری صوفی بزرگ احمد الدین راجگیری"[3]

1۔ مخطوطہ تذکرہ فتوت مقبوضہ دفتر دیوانی دمال

2۔ "دکن میں اردو" صفحہ ۲۵۸

3۔ شمالی بہار کے ایک شطاری صوفی "امام الدین راجگیری" از محمد حسن عسکری

Hanif Raz

میں اورنگ زیب کا مندرجہ ذیل دوہا نقل کیا ہے :۔

"یہ دکھ میرے کن سو کہوں
جو دیا سو ٹھار رہا جورا کہا سو جاے"[۱]

اور اس میں کچھ تعجب کی بات بھی نہیں۔ کیونکہ مغل شہنشاہ اور ان کے امرا اس زبان سے بول چال کی زبان کی حیثیت نا واقف نہیں تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے دربار کی زبان فارسی رہی تھی۔ اسی طرح خاص طور پر دھلی کے عوام اس زبان سے نامانوس نہیں تھے۔ کیونکہ یہ انھیں کی بولی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ولی پہلے پہل دلی جاتے ہیں تو وہاں ان کی آو بھگت اسی طرح ہوتی ہے گویا وہ دھلی ہی کے شاعر تھے پھر ان کا طرز اتنا مقبول ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اُن کی پیروی میں ریختہ لکھنا شروع کردیتے ہیں۔ میر اور قائم کے شعر شاہد اس بارے میں قطعی کا حکم رکھتے ہیں۔ میر نے فرمایا تھا۔

ع :۔ معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور قائم کہتے ہیں :۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
یہ ذوق رفتہ رفتہ گوشے گوشے میں پھیل گیا اور ریختہ نے فارسی کی جگہ لے لی۔ اور اس میں خدائے سخن میر۔ بادشاہ سخن سودا۔ درد۔ حاتم۔ مظہر جان جاناں۔ یکرنگ۔ ناجی اور بالآخر آتش۔ ناسخ۔ ذوق اور غالب جیسے شاعر ہوتے رہیں۔

لیکن نثر کا معاملہ اس کے برعکس ہے جیسا کہ محمد یحی تنہا اپنے تذکرے

---

[۱]۔ اس کا ہم معنی فارسی شعر یہ ہے:۔

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد + وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

"سیر المصنفین" میں لکھتے ہیں:-

اس وقت نثر اردو میں لکھنا ایک قسم کی توہین سمجھا جاتا تھا بالفاظ دیگر نثر اردو لکھنے کے یہ معنی تھے کہ لکھنے والا فارسی اظہارِ خیال کی قدرت نہیں رکھتا۔ غدر کے بہت بعد تک یہی حال رہا ہے۔ دوستانہ خط و کتابت معمولی اشخاص فارسی زبان ہی میں کرتے ہے[۱]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دھلی کے شعرا جنہوں نے شعر و سخن کے لیئے اردو شعرا کے تذکرے۔ مکاتیب حتیٰ کہ اگر اردو کلام کے لیئے عنوان بھی مقرر کرنا ہوتا تو یہ شاعر فارسی ہی سے کام لیتے تھے۔ میر کا "نکات شعرا" میر حسن کا تذکرۃ الشعرائے اردو" لچھمی نارائن شفیق کا "چمنستان شعرا" قدرت اللہ شوق کا "طبقات الشعرا" اور اس طرح کے دوسرے تذکرے شامل ہیں۔

سب سے پہلی نثری کتاب جس کا تذکرہ ملتا ہے وہ فضلی کی "دہ مجلس" ہے اور اس کے بعد محمد حسین کلیم کی اردو نثر کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن شمالی ہند کے نثری آثار میں ایک چیز اب تک مورخین اور تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رہی اور یہ ہے اردو کے ابتدائی مزاحیہ شاعر میر جعفر زٹلی کے دیوان کا وہ حصہ جس میں اس نے نثر میں کچھ کہا دتیں اور ضرب المثال لکھی تھیں۔

میر جعفر زٹلی سنہ ۱۰۶۸ تا سنہ ۱۱۲۵ میر جعفر ہزل گو شاعر تھے اسی مناسبت سے انھوں نے "زٹلی" تخلص اختیار کیا تھا یہ یہ نارنول کے باشندے تھے۔ اورنگ زیب کے بیٹے کام بخش کے ساتھ دکن آئے اور اس زمانے میں شاعری شروع کی۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ فارسی میں ہے۔ لیکن جو اردو کلام ملتا ہے وہ بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں۔ خصوصاً بیان کی ندرت، اور اچھوتے پن

---

[۱] "سیر المصنفین" صفحہ (   )

Hanif Raza

کے لحاظ سے ان کا اردو کلام قابل ذکر ہے گو انھوں نے سنجیدہ شاعری کی طرف توجہ نہیں کی لیکن "مرثیہ عالمگیر" سے جو انہوں نے اورنگ زیب کی وفات پر لکھا تھا ان کی سنجیدگی اور شرافت نفس کا پتہ چلتا ہے۔

زٹلی نے اورنگ زیب کی وفات کے بعد کی ہنگامہ آرائیوں اور طوائف الملوکی کی ستم رانیوں کی بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ ایک مثنوی میں خود اپنے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ ان کی ہزل گوئی اور ہجو سے سب ہی خائف رہتے تھے یہاں تک کہ امرا اس لیے ۱۱۲۵ھ م ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیے گئے۔

ڈاکٹر زور نے ان کی مندرجہ ذیل کتب کا تذکرہ کیا ہے۔

تصانیف ۱۔ اخبار سیاہیہ؛۔ جس میں متفرق واقعات پر چار کہانیاں ہیں جو اورنگ زیب کے سامنے بیان کی گئی ہیں۔ اردو میں اس کا جواب بھی ہے گو جواب چار سطروں میں ہے بقول ڈاکٹر زور۔

"وہ اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ شہنشاہ بھی اپنی خانگی گفتگو میں اردو زبان استعمال کرتا تھا"

۲۔ "اخبار دربار معلےٰ" جس میں پانچ قصے ہیں جن میں سے چار خود شاعر کے متعلق ہیں اس میں بتلایا گیا ہے کہ وہ درباریوں سے کس طرح روپیہ کھینچتا تھا ان کو سن کر بادشاہ نے کیا جواب دیا۔

۳۔ اس کے علاوہ اس کا مجموعہ نظم بھی ہے جس میں ۵۴ نظمیں ہیں ان ۵۴ نظموں میں مندرجہ ذیل چار بہت مشہور ہیں۔

۱۔ سلوک ۲۔ جوبن نامہ ۳۔ اختلاف زماں ۴۔ مرثیہ عالمگیر

۴۔ کلیات کا ایک نسخہ پروفیسر سروری نے رامپور کی رضا لائبریری میں دیکھا تھا جس کا نوٹ راقم الحروف کو ان کی بیاض میں ملا۔ اس کلیات میں نثر کے کچھ حصے

---

[1] ملاحظہ کیجئے "اردو شہ پارے" صفحہ ۱۳۱

بھی شامل ہیں۔

ان کی دوسری تصنیف اخبارات دربار معلےٰ کے متعلق ڈاکٹر زور کا بیان کیا جا چکا ہے لیکن پروفیسر محمود شیرانی لکھتے ہیں۔

محمد معظم کے دور میں میرؔ نے ایک رسالہ دربار معلےٰ کے نام سے لکھا ہے۔ جس میں اول دربار کے فرض وقائع بیان کیے جاتے ہیں۔ پھر ان کے متعلق شاہی احکام صادر ہوتے ہیں۔ میر جعفر نے یہ شاہی احکام اکثر ضرب الامثال کی زبان میں ادا کر دے ہیں"۔

اس کے بعد انھوں نے (۲۲) ضرب الامثال نقل کیے ہیں جن میں سے چند نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ چوم چہاڑا بھاری پتھر ۲۔ تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی آپ نبیڑ

۳۔ ہمارا حاکم ضامن جاہے ۴۔ اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا

۵۔ دم جو پکڑی بھیڑ کی وار ہوا نہ پار۔

راقم الحروف کو کتب خانہ آصفیہ میں "لغات ہندی" کے نام سے ایک مخطوطہ[1] نظر آیا جو قدیم دستی کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ کتاب تصنیف (۸۰) برس بعد کی ہے یعنی ۱۲۰۳ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس میں (۱۵۵۹) کہاوتیں یکجا کی گئی ہیں۔ جن میں سے بعض فحش بھی ہیں۔ اندرونی شواہد کی بناء پر راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ زٹلی ہی کی لکھی ہوئی ہیں اس نسخہ کی کچھ ضرب الامثال نقل کی جاتی ہیں۔

آ بلا گلے لگ جا

آپ ڈوبا تو جگ ڈوبا

آپ ڈھاپ عیب خود بہ پوش

---

[1] نمبر مخطوطہ ۵۵، فن لغت

اپنے منہ دھنا بجائی۔ آپ ہی میاں منگتا باہر کھڑے درویش

اناولا سوبادلا۔ اترا شحنہ مردک نام

رتی تورائی ہوگی جو راستے میں پڑے۔ آنکا بنبا سوا دیوے

اجڑے گھر کا بلینڈ استقف یا ستون۔ اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام

چھوہاہل میں سماتا نہ تھا کانوں باندھا چھاج

سن لے ڈھول بھر کے بول

سمن (رحیمن کی خرابی) دھاگا پریم کا تورو چٹکائے

تورے ہر جیون جو رہو بیچ گانٹھ پڑ جائے۔

احسان لیجئے جہان کا نہ احسان لیجئے شاہ جہان کا"

تٹی کے اوٹ شکار کھیلے۔

ہری بہرے ٹل گئے جلوے کے وقت ٹل گئے۔

ہرن کھائے کھیت منہ سونگھا جائے بکری کا۔

ہزار ہاتھی کٹا تو بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔

ہزار لاٹھی ٹوٹے تو بھی گھر بار کے بانس توڑنے کو بس ہے

ہنس ہنس کھائے پھوہڑ کا مال

محمد حسین کلیم جعفر زٹل کے بعد شمالی ہند کے شعرا میں "محمد حسین کلیم" کا نام ملتا ہے جن کے متعلق میر حسن تذکرۃ الشعرا میں لکھتے ہیں کہ ہماری نثر میں ایک کتاب "ایجاد" کی تھی

۱۔ میر تقی میرؔ تذکرہ نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ کلیم در فارسی گذشتہ است اما کلیم ریختہ فقیر این است قطع نظر بندہ را بہ خدمت او قرابت قربیت است یک اخلاص تہ دلی دارم واکثر بہ حال این ہیچ مدان شفقت

می فرماید"[۱]

۲- میر حسن تذکرۃ الشعرا میں تحریر فرماتے ہیں۔

" در فن شعر و شاعری استاد سخن بحر ذخار طبعش در نثر ونظم موج زن رسالہ در عروض و قافیہ ہندی تصنیف فرمودہ "فصوص" را کہ عربی است زبان ریختہ ترجمان کردہ کتابے نثر در ہندی نیز ایجاد کردہ"[۲]

میر حسن کے اس بیان سے نثر میں کتابوں کی کمیابی کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳- مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ کلیم نے عروض و قافیہ پر اردو میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا اس کے علاوہ مرزا نے ان کی دو اور نثری کتابوں کا بھی تذکرہ کیا۔ لکھتے ہیں۔

" ایک رسالہ عروض و قافیہ کا زبان ریختہ میں لکھا ہے اور "فصوص الحکم" کا ترجمہ بھی ہندی زبان میں لکھا ہے۔ ایک نثر اور بھی زبان ریختہ میں ریختہ قلم معنی رقم رکھتا ہے"[۳]

۴- نواب مصطفےٰ خان شیفتہ "گلشن بے خار" میں کہتے ہیں کہ وہ میر تقی میر کے بہنوئی تھے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے طب بھی جانتے تھے۔ دیوان اور مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں"

مگر ان کے دیوان اور مثنویوں کا تذکرہ کسی اور نے نہیں کیا۔

مولوی عبدالحی تذکرہ گل رعنا میں لکھتے ہیں:-

---

۱ نکات الشعرا مجموعہ انجمن ترقی اردو صفحہ

۲ منقول از "گل رعنا" صفحہ ۱۱۱

۳

"سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ ایسے بڑے فاضل شخص کے حالات اب تک نہ تذکرہ مشائخ میں ملے نہ اور کسی کتاب میں معلوم نہیں کس خاندان میں پیدا ہوئے کس سے تعلیم پائی کس کی صحبت میں حقایق و معارف کا چسکا پڑا کس سے مشورہ سخن کرتے تھے اور کس سنہ میں وفات پائی"[1]

لیکن کلیم کی مذکورہ بالا تصانیف اب نایاب ہیں۔ راقم الحروف کو کسی کتب خانہ میں ان کا پتہ نہیں چل سکا۔ حامد حسن قادری نے کلیم کا اردو فقرہ نقل کیا ہے جس کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"میر حسن نے کلیم کا صرف ایک فقرہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے کے متعلق نقل کیا ہے۔ یہی فقرہ تبرک کی طرح تمام مصنفین "آبِ حیات" "سیر المصنفین" "یوپی میں اردو" وغیرہ میں دست بدست منقل ہوتا رہا ہے"[2]

جہاں تک سیر المصنفین کا تعلق ہے۔ مرتب مقالہ کو اس میں نہ تو کوئی اردو فقرہ محمد حسین کلیم کا ملا۔ اور نہ ان کا تذکرہ سیر المصنفین میں سرے سے کلیم کا ذکر ہی نہیں ہے۔ پتہ نہیں کہ پھر یہ تسامح قادری صاحب کو کس طرح ہوا۔
کلیم کا وہ فقرہ جو احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے پر کہا گیا تھا یہ ہے

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے مورلبصیر الی دولت سے زنہار زنہار خاعتبو یا اولی الابصار"[3]

غالباً یہی ایک دو جملے ہیں جو کلیم کی نثر کے نمونے کے طور پر اب ہماری دسترس میں

---

[1] تذکرہ "گُل رعنا" صفحہ ۱۱۳

[2] داستانِ تاریخ اردو صفحہ ۱۵۱

[3] اردو کے اسالیب بیان صفحہ ۳۷

Hanif Raza

میں رہیں۔ کلیم شاعر بھی اچھے تھے گو اکثر تذکرہ نویس ان کو اعلیٰ پایہ کا شاعر نہیں مانتے لیکن ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے زمانے کے منجھے ہوئے سخن سنج تھے۔ شعر حسبِ خاصہ مقبول ہے۔

غرورِ حسن کیا ممکن کسی کی داد کو پہونچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فرہاد کو پہونچے

گارساں ڈی۔ تاسی نے ایک کتاب روضتہ الشعراء کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس کے مصنف کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ حاشیہ میں مترجم نے اسے محمد حسین کلیم کی تصنیف بتایا ہے[1]

حاشیہ کی عبارت یہ ہے:۔

"مصنف کو وہم ہوا ہے یہ تذکرہ نہیں بلکہ محمد حسین کلیم کا قصیدہ ہے جس کے متعلق میر صاحب نے لکھا ہے" یہاں محمد حسین کلیم ... قصیدہ گفتہ مسمیٰ بہ روضتہ الشعراء در و نام تمام شعراء نقل کردہ"

سوائے اس کے محمد حسین کلیم کی اور کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ کلیم کے مندرجہ بالا ایک دو جملوں سے اندازہ لگتا ہے کہ دکھن کی بہ نسبت شمالی ہند میں عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا چلن زیادہ ہے اس کے برخلاف جیسا کہ آیندہ صفحات میں پیش کردہ نمونوں سے واضح ہوگا دکھن کی زبان سلیس اور عام فہم تھی۔ تب ہی تو شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں:۔

شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء تک کوئی نثر اردو کی کتاب ہماری نظر سے ایسی نہیں گزری جس میں کوئی فن یا کسی طرح کا قصہ بیان ہوا ہو جا بجا اگلے وقت کی عبارتیں لکھی دیکھی ہیں جن میں لغات غیر مانوس عربی فارسی کا جماؤ اور قافیوں اور ذومعنی لفظوں کے چھوٹے نگینے

---

[1] خطبات گارساں ڈی تاسی صفحہ ۱۰۱

Hanif Razvi

بہت سے جڑ دیے ہیں"

فضلی

شمالی ہند کے اوّلین نثر نگار کی حیثیت سے مولانا فضلی کا ذکر تقریباً سارے "تذکرہ نگار کرتے آئے ہیں اور خود فضلی کو اپنے اس" اجتہاد" پر فخر تھا۔ چنانچہ اپنی کتاب "کربل کتھا" (ترجمہ دہ مجلس) کے مقدمے میں انہوں نے صاف الفاظ میں لکھا ہے۔

کوئی اس صفت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نثر میں ہوا"

حالات زندگی

فضل علی نام اور فضلی تخلص تھا۔ نواب شرف علی خاں کے بیٹے تھے محمد شاہی عہد میں ہوئے مولانا احسن مارہیروری انہیں اورنگ آبادی بتاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

اس لحاظ سے کہ ۱۱۶۱ھ میں فضلی نے دوبارہ اپنے ترجمے کی اصلاح کی ہے اور اس گمان پر کہ شاہ فضل اللہ فضلی حنفی و نقشبندی کے سوا دوسرے فضلی کا پتا نہیں ملتا حسب تحریر تذکرہ "محبوب الزمن" مذکور کی وفات ۱۱۸۷ھ میں بعید از قیاس نہیں سمجھی گئی" [۱]

چنانچہ حامد حسن قادری نے بھی اپنی کتاب داستان تاریخ اردو میں احسن مارہروی کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور لکھتے ہیں۔

اس بناء پر فضلی کا دکن لاصل ہونا لازم ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ فضلی دکن میں نہیں رہے۔ شمالی ہند میں رہ کر انھوں نے علم حاصل کیا انشاپردازی سیکھیں اور تصنیف تالیف کی

---

[۱] منثورات (تاریخ نثر اردو) صفحہ ۶۴

Hanif Raza

ان کے ان کے دیباچہ کی تمام نثر میں اور کہیں دکنی الفاظ روزمرہ اور اسلوب پایا جاتا جبکہ دکن میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک الفاظ و زبان کی قدامت موجود ہے"[1]

مولف تذکرہ محبوب الزمن فضلی (فضل اللہ) کے حالات میں فضلی کو سُنّی بتایا ہے۔ ڈی تاسی۔ کریم الدین وفیلن ان کو "شیعہ" لکھتے ہیں۔

اس لئے راقم الحروف کے خیال میں مولانا احسن مارہروی کو فضلی نام سے مغالطہ ہوا ہے۔ فضلی اورنگ آبادی دوسری شخصیت ہیں جو فضلی (دہلوی) کے تقریباً معاصر تھے۔ ۱۸۴۰ء ان کا تذکرہ خواجہ خاں حمید نے "ریاض الحبشی" میں فتوت نے "تذکرہ فتوت" میں لچھمی نارائن شفیق نے "چمنستان شعرا" میں اور اسد علی خاں تمنا نے "گل عجائب" میں کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام شاہ فضل اللہ اور فضلی تخلص تھا۔ یہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے باپ سید عطاء اللہ غازی الدین فیروز جنگ کے ساتھ عرصہ دراز تک رہے۔ فضلی اورنگ آبادی ہی کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے قصہ پریم لوکا قصہ بیوہ بیوکا اور دو مثنویاں ہیں فنِ سلوک میں ایک رسالہ فارسی میں "زادراہ" لکھا تھا ۱۸۴۲ء میں ان کا انتقال ہوا[2] سب سے پہلے کریم الدین نے "طبقات الشعرا" میں فضلی کے نثری کارنامے "کربل کتھا" کا ذکر لکھا ہے اور دیباچے کا ایک طویل اقتباس بھی دیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:۔

اس جائے تک مصنف کے کلام تمام ہوئے اب میں کہتا ہوں کہ اس کتاب کو میں نے دیکھا وہ میرے پاس موجود تھی اس مصنف نے ڈھنگ اس کا اچھا ڈالا ہے مگر اتنا قصور ہے کہ عبارت اچھی نہیں یعنی بول چال اور محاورات متقدمین کے ہیں یہ اس کا قصور نہیں واقع میں اس کے

---

[1] داستان تاریخ اردو صفحہ ۵۳ [2] "دکن میں اردو" صفحہ ۳۳۲

زمانے میں اردو زبان ایسی صاف نہ ہوئی تھی جیسی کہ اب ہے۔ یہ بات اس مصنف کی گفتگو سے بھی ثابت ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ میں اس کتاب کی تصنیف میں دلیری نہ کر سکتا تھا سبب اس کے کہ اب تک کوئی ترجمہ فارسی سے زبان اردو میں نہیں ہوا بلحاظ طعنہ لوگوں کے رو کا ہوا تھا۔ مصنف کا مذہب شیعہ ہے اس نے مرثیہ اور مناقب اور مدح ائمہ میں بہت شعر کہے ہیں مگر سب بہ سبب محاورات قدیم کے لچر ہیں۔ چند شعر جو اس نے شہادت امام قاسم کے بیان میں لکھے ہیں وہ لکھتا ہوں وہ کہتا ہوں کہ اس وقت ماں بین کر کے روتی تھی اور دلہن چیخ مار کر کہتی تھی۔

"تقدیر نے میرے تئیں گھونگھٹ ہی میں افسوس
میت بنے کی مجھے لا لاش دکھائی"[1]

اس کے بعد پورا مرثیہ نقل کیا ہے

گارساں دی تاسی اپنی تاریخ ادبیات جلد اول میں فضلی کے متعلق لکھتا ہے

فضلی نے وہ مجلس نثر مخطوطہ بہ نظم بطرز قدما لکھی ہے۔ فورٹ ولیم میں بظاہر اس کا قلمی نسخہ تھا۔ حیدری کی گل مغفرت کا نہیں۔ فضلی نے یہ کتاب شرف علی کی ماں کے لیے لکھی تھی (اس پر نگر کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ تھا اور یہ دہلی میں ۱۸۵۰ء میں طبع ہوئی ہے۔ فضلی شیعی تھے انھوں نے اس کتاب کے علاوہ بہت سے مراثی مناقب اور مدح ائمہ اور اماموں کی مدح لکھی"[2]

---

[1] مخطوطہ طبقات الشعراء مملوکہ شمس اللہ قادری

[2] ہسٹری دی لٹریچر جلد اول صفحہ ۴۵۸، ۴۵۹

طبقات کے بعد ایک کیٹیلوگ آف دی ببلوتھیکا اورینٹالس اسپرنگر یانا[1] ہے جس میں ان کتابوں کا ذکر ہے جو اسپرنگر کے ذاتی کتب خانے میں تھیں اور جو غالباً سب کی سب برلن کے ملکی کتب خانے میں جنگ عالمگیر سے قبل موجود تھیں۔ اس فہرست کے صفحہ ۱۲ میں نمبر ۱۷۳ دہ مجلس کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے[2]

دہ مجلس حسین اور ان کے رشتہ داروں کی موت کل حزینہ نظم و نثر میں از فضلی جو محمد شاہ کے عہد میں ہوا تھا"[3]

آب حیات میں لکھا ہے کہ

محمد شاہ کے عہد ۱۱۵۵ھ میں ایک بزرگ تھے جن کا تخلص فضلی تھا انھوں نے دہ مجلس نام ایک کتاب لکھی تھی غالباً یہی اردو کی پہلی تصنیف ہوگی[4]

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

بہرحال اس وقت تک انشا پردازی اور ترقی زبان اردو کی فقط شعرا کی زبان پر تھی جن کی تصنیفات۔ عاشقانہ اور مدحیہ قصیدے ہوتے تھے اور ان سے غرض امرا و اہلِ دل سے انعام کا تھا۔ نثر کے حال پر کسی کی

---

[1] دہ مجلس دی لٹریجیکل ہسٹری اف دی ڈتھ اف حسین اینڈ ہز ریلیٹیراں پروازانیڈ ورس بائی فضلی ہو فلورشڈ انڈر محمد شاہ"

[2] اس کا حوالہ قاضی عبدالودود کے مضمون "دہ مجلس فضلی" مطبوعہ معاصر میں ملتا ہے ۔ موصوف کا بیان ہے کہ یہ عبارت ان کے دوست شاہ مقبول احمد استاد اردو سنٹرل کالج کلکتہ نے ان کی استدعا پر نقل کر کے بھیجی ہے

[3] آب حیات صفحہ ۲۱

توجہ نہ تھی ۱۲۱۳ھ میں میر عطا حسین خاں نے چار درویش
کا قصہ اُردو میں لکھا تھا ادھر یہ حال تھا کہ چونچال لڑکا کے جلسوں
اور امرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل
بہلا رہا تھا ادھر دانائے فرنگ نے کلکتہ میں اس کی پرورش کی جانب
توجہ کی۔[1]

چنانچہ آبِ حیات میں نفضلی کتاب کا تذکرہ آجانے کے بعد حکیم شمس اللہ قادری منصف اردوئے قدیم[2] محمد یحیی تنہا مصنف سیر المصنفین[3] احسن مارہروی[4] مصنف مثل اور اردو سب نے اپنی تصنیفات میں نفضلی کی اس کتاب کے وجود کو تسلیم کیا۔ لیکن سوائے دیباچے کے کسی نے متن کتاب کا اقتباس نہیں دیا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر زور نے اس کتاب کے وجود پر مختصر تاریخ ادب اردو[5] میں شبہ کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"مشہور ہے کہ نفضلی نام ایک اُردو کے اہل قلم نے فارسی کتاب روضتہ الشہدا کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے اس کا ذکر آبِ حیات میں کیا گیا ہے۔ اور اسی بنا پر یہ روایت مشہور ہے لیکن اس کا صرف نام ہی سنا جاتا ہے۔ کوئی قلمی نسخہ اس اُردو روضتہ الشہدا کا موجود نہیں ہے"

چنانچہ قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے اس مضمون میں جس کا ذکر گزر چکا ہے[6] ڈاکٹر زور کی تائید کی ہے اور لکھتے ہیں۔

۱؎ آبِ حیات صفحہ (۲۱)

۲؎ اُردوئے قدیم صفحہ (۱۳۰)

۳؎ سیر المصنفین صفحہ (۴۴)

۴؎ خشورات صفحہ

۵؎ تاریخ ادب اردو ادارۂ ادبیات صفحہ (۹۲)

۶؎ رسالہ معاصر پٹنہ جلد ۴ شمارہ ۲؎

Hanif Razvi

"میرا حافظ دھوکہ نہیں دیتا تو کسی دوسری جگہ اس نے دُدی (اس) نے یہ بھی بتایا ہے کہ دہ مجلس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے میں نے دہ مجلس کے مطبوعہ نسخے کو بہت ڈھونڈھا مگر کہیں نہ ملا شاہ مقبول احمد نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے مخطوطات اردو کی فہرستوں میں اسے تلاش کیا مگر یہ فہرستیں اس کے ذکر سے خالی ہیں یہ یقین ہے کہ دتاسی نے خود یہ کتاب نہیں دیکھی ورنہ اپنے دستور کے مطابق نسخہ مطبوعہ تفاصیل دیتا میرا خیال ہے کہ اس نے دھوکہ کھایا ہے اور یہ کتاب اس وقت تک طبع نہیں ہوئی ڈی تاسی کا یہ بیان کہ شرف علی خاں کی والدہ کے لیے لکھی گئی اس کے ماخذ میں نہیں اور ان چیزوں کے علاوہ وہ جو خود دہ مجلس میں ہونگی مراثی وغیرہ کی قسم سے اس کی کوئی چیز دستیاب ہوتی ہے نہ اس کا کسی نے ذکر کیا ہے۔ یہ کہیں زیادہ قرین قیاس ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا نسخہ گل مغفرت ہو[۱] فضلی کی ایک ہی تصنیف "دہ مجلس" کا سراغ ملا ہے جس کو اکثر تذکرہ نگاروں کی نثری کارنامہ قرار دیا لیکن یہ نظم و نثر دونوں میں لکھا گیا تھا۔ اب تک صرف نثر میں ان کا دیباچہ ملتا ہے۔ اور چونکہ یہ نایاب ہے اس لیے تمام وکمال درج کیا جاتا ہے۔

دیباچۂ کربل کتھا

تالیف ملا فضلی در عہد محمد شاہ بادشاہ

ماخوذ از طبقات الشعرا مولفہ منشی کریم الدین

اس کتاب کا سبب تالیف یہ ہے کہ قبلہ حقیقی اور کعبۂ تحقیقی میرے والد نواب مستطاب معلےٰ القاب اعلیٰ نواب بابام نواب شرف علی خاں سلمہ اللہ الملک المنان۔ ہر سال تعزیہ ابو عبداللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام

---

[۱] مطبوعہ معاصر جلد ۳

کا بہ خلوص نیت اندرون محفل مخفی بہ موجب حدیث شریف کہ التقیہ دینی و دین آبائی و التقیہ جنتہ بوجہ احسن بجا لاتا تھا اور بندہ حقیر پر تقصیر حسب الارشاد اس قبلہ گاہ کے روضتہ الشہدا کا خلاصہ کہ سب نکتہ سنجان مناقب شاہ لا فتے اور سب دقیقہ فہمان مصائب سید الشہدا نے واقعہ شہادت شاہ کربلا کا اس میں لکھا ہے سناتا تھا لیکن منے اس کے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ اور فقرات پرسوز و گداز اس کتاب مذکور کے بہ سبب لغات فارسی ان کو نہ رلاتے تھے۔ اکثر اوقات وہ یہ کہتے کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں ایسا کوئی صاحب شعور ہو کہ کسی طرح من عن ہمیں سمجھاوے اور ہم سے بے سمجھوں کو سمجھا کر رلا دے مجھ احقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر توجہ اس کتاب کا بہ رنگینی عبارات اور حسن استعارات ہندی قریب الفہم بیچ عامہ مومنین و مومنات کیجیے تو موجب اس کلام بانظام کے من بکی اعلے الحسین او تبا کا وجبت لہ الجنتہ بڑا ثواب لیجیے۔ ترجمہ :- جو شخص رویا اوپر حسین کے یا جس نے رلایا اوروں کو اس کے واسطے جنت واجب ہوئی۔ کیونکہ اس فائدہ سبحانی اور اس فائدہ ربانی سے زن و مرد اور پیر و جوان خواندہ و ناخواندہ اور خورد و کلان کو بہرہ فاضل اور نصیبہ کامل ہوئے اور ہر ایک بے خبر اس درد پرسوز اور اس خبر غم اندوز کو سن کر اور سمجھ کر روئے۔ بہرحال دل میں یہ گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئی شامل کیونکہ بے تائید عیدی اور بے مدد جناب احمدی یہ شکل صورت پذیر نہ ہوئے۔ اور گوہر مراد

Hanif Raza

رشتہ امید میں نہ آئے۔ لہذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع۔ اور اب تک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نثر نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشہ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل وتدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی ناگاہ عنایت الہی گلشن انوگار پر اہتزاز میں آئی۔ یہ بات آئینہ خاطر میں منہ دکھلائی کہ یہ فکر عظیم بغیر امداد ارواح مقدس حسین علیہ السلام حسب خواہش محبوبوں کے سر انجام نہ پائے۔ جب ذکر حسین علیہ السلام کی مدد کا ذہن نشین ہوا وہیں دل کو تقویت ہوئی پھر خاطر میں گزرا کہ قادر حقیقی اور خالق تحقیقی نے ذات انسانی کو ایسی قدرت کرامت کی ہے کہ جس کام پر طبیعت اور توجہ کو مصروف رکھے البتہ معطل و موقوف نہ رہے اور انصرام کو پہنچے۔ اے دل بہ حکم السعی منی والاتمام من اللہ اس سعادت عظمیٰ اور اس سعادت کبریٰ کو خاطر امید میں موافق اس بیابان فصاحت و بلاغت کو ساتھ تائید عنایات غیبی کے طے کر اور بہ مقتضائے حدیث؛

الداعی علی الخیر کفاعلہ امید صواب پھر ایک رات بعد کتاب خوانی اور سینہ زنی کے ایک فاتحہ مخفی اس کام بانظام کے لیے بھی پڑھا وہیں برکت اور میمنت فاتحہ سے مجھ بے دل کے دل کو ایک انشراح اور انفتاح ظاہر ہوا۔ پھر ساتھ نظر تاملی اور فکر کے مطالعہ لا تحرک ذرۃ الا باذن اللہ کا کر سو گیا میں اسی رات رویا میں دیکھتا ہوں کہ گویا ایک طرف بہ مع اخوان ذیشان و دوستان بہتر از جان سیر کو جاتا ہوں۔ مابین راہ میں ایک شخص اجنبی نے کہا کہ اول روضہ مقدس حسین علیہ السلام کی زیارت کو

Hanif Razvi

جائیں۔ بہ خواہش اتم اور بہ خوشی اکمل اس روضہ منورہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ عمارت باہدایت اس مکان لطیف کی بعینہٖ مانند عمارات حضرت قدم شریف کے ہے۔ اور متصل دیوار کے دو قبریں نہایت ملی ہوئی باہم چوں قافیہ و ردیف ہیں۔ ایک بالشت بھر سرہانے کی طرف سے سبز ہے۔ اور ایک سرخ ہے۔ میں نے بہ ادب تمام اور بہ صدق تمام فاتحہ پڑھ کر سرہانے کی طرف بیٹھ کر مناقب شروع کیا۔ اور مجھے وہ معراج بلند حاصل ہوا۔ اور وہیں میرے فلک چشماں سے رونا نازل ہوا۔ یکایک ان مرقدوں سے دو دستہ نرگس کے نہایت تر و تازہ نکلے۔ لیکن میں مناقب پڑھتا اور روتا رہا۔ کہ دو دستہ اور نکلے۔ تب میں نے یہ دعا مانگی کہ یا امامین علیہما السلام ایک دستہ اور عنایت ہووے کہ میرا صدق دل مجھ پر ثابت ہوئے کیونکہ میں پنجتن کا خادم ہوں۔ مگا مانگنے ہی دعا کے ایک دستہ اور تر و تازہ نکلا۔ حاصل الامر تا شام اسی درگاہ فلک بارگاہ میں رہا۔ اور دل میں کہا کہ اے فضلی تو ایسی جناب مستطاب اور ملجا مآب عالم و عالمیاں سے کہاں جاتا ہے اور پھر اپنے تئیں جاہ دنیا میں پھنساتا ہے۔ یہیں رہ اور مت جا۔ اس قصد کو مصمم کر وہیں رہا۔ یکایک بہ عنایت ایزدی اور بہ ہدایت صمدی ایک جوان ریش بروت آغاز انہی قبروں سے نکلا۔ ایک عبا کہ رنگ اس کا مجھے یاد نہیں اوڑھے ہوئے دونوں قبروں پر سوار مجھے خبر نہ تھی کہ وہاں کے خادموں نے کہا کہ اے فضلی دیکھو کہ حضرت امام حسین یہی ہیں۔ یہ سنتے ہی بہ شادی تمام دست و پا گم دوڑا دیکھا اس جمال جہاں آرا کو کہ مانند مہر منور اور ماہ انور کے برج روضہ مقدس

کو روشن کیے ہوئے بیٹھے روتے ہیں اور گوہر غلطاں اشک صدف
رخسار آبدار پر بہتے ہیں۔ میں دیکھتے ہی اس جمال باکمال کو تصدق
ہوا قدموں پر یہ [illegible]ل کیا کہ یا حضرت حق تعالیٰ میری یہ مراد دے
جو پیشانی کو ان مبارک قدموں پر ملے لیکن باعث رونے اور مجھ سے
نہ بولنے کا کیا۔ یہ کہتا تھا اور آنکھیں اپنی تلوؤں میں ملتا تھا کہ ایک
مرتبہ ایک شخص میرے ساتھ کا آیا اور اس نے کہا کہ بھائی اور آشنا
تمہارے سب سوار ہو گئے اور تم اب تک یہیں بیٹھے رہے۔ بلکہ تمہاری
سواری کا گھوڑا بھی گیا۔ جونہی میں سنا کہ گھوڑا گیا خوش ہوا اسے جواب
دیا کہ بھلا ہو گیا۔ لیکن میں تو یہاں سے نہ گیا ہوں نہ جاؤں گا۔ غلامی
اس جناب نے قبول کی۔ تب آپ لب اعجاز بیان سے فرمائے اب تو
جا پھر آئیو۔ میں نے بہانہ کیا کہ یا حضرت اب تو میری سواری کا گھوڑا
بھی گیا۔ اور میں یہ قدم چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ پھر زبان مبارک سے ارشاد
کیا کہ باہر ایک پالکی بنی دھری ہے اس پر سوار ہو جا۔ پھر عدول حکم
نہ کر سکا۔ اور عرض کیا کہ یا حضرت اگر پھر آؤں تو تحفہ تمہارے واسطے
نثار کے کیا لاؤں۔ حکم ہوا کہ کئی روپے اور ایک کپڑا جھالردار اور
ایک کپی تیل کی۔ اور ایک پوڑی مسی کی۔ تصدق ہوا آداب رخصت
بجا لایا باہر گیا۔ اور اسی پالکی پر سوار ہو کر چلا۔ وہیں آنکھ میری کھل
گئی۔ دیکھتا ہوں کہ وقت نماز ہے۔ اٹھ کر بعد ادائے فرض کے دو
رکعت شکر بجا لایا۔ یہ مصنف یوں کہتا ہے کہ یہ گوہر گراں بہا ذکر
خواب کم یہ تائید بحر رحمت الٰہی کہ صدف امید سے سلک عبارت میں
منسلک ہوا۔ وکفیٰ باللہ شہیدا کہ مبرا از کذب و خلاف ہے۔ بموجب
نص صحیح کہ لعنت اللہ علی الکاذبین ومعہذا تہمت بر جناس

Hanif Razvi

حضرت امام حسین باعث کفر ہے۔ اگرچہ مجھ سا نالایق روسیا اس منظہر سبحانی کے دیدار مطلع انوار کو دیکھنے کی طاقت کہاں رکھتا تھا لیکن اس کے فضل خاص اور فیوض علم سے بعید نہیں۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

یہ رسالہ مسعود اوپر بارہ مجلس اور ایک خاتمہ کے ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کی تاریخ مصنف نے یوں لکھی ہے۔

یہ جو نسخہ ہوا ہے اب تصنیف
بہر کسب ثواب فیض بشر
چاہا تاریخ اس کی بولے سروش
شیعوں کی نجات کا مظہر

اور اب کے نظر ثانی و کیفیت مضامین ہندی اصطلاحات و استعارات رنگین اصلاح دیا۔ اس تاریخ نے صفحہ دل پر جلوہ دیا

ہر کس از من کند بہ نیکی یاد
بہ جہاں نامش ہم بہ نیکی یاد

۱۱۶۱ھ

فضلی کی اس تصنیف کی مقبولیت نے بہت سے لوگوں کو اس کے تتبع پر مجبور کیا چنانچہ جب راقم الحروف نے فضلی کی دہ مجلس کی مختلف کتب خانوں میں تلاش کیا تو حسب ذیل ترجموں اور تصنیفوں کا پتہ چلا۔ ان میں سے سب فورٹ ولیم کالج سے قبل کی ہیں اور مخطوطوں کی شکل میں ہیں۔

۱۔ روضۃ الشہدا ۱۱۷۰ھ محمد فیاض ولی ویلوری[1]

---

[1] مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۵۸

٢- روضتہ الاطہار — نوازش علی خاں شیدا ٢ے

٣- دہ مجلس — شمس الدین ولی ٣ے

٤- بستان شہادت — سید احمد درویش ٤ے

٥- گنجینۂ شہدا — امان اللہ ٥ے

٦- روضتہ الشہدا — محکم ٦ے

٧- نقلی ماتم — مرزا جعفر علی فصیح ٧ے

٨- حالات شہادت — مصنف نامعلوم ٨ے

٩- دہ مجلس — " ٩ے

١٠- دہ مجلس — فاضل ١٠ے

ان میں نمبر ۱-۲-۵ اور ۱۰، منظوم ہیں۔ نمبر ۹-۳ اور ۷ نثر میں ہیں مخطوط نمبر ۹ ادارہ ادبیات اُردو کی ملک ہے۔ جو دکھنی اُردو میں فضلی نے بھی اردو نثر میں ایسی ہی کتاب لکھی تھی لیکن بقول ڈاکٹر زور

"یہ ٹھیٹ دکھنی مصنف کی دہ مجلس ہے جیسا کہ زبان و اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے"

٢ے مخطوط ادارہ ادبیات اُردو تذکرہ اُردو مخطوطات صفحہ ۵۷،

٣ے " " " " " "

٤ے مخطوط کتب خانہ جامعہ عثمانیہ و کتب خانہ آصفیہ صفحہ ٢٦٧

٥ے مخطوط آصفیہ

٦ے " "

٧ے تذکرہ اُردو مخطوطات صفحہ ١٩٣

٨ے تذکرہ اُردو مخطوطات " ١٤٣

٩ے تذکرہ اُردو مخطوطات "

١٠ے تذکرہ اُردو مخطوطات

Hanif Razvi

سراج الدین علی خان آرزو شمالی ہند کے شاعروں میں زبان اردو کی معمار اور بام ترقی پر لے جانے والے کی حیثیت سے سراج الدین علی آرزو کا نام یادگار رہے گا انھوں نے نوادر الالفاظ کے ذریعے اردو کی بڑی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔

خان آرزو میر کے سوتیلے ماموں اور فارسی اردو کے زبردست شاعر تھے وہ بڑے عالم بھی تھے۔ لالہ سری رام مصنف "خم خانہ جاوید" کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا وطن اکبر آباد تھا۔ لیکن وہ گوالیار میں بہ سلسلہ ملازمت رہے بعد میں شاہ جہاں آباد دہلی میں قیام رہا۔ ان کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت ہندی پنجابی اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے واقف تھے۔ ان اوصاف کی بنا پر ہندوستانی زبانوں کے متعلق ان کی زبان دانی مسلّم تھی۔ اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے لگ سکتا ہے۔ آرزو کی استادی کا اعتراف ان کے ہر ایک معاصر نے کیا ہے

میر تقی میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں۔

"ہمہ استادان مضبوط در ریختہ ہم شاگرداں آں بزرگوار اند"

مولانا آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں:۔

"خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ اور منطق پر ہے"

آرزو کا سب سے بڑا کارنامہ "غرایب اللغات" کی تصحیح ہے۔ عبدالواسع ہانسوی نے غرایب اللغات کے نام سے ایک لغت لکھی تھی۔ جس میں اردو الفاظ کے معنی فارسی میں دئے تھے۔ خان آرزو نے اس کی تصحیح کی اس کتاب کو ڈاکٹر عبداللہ پروفیسر اردو پنجاب یونیورسٹی نے اپنے مقدمہ و حواشی کے ساتھ شایع کیا ہے مقدمہ میں ڈاکٹر عبداللہ نے آرزو کے حالات زندگی بھی تحقیق اور تفصیل سے لکھے ہیں۔

یوں تو آرزو شاعری کی حیثیت سے بہت مشہور رہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ

Hanif Razvi

شاعری آرزو کا بڑا کارنامہ نہیں۔ بلکہ ان کی وہ خدمات ہیں جو انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور مقبولیت کے سلسلے میں انجام دیں۔ زبان اردو کی خدمت کے سلسلے میں جو خدمات قابل ذکر ہیں ان سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اُردو میں خود شعر کہہ کر اپنے شاگردوں میں اردو شاعری کا ذوق پیدا کیا۔ اور اس طرح اُردو کے ادبی پایہ کو بلند کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستانی زبان کی لسانی تحقیق کی بنیاد بھی رکھی اور ہندوستانی لسانیات کے ابتدائی قواعد وضع کیے۔

چنانچہ پروفیسر عبداللہ لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک اُردو لغت نگاری کا تعلق ہے ہم آرزو کو اردو کا پہلا معیاری اور بلند پایہ لغت نگار قرار دے سکتے ہیں یہ صحیح ہے کہ میر عبدالواسع ہانسوی کو ان پر تقدیم ہے مگر فن اور معیار کے اعتبار سے خان آرزو کو ہی ترجیح اور تقدم حاصل ہے۔"

ڈاکٹر عبداللہ نے ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتب کا ذکر کیا ہے

۱۔ "مجمع النفائس" فارسی شعراء کا تذکرہ ہے

۲۔ "مثمر" جس میں قواعد زبان اور لسانیات کے مسائل بیان کیے گئے ہیں

۳۔ "چراغ ہدایت" فارسی لغت

۴۔ "سراج اللغات" فارسی لغت

۵۔ "داد سخن" تنقید شعر

۶۔ "نوادر الالفاظ" لغت

۷۔ "دیوان" اشعار فارسی

لیکن منور سہائے اپنے ایک مضمون میں خان آرزو کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ دو دواوین دیوان آرزو در جواب دیوان شفیعائے اثر

Hanif Razvi

دیوان در جواب دیوان سلیم

دیوان آرزو در جواب دیوان فغانی

دیوان آرزو دوم

۲- مثنویات:- "شورش" معروف بہ سوز و ساز در جواب محمود و ایاز زلالی

جوش و خروش

مہر و ماہ

عبرت فسانہ

مثنوی ناکمل در بحر سنائی

۳- لغات "سراج اللغات" چراغ ہدایت" نوادر الالفاظ

۴- قواعد زبان و لسانیات "مثمر"

۵- شرحیں:- خیابان گلستان (گلستان سعدی کی شرح)

شرح سکندر نامہ موسومہ بہ شگوفہ زار

شرح قصاید عرفی

شرح گل کشتی میر نجات کی مثنوی کی شرح

سراج وہاج حافظ شیرازی کے ایک شعر کی شرح

۶- تنقید تنبیہ الغافلین حزیں کے اشعار پر تنقید

سراج منیر منیر لاہوری کے کلام پر تنقید

۷- تنقید شعر "داد سخن" جس میں شیدا اور قدسی کے مناقشوں پر محاکمہ ہے نیز یہ بھی بحث ہے کہ زبان دانی میں ہندستانی ایرانیوں کے برابر ہیں یا نہیں۔

۸- بلاغت عطیہ کبریٰ (در علم بیان) موہبت عظمیٰ (در بیان علم معانی)

۹- قواعد زبان معیار الافکار زوائد الفواید۔

Hanif Razvi

۱۰- مکاتیب پیام شوق رقعات آرزو

۱۱- تذکرہ مجمع النفائس فارسی گو ایرانی و ہندوستانی شعراء کا تذکرہ

۱۲- رسائل اداب عشق۔ گلزار خیال و رخصت نفلی بہار و ہولی

۱۳- خطبات دیباچے وغیرہ

مذکورہ فہرست میں صرف نوادر الالفاظ ہی ایک ایسی تصنیف ہے جس کا تعلق اردو سے ہے باقی ساری تصانیف فارسی میں ہیں۔

پروفیسر عبداللہ نے ان کی تخلیلی اور تجرباتی صلاحیت کی مثال کے طور پر "لفظ" ادا کی تشریح لکھی ہے جو خان آرزو نے کی تھی ذیل میں اس کا اقتباس دیا جاتا ہے۔

ادا- علم لفظ ہے میر عبدالواسع اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں

"ادا کیفیتے باشد معشوقاں را کہ بہ تقریر نیابد و ذوق آں را دریابد"

میر عبدالواسع کی یہ تشریح کسی حد تک تشنہ ہے۔ آرزو اس لفظ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں سب سے پہلے وہ اس لفظ کا ماخذ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ لفظ عربی کا ہے فارسی میں اکثر حرکت موزوں کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً ابرو زچشم کی موزوں حرکت کو بھی ادا کہا جا سکتا ہے۔ ادا بعض اوقات مطلقاً بہ معنی حرکت آتا ہے مثلاً ادائے خارج۔ غرض ادا معشوقوں کی کیفیت نہیں بلکہ ان کے اعضاء خصوصاً چشم و ابرو کی حرکت موزوں کا نام ہے۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لفظ کی خوب چھان بین کرتے تھے علمی وسعت کے علاوہ ان کی معلومات کا بہت بڑا حصہ علمی مشاہدہ اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔

عبدالولی عزلت آرزو کے بعد ان ہی کے ایک معاصر عبدالولی قابل ذکر ہیں

جنھوں نے اردو نظم کے علاوہ اردو نثر میں بھی اپنی یادگار چھوڑی۔ عزلت سلون درائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ بعد میں اُن کے والد سید سعد اللہ نے سورت میں بود و باش اختیار کر لی۔ میر عبد الولی عزلت نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی مولوی عبد الحی کی مصنف تذکرہ گل رعنا لکھتے ہیں:۔

"بھاشا میں بھی فکر کرتے تھے دوہے کبت چھولنے سوال وجواب بارہ ماسے مکرنیاں۔ پہلیاں۔ سب ہی چیزوں میں طبع آزمائی کی اور ہر ایک چیز کو سلیقہ سے کیا[1]"

ان کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ ۱۱۶۴ھ میں دلی آئے سراج الدین علی خان آرزو کا زمانہ تھا۔ ان سے ملنے کے بعد عرصہ تک دلی میں رہے میر نے نکات الشعراء میں جن دکھنی شاعروں کا کلام نقل کیا ہے وہ ان ہی کی بیاض سے ماخوذ ہے دلی سے مرشد آباد گئے وہاں سے دکن گئے اور اورنگ آباد میں رہنے لگے۔ ۷ رجب ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی حیدر آباد میں میر مومن کے دائرہ میں دفن ہیں۔

لچھمی نارائن شفیق نے عزلت کے متعلق صائب کا مندرجہ ذیل شعر بالکل ٹھیک لکھا ہے۔

دریں زمانہ کہ عقیم است حملہ صحبت ہا
کنارہ گیر و غنیمت شمار "عزلت" را

شیخ چاند مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ عزلت نے اپنے دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا تھا۔ اس کا ایک حصہ بھی صاحب موصوف نے نقل کیا ہے اس سے عزلت کے اسلوب بیان کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ اس دیباچے میں انھوں نے تدوین دیوان کی وجہ بتائی ہے:

---

[1] تذکرہ گل رعنا صفحہ نمبر (۹۶)

Hanif Raza

"اما پیچھے عجز و درود کے نقیر سید عبد الولی عزلت بخشے اسے
الی الحقیقۃ پر حضرت سید سعد اللہ قدس سرہٗ کا زبان بے جوہری
سے عرض کرتا ہے کہ کتنے جلے ہوئے دم آتش خانہ دیوان ہندی
سے نکال کر اور ان پریشان بیانی میں جمع کیے ہیں تا دوستوں مابین
ہم جہاں فراموشوں کی یادگار رہے اور اس کے سب مصرعے سوختگی
مضامین سے بزم سخن کی شمع کیے ہیں تا چراغ معنی کے پروانہ صدور تولہا
کی آنکھ ہمارے خیال میں اشک باری رہے اور اس کی ہر بیت
بہار جنون میں مصرعوں کے دو ہاتھ سے گریبان پھاڑ رہی ہے۔ اور
ہر سطر ایک ویرانۂ مضمون جنون کو زنجیر کو سرمۂ سوختگی بیان سے
خموشی کے نالے پکار رہی ہے۔ درست فکروں کے ٹوٹے ہوئے دلوں
کے پسند کرائے رب العباد بمحمد وآلہ الامجاد"[1]

اس کے علاوہ انھوں نے ایک مثنوی "راگ مالا" بھی لکھی تھی۔

مرزا رفیع سودا

اس دور کے شعرا میں جنھوں نے اردو زبان اور اردو نثر کی
کی طرف توجہ دی مرزا رفیع سودا بھی ہیں جس کے میر تقی میر کی
مثنوی کو اردو نثر کا جامہ پہنانے کی روایت مختلف ذرائع سے برابر چلی آرہی ہے
لیکن اب یہ کارنامہ ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ تاہم یہ اردو نثر کی
خوش بختی ہے کہ اس شاعر اعظم کے دیوان مراثی کا دیباچہ نثر میں لکھا ہوا ہم تک
پہنچا ہے سودا کے والد مرزا شفیع مرزایان کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری
تھا مرزا شفیع کے بیے ہندوستان آئے اور یہیں دہلی میں رہ گئے۔ مرزا شفیع نے
نعمت خاں عالی کی بیٹی سے شادی کی ان ہی کے بطن سے سودا ۱۱۲۵ھ میں تولد

---

[1] مجلہ عثمانیہ جلد سوم "عبد الولی عزلت"

Hanif Razvi

ہوئے۔ ان کی پرورش اور تربیت دہلی میں ہوئی جب وہ وہیں شعور کو پہنچے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "سلیمان قلی وداد" کی شہرت بہ حیثیت شاعر کی بہت تھی اس لیے پہلے وہ ان ہی کے شاگرد ہوئے بعد کو شاہ حاتم کا ستارہ چمکا تو مرزا نے ان سے تلمذ حاصل کیا۔ مرزا کی شاعری کی شہرت خاص و عام میں ہوئی شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کے پاس بھیجتے تھے۔ شاہ عالم کی معزولی کے بعد فرخ آباد گئے جو اس زمانے میں علم و فن کا مرکز تھا۔ وہاں سے فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں پہنچے انھوں نے ان کی بہت قدر و منزلت کی اور تنخواہ مقرر کردی شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ کے زمانے میں بھی وہی عزت و احترام باقی رہے آخر ستر برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وفا پائی اور لکھنؤ کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ سودا ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس لیے ان کی طبیعت نے نہ صرف غزل بلکہ قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ ہجو غرض ہر صنف کلام میں اپنے جوہر دکھائے اسی اپج نے انھیں نثر میں بھی لکھنے پر مائل کیا۔ چنانچہ عام شاعروں کی عادت کے برخلاف انھوں نے اپنے دیوان مراثی کا دیباچہ اردو میں لکھا۔ شعر کی طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نثر میں بھی فارسی اساتذہ کے نمونے ان کے محرک بنے کیونکہ اس میدان میں بھی انھوں نے گوے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ یہ چیز ان کے جملوں کے درست لفظوں کے انتخاب۔ اور قافیہ اور مسجع کے التزام اور مفہوم کو واضح کرنے میں مشکل پسندی سے اچھی طرح ظاہر ہے۔ چنانچہ ذیل کے اقتباسات سے یہ باتیں واضح ہوگی۔

ضمیر منیر بہ آئینہ داراں مانع کہ مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو لیں بہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامہ دو زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کردن تا زبانی ان

Hanif Razvi

اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفریں رہوں۔

قیمت قدر شناسا ہی سے ہو نچے ہے ہم
ورنہ دنیا میں صدف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینہ بیں مبش از مرغ اسیر نہیں کہ ہر پیچ تفس کے جس و قت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے۔ واسطے گوش داد رس کے غرض جس اہل سخن کا در منصفی زینت لب ہے سر رشتہ حق معانی کا اس کلام کے اس سے انصاف طالب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کا غذ سفید کے مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا۔ تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا۔ چاہے کہ دیکھکر نکتہ چینی کرے ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل کاہے کو مرے"

انسان کہ جس فن سے آپ ماہرانہ کرے چاہئے کہ اس میں اپنی حد سے سخن باہر نہ کرے۔ گفتگوئے جاہل پہلوئے عالم مورد انفعال بلکہ خموشی ہے اس کی برابر صد فضلی و کمال بات کر آوے تو چپ رہ کر گمان کے نزدیک نہ سو طرح کا ہے سخن پردہ خاموشی میں اگر ناگاہ جس فن کا آگاہ ہے اس فن کی بولی بولے گویا ہر دو لب اس کے دروازہ رسوائی کے بات ہیں کہ عمداً اپنے منہ پہ کھولے"

طرفہ میوہ ہے یہ سخت اے دوست
مغز شیریں و تلخ جس کا پوست

مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گوہر سخن عاصی زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے اس مدت میں مشکل گوئی دقیقہ سنجی کا نام رہا ہے اور سدا مرغ معنی عرش آشیاں گرفتار دام رہا ہے"

یہ دیباچہ سودا کے دیوان مراثی میں شامل ہے سودا کے شاعروں میں جنہوں نے

اردو نثر کی طرف بھی توجہ کی قتیل اور رنگین قابل ذکر ہیں

قتیل قتیل دہلی کے رہنے والے تھے اور کھتری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے دیوالی سنگھ نام تھا لیکن مسلمان ہونے کے بعد محمد حسن نام رکھا۔ قتیل کو فارسی زبان پر بڑا عبور تھا اور اپنے علم کے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انشاء اللہ خاں انشاء سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ "دریائے لطافت" انشاء نے ان کی شرکت کے ساتھ لکھی تھی۔

ان کی فارسی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱- نہر الفصاحب ۲- چار شربت ۳- دیوان شعر-

۴- دریائے لطافت۔

"دریائے لطافت" کا وہ حصہ جو منطق۔ عروض۔ قافیہ۔ بیان و معانی پر مشتمل ہے قتیل ہی نے لکھا ہے۔ اس میں قتیل نے انشاء ہی کی طرح ظریفانہ انداز اختیار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مثلاً عروض میں بجائے مروجہ ارکان کے نئے ارکان تراشے ہیں مثلاً مفعول مفاعلین مفعول مفاعلین کے لیے انھوں نے

"بی جان پری خانم بی جان پری خانم"

اور "فاعلین مفاعلین فاعلین" کے لیے

"جت لگن پری خانم جت لگن پری خانم"

تجویز کئے تھے یہ جدت طرازی انھوں نے یقیناً انشاء سے سیکھی تھی لیکن انشاء کی بہت سی جدتوں کی طرح قتیل کی یہ ادبی جدتیں بھی لطائف بن کر رہ گئیں

صنائع لفظی اور معنوی کی تشریح قتیل نے اردو عبارات اور اردو فقروں سے کی ہے ضلع جگت کی مثال میں انھوں نے دریا کا ذکر کرتے ہوئے اس کے مناسب چیزوں کے بیان میں دو صفحے اردو کی عبارتیں لکھی ہیں کچھ یہاں درج کی جاتی ہیں

۱- آپ کا مزہ کچھ آج کھل گیا ہے واللہ تمہاری پانی بہت مشکل ہے

۲- کل سوتا چھوڑ گئے۔ ہر چند ضعف نالی کی بھی تو ان میں جگہ نہ دی

۳- ایک باولی رنڈی کے کہنے سے ہماری چاہ دل سے اٹھا دی

مذکورہ بالا جملے چند نمونے ہیں اور اس طرح کی اور عبارتیں بھی "دریائے لطافت" میں ملتی ہیں۔

قتیل کی اردو تحریر "دریائے سخن" کے علاوہ ان کے مجموعہ مکتوبات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے ان مکاتیب کا مجموعہ "معدن الفوائد" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس میں پہلے حمد و نعت عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں لکھی ہے۔ چند نمونے ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

"بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدائے برتر نے اپنا پیغمبر کیا اور تمام فاضلوں اور عالموں کو اس کی امت کیا"۔

رنگین

فورٹ ولیم سے قریب تر زمانے کے شعراء میں مرزا سعادت یار خان رنگین کو خاص اہمیت حاصل ہے شعر میں یہ دور جدت طرازیوں اور اظہار خیال کے نئے نئے سانچوں اور اسالیب پر طبع آزمائی کا دور تھا۔ رنگین اسی لیے ممتاز ہیں اور ان کی جدتوں کا تذکرہ اس دور کے سارے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے

ان کا نام سعادت یار خاں اور تخلص رنگین تھا۔ ان کے والد طہماسپ بیگ اعتقاد جنگ ایرانی نژاد تھے۔ وطن چھوڑنے کے کچھ دن وہ لاہور میں رہے اس کے بعد دلی چلے آئے۔ بہت جلد ان کی رسائی دربار تک ہوگئی اور بادشاہ نے انھیں منصب ہفت ہزاری سے سرفراز کیا اور چوراسی گاؤں جاگیر میں دے۔ رنگین پیدا تو ہوئے سرہند میں لیکن دلی میں ہوش سنبھالا۔ ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی گئی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد نظام حیدرآباد کی فوج میں افسر توپخانہ کی خدمت پر مامور رہے پھر گھوڑوں کی تجارت شروع کی اس میں زیادہ دلچسپی نہ

Hanif Razvi

ہوئی تو یہ ملازمت چھوڑ کر شاہزادہ سلیمان شکوہ کے زمرہ ملازمت میں داخل ہوئے شاہزادہ سلیمان شکوہ دہلی میں غلام قادر روہیلہ کی بغاوت کے بعد لکھنؤ آ گئے تھے اور آصف الدولہ کے خزانے سے وظیفہ پاتے تھے۔ رنگین کے دوست انشا بھی شاہزادہ ہی کے پاس ملازم تھے۔ کریم الدین مصنف طبقات الشعرا[۱] نے رنگین کا سنہ وفات ۱۲۵۱ھ بتایا ہے گارساں ڈی تاسی[۲] اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ۱۲۵۰ھ لکھتے ہیں۔

رنگین نے اردو شاعری میں بہت سے کارنامے چھوڑے ان کا نمایاں کارنامہ "ریختی" ترقی دینا ہے۔ رنگین نے اس فن کو اتنی ترقی دی کہ لوگ انھیں ریختی کا موجب سمجھنے لگے۔

رنگین کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مجالس رنگین (نثر فارسی) جس کو مسعود حسن رضوی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے

۲۔ چار باغ	مطبوعہ دہلی	۱۸۵۲ء
۳۔ ایجاد رنگین	مطبوعہ لکھنؤ	۱۸۴۶ء
۴۔ مظہر العجائب	مطبوعہ لکھنؤ	۱۸۴۲ء
۵۔ رسالہ نادرہ	مطبوعہ فتح گڑھ	۱۸۶۲ء

اس کے علاوہ پروفیسر مسعود حسن نے کئی غیر مطبوعہ مثنیوں اور نظموں کی تفصیل دی ہے[۳] جو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ جن میں سے چند ذیل

۱؎ طبقات الشعراء

۲؎

۳؎ دیباچہ مجالس رنگین صفحہ ۱۶ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

میں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ دیوان ریختہ — پہلا دیوان
۲۔ دیوان بیختہ — دوسرا دیوان
۳۔ دیوان آمیختہ — ہزلیات
۴۔ دیوان انگیختہ — ریختی
۵۔ مجموعہ رنگین — سات زبانوں میں قصائد و غزلیات کا مجموعہ
۶۔ امتحان رنگین
۷۔ اخبار رنگین — چشم دید واقعات منظوم کر دیے گئے۔
۸۔ شہر آشوب
۹۔ کہاوت ہائے رنگین
۱۰۔ حکایات رنگین
۱۱۔ گلدستہ رنگین
۱۲۔ نصاب رنگین
۱۳۔ داستان رنگین سرگذشت آغا عزیز سوداگر گجرات
۱۴۔ فرس نامہ رنگین۔
۱۵۔ بہار چمن رنگین وغیرہ۔

پروفیسر عبد القادر سروری کی ایک بیاض کے نوٹ سے ان کی ایک اور تصنیف "محاورات بیگمات"[۱] کا بھی پتہ چلا ہے۔ جس کا ایک مخطوط رامپور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس میں اردو محاوروں کی تفہیم اردو میں کی گئی ہے اس کے متعلق مولانا امتیاز علی علی عرش کا خیال ہے کہ یہ سراج الدین علی خاں آرزو کی تصنیف ہے۔ اور "نوادر" کے

---

[۱] ملاحظہ ہو فہرست مخطوط صفحہ ۱۹۳

نسخہ کا حصہ ہے[1]۔ لیکن پروفیسر عبداللہ جنہوں نے نوادرالالفاظ کو مع حاشیہ کے چھاپا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"مجھے محاورات بیگمات کا ایک مجموعہ ملا جو مولانا (امتیاز علی عرشی) کے نزدیک آرزو کا معلوم ہوتا ہے بلکہ ان کے بقول نوادر کے ایک نسخے کا حصہ ہے جو کتب خانہ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے۔ یہ رنگین کے مرتبہ محاورات سے بہت حد تک مماثل ہے مگر میں نے اس متن کو شامل نہیں کیا کیونکہ انجمن ترقی اردو کے نسخے میں (جو آزاد کی زندگی میں لکھا گیا تھا) یہ محاورات موجود نہیں"[2]

اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے خواتین کے روزمرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ رنگین کو ریختی میں بیگمات کی زبان اختیار کرنی پڑتی تھی۔ اس لیے وہ بیگمات کی زبان سے بڑی واقفیت رکھتے تھے۔

انشاء رنگین کے معاصرین شعرا میں انشاء خاص اہمیت رکھتے ہیں یہ شاہان دہلی کے طبیب۔ ماشاء اللہ خاں کے فرزند تھے۔ ماشاء اللہ خاں ایرانی نژاد تھے جو احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد مرشد آباد چلے گئے تھے۔ انشاء اللہ خاں وہیں پیدا ہوئے سن شعور کو پہنچنے کے بعد وہ پھر دلی آئے اور شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے ان دنوں لکھنؤ میں علما شعرا کی بڑی سرپرستی ہو رہی تھی چنانچہ کچھ تو اس کے اثر سے اور کچھ شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار میں رہے۔ بعد میں سعادت علی خاں کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ سعادت علی خاں کی مصاحبت میں انشاء کے کچھ دن بہت اچھے گذرے اس سے پہلے بھی شاہ عالم بادشاہ

---

[1] "نوادرالالفاظ" مطبوعہ رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۵

[2] " نوادرالالفاظ" " " " "

Hanif Razvi

اور شہزادہ سلیمان شکوہ کے درباروں میں بھی انھیں چین میسر آیا تھا۔ ان کی تصانیف اسی زمانے کے ہیں۔ لیکن انشار کی عمر کا آخری زمانہ بڑی تکلیفوں میں گذرا ذراسی بات پر سعادت علی خاں ان سے کبیدہ خاطر ہو گئے آخر ۱۲۲۵ھ میں دربار سے نکلنا پڑا۔ تنخواہ بھی بند ہو گئی بعد میں گو تنخواہ جاری ہوئی تاہم آزادی سلب کر لی گئی اس تکلیف کی حالت میں ۱۲۳۳ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اس میں شک نہیں متاخرین شعرا میں انشار نے اردو نثر پر بڑی توجہ کی۔ ان کا زمانہ وہ تھا جب کہ نثر بھی اظہار خیال کے ادبی سانچوں کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ چنانچہ اکثر شاعروں نے شعر کے بجائے نثر کو اپنے خیالات کا ذریعہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا ثبوت متاخر دور کے سب سے بڑے شاعر غالب کے مکتوبات سے ملتا ہے جو جدید ادبی نثر کے سنگ میل سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ غالب نے اردو مکتوب نویسی ۱۸۵۰ء کے بعد شروع کی اس لیے اس مقالہ میں ان کے مکتوبات سے بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔

انشار ایک جدت پسند شاعر ہی کی حیثیت سے اردو ادبی تاریخ میں اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اردو نثر اور سب سے بڑھ کر اردو زبان کے بعض پہلوؤں کے مطالعہ کے سلسلے میں ان کی دریائے لطافت ادبیات میں شمار کی جا سکتی ہے۔ "دریائے لطافت کا آخری حصہ جو قتیل سے منسوب ہے ایک روایتی چیز ہے۔ لیکن قواعد زبان کا وہ حصہ جس میں اردو حروف اصوات سے بحث کی گئی ہے وہ انشار کے زمانے کے لئے ایک غیر معمولی چیز ہے۔ اس میں شک نہیں اردو حروف یا اصوات سے متعلق انشار کے بعض نظریے ہماری موجودہ لسانی معلومات کے لحاظ سے ناقابل قبول ہوتے ہیں لیکن اس میں انشار کا قصور نہیں۔ ان کے زمانے کا قصور ہے۔ انشار کے یورپی

لہ ملاحظہ ہو مضمون پروفیسر عبدالقادر سروری کلاسیفکیشن آف اردو ساونڈس آل انڈیا اورنیٹل کانفرنس ناگپور۔

معاصرین جیسے   وغیرہ کے لسانی نظریوں   بھی جدید دور کے علما اس طرح مضحکہ خیز سمجھتے ہیں۔ اصل چیز جو انشاء کی کوششوں میں دیکھنے کی ہے وہ ان کا تجزیہ پسند ذہن اور فکر کی اپج ہے۔ فکر کی اپج کے لحاظ سے ان کی شاعری کسی اور شاعر سے پیچھے نہیں ہے۔

انشاء نے حسب ذیل تصانیف چھوڑی ہیں۔

۱۔ دریائے لطافت

۲۔ داستان رانی کیتکی و کنور اودے بھان

۳۔ سلک گوہر

۴۔ لطائف السعادت

۵۔ روزنامچہ ترکی

۶۔ دیوان شعر

دریائے لطافت

چند طبقوں کی بولیوں کے علاوہ بلاغت کے اصول پر مشتمل یہ کارنامہ انشاء کا یادگار کارنامہ ہے۔ مسائل اور موضوع اردو زبان کے متعلق ہے تذکروں میں بتایا گیا ہے کہ انشاء اللہ خاں نے یہ کتاب اپنے دوست قتیل کے ساتھ مل کر لکھی تھی۔ اس کا دوسرا حصہ جو متعلق معانی اور عروض پر ہے قتیل کا ہے۔ زبان کے قواعد سے متعلق پہلا حصہ انشاء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں۔

> کتاب کی جان پہلا حصہ ہی ہے اگرچہ اس سے قبل یعنی اہل یورپ نے متعدد کتابیں اردو قواعد پر لکھیں تھیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہماری اہل زبان نے اردو صرف و نحو پر لکھی ہے۔ اور حق

---

[1] دیباچہ دریائے لطافت مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

Hanif Razvi

یہ ہے کہ عجب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان کے قواعد
قواعد محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی
مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی"۔

اس میں انشاء نے اردو زبان اور اس کے مسائل کو بڑی کد و کاوش سے لکھا ہے۔ اردو زبان کے بارے میں انشار کا دہلی کو معیار قرار دینا ان کے لئے ایک فطری بات تھی تاہم انھوں نے اپنی رایوں کو حتی الامکان احتیاط سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں فصاحت اہل دلی کا حصہ ہے۔ لیکن ہر دہلی والا اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا بلکہ ایسا دعویٰ صرف چند مخصوص لوگوں کو زیب دیکھتا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں ہر محلے میں ایک نہ ایک فصیح موجود ہے۔

فصیح کی تعریف انھوں نے اس طرح کی ہے۔

۱۔ جو تنافر کلمات اور تعقید سے پاک ہو آگے چل کر تنافر کلمات کی توضیح کرتے ہیں۔ تنافر کلمات۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ لانا کہ متکلم اس کے بیان میں خطا کرے یا دوسرے کلام کی طرح جلدی سے تمام نہ کر سکے۔

زبان دانی کے چار شرطیں یہ ہیں۔

۱۔ اس شخص کے والدین دارالخلافہ کی خاک پاک سے ہوں۔

۲۔ اردو دانوں کی صحبت اٹھائی ہو۔

۳۔ اُردو کی تحصیل و تحقیق میں اس کا شغف۔

۴۔ تیز ذہن اور طبع وقار۔

لسانی قوت کا ثبوت "زرگری" وغیرہ مصنوعی بولیوں سے ہوتا ہے۔ یہ "ب" کی بات یا "ف" کی بات کہلاتی ہے۔ جن میں تمام الفاظ میں "ف" آتا ہے

تیسرے باب میں عماد الملک۔ بہار ال۔ صدر الدین صفاہانی۔ اور ملا عبد الفرقان کی بحثیں ہیں وہ بڑے دلچسپ انداز میں شعرا پر تنقیدیں کرتے ہیں

Hanif Razvi

اور اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑتے

بی نورن اور میر کی گفتگو سنئے

" اجی او میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے دلی میں آتے تھے دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمہیں کیا ہوگیا کہ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہیں آٹھویں میں بھی نہ چلو تمہیں علی کی قسم۔

شعراء پر تنقید

اجی بی نورن یہ کیا بات فرماتی ہو تم تو اپنے جوڑے کی چین ہو۔ کیا کہیں جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھے ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے۔ ان پر ترجمہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو۔ اور میاں ناجی اور میاں حاتم پھر سب سے بہتر مرزا رفیع سودا اور میر تقی صاحب اور پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب نور اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی استاد تھے۔ وہ لوگ تو سب مر گئے اور انکی قدردانی کرنے والے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں۔ اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے۔ تخم تاثیر صحبت کا اثر سبحان اللہ یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر پوچھو تو تمہارا خانماں کس دن شعر کہتا تھا۔ اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے۔ اور دوسرے میاں مصحفی کو مطلق شعر نہیں رکھتے۔ اگر پوچھے ضرب زید عمرو کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو ذرا اپنے شاگردوں کے ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھ کر اپنا عرق بادیان

اور شربت انار ہیں چھوڑ کر شاعری میں آگے قدم رکھا ہے۔ اور میر انشاء اللہ خاں میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے آگے پری زاد تھے ہم ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے۔ اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں مرزا مظہر جان جاناں کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ایک اور کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے اس مثنوی کا نام دل پذیر رکھا ہے۔

داستان رانی کیتکی و کنور اودے بھان

انشاء کی لکھی ہوئی یہ کہانی نہ صرف ان کی جدت طبع کا نتیجہ ہے بلکہ ایک حیثیت سے ٹھیٹ ہندوستانی کے معیار قائم کرنے ایک نادر کوشش ہے۔ انشاء اللہ خاں کی یہ کہانی ان کی طبیعت کی اپج معلوم ہوتی ہے۔ اس کہانی کی زبان اور اس کا اسلوب بیان یہ سچ ہے کہ اس زمانے کے عام تحریروں سے مختلف ہے۔ لیکن وہ بول چال کی زبان سے بہت قریب ہے اس میں شک نہیں کہانی میں مافوق الفطرت عناصر آجانے سے وہ فطری کہانی نہیں رہی لیکن انشاء کو اپنے زمانے کے مذاق کی رعایت منظور تھی۔ اس زمانے کے داستان گو داستان کو دلچسپ بنانے ایک ایسی دنیا کی تصویر کھینچتے تھے جو اس مادی دنیا سے پرے ہوتی جو انسانوں کی تھکی ہوئی روح کو دنیا کے مصائب اور ہنگاموں سے نجات دلاکر اطمینان اور تسکین کی دنیا میں یعنی تخیل کی ایسی بہشت میں لے جاتی جہاں روح مادہ اور عناصر کی آسودگیوں کو دھوکر واپس آتی۔

انشاء کی اس کہانی کا کمال یہ ہے کہ عرب و عجم خطا و ختن کے بجائے اس کا ماحول ہندوستانی ہے جہاں جوتش پنڈت تمنتوں کا حال بتاتے ہیں۔ سوئمبر رچائے جاتے ہیں۔ لڑکیاں امرائیوں میں جھولتی ہیں۔ یہ ایک عشقیہ داستان جس کا ہیرو جب

Hanif Razvi

معمول ایک شہزادہ ہے وہ کیتکی کو جھولتے دیکھتا ہے اور اسی وقت سے اسکی محبت کا دم بھرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی شیفتگی کا حال جان کر والدین کیتکی سے اس کا بیاہ کر دینا چاہتے ہیں لیکن کیتکی کے والدین بیاہ پر رضا مند نہیں ہوتے۔ آخر مافوق الفطرت چیزوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یعنی ایک جوگی شہزادے کو ہرن کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح اور بھی مشکلات ہوتی ہیں بالآخر کیتکی اور اودے بھان مل جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں اس میں تخیل اتنا بے نظیر نہیں جتنا اس سے ماقبل کی بعض داستانوں میں ملتا ہے۔ پھر اس کے اختیار اور مصنف کے التزام کو پیش نظر رکھتے ہوئے قصے کی اہمیت گھٹنے نہیں پاتی

چونکہ یہ داستان چھپ چکی ہے اس لیے یہاں اس کا اقتباس نہیں دیا گیا

سلکِ گوہر یہ انشا کی دوسری کہانی ہے جس میں انھوں نے بے نقطہ حروف کے استعمال کا التزام کیا ہے۔ رانی کیتکی کی داستان میں انھیں طبیعت کے جوہر دکھانے کی پھر بھی گنجائش تھی لیکن اس "لزوم ما لا یلزم" نے ان کے قلم کے ساتھ ان کی تخیل کو بھی جکڑ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ بے مزہ کہانی ہے اردو کے حروف تہجی میں صرف بارہ یا پندرہ حرف ایسے ہیں جن کو نقطے نہیں ہوتے ان حروف کے اندر کہانی لکھنے کی کوشش انشا کی جدت طرازی کے حد سے بڑھی خواہش کی آئینہ دار ہے اس کہانی کو جناب امتیاز علی خاں عرشی نے ۱۹۴۷ء میں کتب خانہ رامپور کے مخطوطے کی مدد سے مرتب کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ کہانی بالکل معمولی ہے ملکہ گوہر آرا "ملک روس" کے عشق کا افسانہ ہے۔ قصہ میں بے مزگی بھی ہے اور ابتذال بھی۔ زبان میں لفظوں کے انتخاب میں دقت کی وجہ سے انہیں عجیب عجیب نامانوس لفظ تلاش کرنے پڑے اور بھونڈی ترکیبیں تراشنی پڑی ہیں جس کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے۔

Hanif Razvi

اور واہ واہ وہ کلام لالا سد اسکھ کا کہ کھر اس سا دوسرا
کم ہو گا محو کاسہ مدام ہو کر اس طرح کہ درا درا درا داگ کا
سرا۔ در در در دور کر در در در درکس کا در اس امراد
کا کہ ماہ آسا سادہ رو ہوُ اور وہ ملمع کلمہ کہ ماء الورد اور
در دار و ملاؤ کر کر در کلوم دہ ۔ او مردک الور گلو حمار صحرا
گدھا گلو مگو"

پھر بھی یہ کتاب اردو کے بڑے شاعر کی "ذہنی سعی" کے طور پر اردو
ادب میں یادگار رہے گا۔

اس میں شادی کے موقع پر بارات کی بڑی اچھی تفصیل دی ہے باراتیوں
میں مختلف طبقات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اس میں پنجابی۔ عربی۔ فارسی اور
اور ترکی کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔

روز نامچہ ترکی انشاء کے روز نامچہ ترکی کا تذکرہ جناب امتیاز علی عرشی نے
"سلک گوہر" کے دیباچے میں کیا ہے اس میں ۱۲۲۳ھ کے
ایک ماہ کے حالات بیان کیے گیے ہیں یہ روز نامچہ ترکی زبان میں ہے لیکن کہیں
کہیں اردو عبارتیں اور فقرے ملتے ہیں۔

لطائف السعادات اس کتاب میں انشاء نے نواب سعادت علی خان کے لطیفوں
کو "لطائف السعادت" کے نام سے جمع کیا ہے۔ اس کتاب
کے صرف ایک نسخہ[1] کا پتہ چلا ہے جو بقول قاضی عبدالودود برٹش میوزیم لنڈن[2] میں
ہے۔ یہ لطیفے فارسی میں ہیں لیکن سعادت علی خاں سے منسوب کردہ اکثر جملے اردو
میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ جیسے:-

---

[1] فہرست مخطوطات فارسی صفحہ نمبر ۹۶۱

[2] مضمون لطائف السعادت مصنفہ انشاء مطبوعہ معاصر (۴) صفحہ ۱۶۴

می خواستم کہ امام باغ بگویم حسب اتفاق "امام باپ" از زبانغ برآمد خیلے لبتم فرمودند معروض داشتم کہ کمال انفعال عارض حال شد ارشاد فرمودند" تم پیغمبر زادے ہو" امام باپ تمہاری زبان سے نکلا تو کیا ہوا مضائقہ"

ایک بیٹے کا حال لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

ارشاد شد کہ میر انشاء اللہ خاں شما پیشتر نشنید کہ الحال از معونت غیبی جائے بہ فراغت چنانکہ می خواستم حاصل شد...

زبان اردو چنیں فرمودند

"حسین علی اس وقت ایسے نکل گیا جیسے پتھری نکل جاتی ہے"

اس کتاب میں ۵۲ لطیفے ہیں اور لطیفے میں اکثر اُردو جملے ملتے ہیں۔

مرزا جان طپش مرزا جان نے "اُردو محاورات" کے نام سے ایک لغت تصنیف کی تھی جو اس موضوع پر اردو کی اوّلیں تصانیف میں سے ہے اس میں اردو محاوروں کی شرح فارسی میں کی گئی ہے اور سند میں اردو اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا تخلص اکثر تذکروں میں "طپش" لکھا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی جنھوں نے "اُردو محاورات" کی تصحیح کی ہے ان کا تخلص "طپش" ہی لکھتے ہیں لیکن محمد یحیی تنہا مصنف سیر المصنفین نے طپش تبایا ہے۔

مرزا جان کا پورا نام مرزا محمد اسمٰعیل تھا لیکن مرزا جاں کے لقب سے مشہور تھے۔ آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ بعد میں ہندوستان آگئے تھے۔ مرزا جان کے والد کا نام یوسف بیگ تھا مرزا جان دہلی ۱۱۸۲ھ میں پیدا ہوئے عربی اور فارسی کی تحصیل بڑی محنت سے کی۔ شاعری کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ خواجہ میر درد کو وہ اپنی غزلیں دکھانے لگے۔ لیکن منشی کریم الدین "طبقات الشعراء" میں لکھتے ہیں طپش پہلے مرزا محمد یار بیگ سائل کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی تباہی

کے بعد وہاں سے چل کر کچھ دنوں لکھنؤ میں رہے لکھنؤ سے بنگالہ چلے گئے اور ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ سید احمد علی خاں کے دربار سے توسل ہو گیا۔ ان ہی کے حکم سے لغت "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" لکھی "شمس البیان" نام نواب ہی کے خطاب کی مناسبت رکھا تھا۔ یہ لغت ۱۷۹۳ء م ۱۲۰۷ھ میں مرتب ہوئی[۱] کچھ دن بعد ان کا کلیات بھی کالج کی طرف سے شائع ہوا۔ ۱۸۱۳ء تک کلکتہ میں مقیم تھے۔ ۱۲۲۹ھ میں وفات پائی۔ راقم کی استدعا پر جناب عندلیب شادانی صدر شعبہ اردو فارسی نے لغت کے متعلق مواد بھیجا ہے۔ سرورق کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لغت ۱۲۶۵ھ میں مرشد آباد میں طبع ہوئی۔ خاتمہ پر ۱۲۶۶ھ درج ہے۔ لیکن دیباچہ کے اقتباس سے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے پتہ چلتا ہے کہ سنہ تالیف ۱۲۰۷ھ ہے

"در سنہ یک ہزار و دو صد و ہفت از ہجرت نبوی صلعم در شہر محرم الحرام بتاریخ بست دویم در بلدہ مرشد آباد بہ اہتمام رسید"

راقم الحروف کو ڈاکٹر شادانی کی مہربانی سے "شمس البیان" کے بارے میں حسب ذیل معلومات فراہم ہو سکی ہیں۔

طپش نے محرم ۱۲۰۷ھ میں شمس البیان مکمل کر لی تھی مگر بعد کے دو سال تک اس میں وہ اضافے کرتے رہے۔ چنانچہ ذی الحجہ ۱۲۰۹ھ جو ایڈیشن تیار ہوا اور جس کا غالباً صرف ایک ہی نسخہ دنیا میں موجود ہے اور ڈاکٹر شادانی کا خیال ہے کہ ان کا مملوکہ نسخہ وہی ہے اس میں کل ۱۳۰۴ لفظ ہیں مطبوعہ نسخے میں جو پہلے ایڈیشن کی نقل ہے صرف ۱۲۹۰ لفظ ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے قلمی نسخوں میں بھی ۱۲۹۱ الفاظ ہیں۔

۱۔ ارباب نثر اردو صفحہ ۱۸۴

Hanif Razvi

اس لغت کی تکمیل کے بعد مرزا جان طپش فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے حلقۂ ملازمت میں داخل ہوئے وہیں ایک مثنوی میر حسن کی تقلید میں لکھی اور بہار دانش نام رکھا۔ ان کا دیوان بھی کالج کی طرف سے شایع ہوا۔ گارسان ڈی تاسی نے ان کی ایک کتاب "گلزار مضامین" کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو ۱۱۹۹ء میں طبع ہوئی۔ جس کے متعلق ڈی۔ تاسی لکھتا ہے۔

"طپش کی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے تاہم اس میں تذکرہ کسی بھی صورت ہے کیونکہ دیباچے میں مصنف نے اردو شاعری اور شاعروں سے بحث کی ہے[1]۔"

ذیل میں شمس البیان کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس سے طپش کی زبان اور اسلوب بیان پر روشنی پڑتی ہے طپش نے محاوروں کی سند اشعار سے پیش کی ہے۔

"انگاروں پر لوٹنا۔ کنایہ از بیقراری کہ دو عالم رشک لاحق گردد ولی دکھنی گوید۔

شعلۂ خوجب سے نظر آتا نہیں
تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولی

رفو جگر میں آنا۔ حیران ماندن بہ مشاہدہ امر عجیب و عوام بازاری استعمال کنندہ سراج الدین سراج دکھنی گوید:

رفو گر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے
اگر دیکھے میرا سینہ رفو جگر میں آجائے[2]

مولوی سید محمد صاحب نے ارباب نثر اردو میں مرزا جان طپش کے تفصیلی

---

[1] ارباب نثر اردو صفحہ ۱۹۰ [2] ارباب نثر اردو صفحہ ۱۹۵

حالات لکھے ہیں اس میں انھوں نے طپش کی ایک اور مثنوی یوسف زلیخا کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن خود ان کو بھی یقین نہیں کہ یہ طپش ہی کی مثنوی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ہم تحقیق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ طپش کے یہ قصے بھی نظم کیا ہے[1]

تبصرہ یہ دور دسویں صدی ہجری کے ختم سے شروع ہوتا ہے اس عرصہ میں اردو نظم و نثر کافی نشو و نما پا چکی تھی۔ لیکن اس نشو و نما کے ساتھ اس پر فارسی کا اثر بھی گہرا پڑنے لگا تھا۔ جہاں شاعری میں تمام تر فارسی بحریں آ گئی تھیں وہیں نثر میں بھی فارسی اسلوب فارسی اضافت اور ترکیبوں کی زیادتی ہونے لگی تھی۔ اس طرح نشو و نما پائی ہوئی شکل میں قطع نظر چند امور کے اکثر ہندی لفظوں کے ترک کرنے اور جملوں کی ساخت کا نیا پیرایہ اختیار کرنے کی وجہ سے وہ قدیم ترادوار کی نثر سے کچھ الگ کچھ نکھری ہوئی اور جدید دور کی نثر سے بہت قریب ہوئی تھی۔ نظم میں ایرانی قالب کے ساتھ ساتھ نثر میں بیان اور حسنِ بیان کے سارے تصرفات میں وہ فارسی کی پوری تقلید کرنے لگی تھی اتنا کہ جب قدیم اردو کی چھان بین کے سلسلے میں دکھنی ادب کے احیاء کی کوشش کی گئی تو اس دور کے ایک مشہور انشاء پرداز نیاز فتح پوری نے نہایت لاپرواہی سے لکھ دیا تھا کہ

دکھنی سے اردو کا ڈانڈا ملانا اور یہ کہنا کہ اردو دکھنی کی ترقی یافتہ شکل ہے ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت آدم کے سلسلے کو ڈارون کی تحقیق سے ملانا۔

انشاء پرداز کا یہ اشتباہ اس زمانے تک ہماری ساری لسانی معلومات

---

[1] ارباب نثر اردو صفحہ ۱۹۵

کافی مواد اور تحقیقی نتائج کی عدم موجودگی میں بہت کچھ اچنبے کی بات نہیں نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن حال کے محققین اردو جیسے ڈاکٹر عبدالحق۔ پروفیسر شیرانی۔ ڈاکٹر زور۔ پروفیسر سروری کی تحقیقات اور ماہرین لسانیات جیسے گریرسن۔ سنیتی کمار چیٹرجی کے مطالعہ کے نتیجوں کی اشاعت کے بعد اس طرح کے اشتباہ کی گنجائش نہیں رہی۔ اس سے پہلے کے بھی اکثر صاحب رائے بزرگوں۔ میر۔ ڈی۔ تاس وغیرہ نے قدیم اردو کے روپ اور موجودہ اردو کو دو علیحدہ زبانیں کبھی نہیں سمجھا۔ شمالی ہند کی نثر میں عربی فارسی الفاظ اور تراکیب کی بہتات اور ترویج کی کثرت میں مرزا مظہر جان جاناں۔ حاتم کی تحریک اصلاح زبان کا بھی بہت حصہ رہا ہے۔ جس کا مقصد یہی تھا کہ زبان اردو سے ہندی الفاظ اور ترکیبیں خارج کی جائیں۔ ان کے بجائے عربی فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ہو۔ انھوں نے "لچر" سی زبان دکھنی کو اردوے معلیٰ (قلعہ کی شائستہ زبان) بنانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں فطرتاً فارسی نظم و نثر کے شاہکاروں کو اپنا مطمع نظر بنایا۔

نتیجتاً اردو نثر کا نشو و نما اس شکل میں ہوتا تھا جس روپ میں ہم اسے اس دور میں دیکھتے ہیں! اس کی بہتر مثال ولی اورنگ آبادی کے دو ادوار کے کلام کے تفاوت میں ملتے ہیں۔ جن کا سفر دلی سے قبل اور بعد کا رنگ شاعری بالکل جداگانہ تھا۔

(۱۱)

نثر کی توسیع

بارہویں صدی میں نثر کی وسعت۔ مذہبی کتابوں کی نوعیت (۱) تراجم قرآن شاہ رفیع الدین کا ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن (۲) فقہ "سراج الایمان" تقسیم میراث۔ احوال میت ترجمہ کیدانی (۳) حدیث۔ انوار محمدی۔ ترجمہ زواجر۔ مجموعۃ المسائل تصوف۔ مجمع العطایا۔ کتابوں کی جنگ۔ رسالہ بدرالدجیٰ قواعد زبان کے سلسلے میں یورپین مصنفین کے کارنامے۔ یورپ اور ہند کے تعلقات۔ پہلا یورپی مصنف جان جوشوا کیٹیلر۔ چمبرلین۔ ڈیوڈ بل بشلز۔ جوہان فریڈ رشن فرٹز کیسانو بیل گٹی۔ فرگوسن۔ ایوارس ایبل۔ ہندوستانی حروف تہجی۔ مصنف نامعلوم لے بے ڈف ہیڈلے۔ جان کرسٹوف اڈی ننگ سالہ قواعد ہندی مصنف نامعلوم۔ ریختہ ہندی کے صرف و نحو۔ انشاء کا آغاز۔ انشاء کی تعریف۔ انشا کے بارے میں سلیمان ندوی گارسان ڈی تاس کی آرا۔ "دستور النثر" "دستور الہدایت" "فن انشاء" تاریخ:۔ ترجمہ تاریخ فیروز شاہی۔ تاریخ ہندوستان

بہادر نامہ ببیر۔ اس دور کی مشہور ہستی باقر آگاہ۔ حالات زندگی تصانیف منظوم تصانیف کے نثری دیباچے۔ دیباچہ مراۃ الجنان۔ دیباچہ دیوان۔ دیباچہ ہشت بہشت۔ دیباچہ فوایدِ درفوایدِ۔ دیباچہ گلزارِ عشق۔ دیباچہ تحفۂ احباب آگاہ کی مکمل تصنیف نثر "ریاض السیر" بدر الدولہ کی تصنیف نثر الجواہر۔ بدر الدولہ کے حالات زندگی۔ تصانیف قصص ملکۂ روم و فقہیہ قصہ دلالہ مختالہ اس دور کا خاتمہ۔

Hanif Razvi

نثر کی توسیع

بارہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) کا آغاز اردو نثر میں توسیعی مساعی کے آغاز کا زمانہ ہے۔ یہ اردو میں تجربی علوم اور سائنس پر تصنیف وتالیف کے آغاز کا زمانہ بھی ہے جس میں اردو کے انشاپرداز تصور اور نصب العین کی رنگین دنیا سے ہٹ کر حقیقی ماحول کو ٹٹولنے کی طرف مائل ہوئے۔ اور ان کی نظریں عالم بالا سے نیچے اتر کر عالم آب وگل میں بھی دلچسپیوں کے موضوع تلاش کرنے لگیں۔ اس طرح ستاروں کی گذرگاہوں کو ڈھونڈنے والی نگاہیں اب زمین کی طرف مرکوز ہوگئیں اور عالم جو اب تک محض "خواب وخیال" "مایا" اور "جنجال" تھا رفتہ رفتہ ٹھوس خدوخال اختیار کرنے لگا جن کی سختی نرمی اور حسن وقبح کا اردو انشاپردازوں کو بھی اندازہ ہونے لگا۔ اس احساس سے انہیں چیزوں کی حقیقت اور ماہیت کی تلاش ہوئی۔ اس زمانے میں اردو زبان کے علمی مطالعہ اور زبان کی قواعد کے مطالعہ کا بھی آغاز ہوا۔

گذری ہوئی صدیوں میں اردو نثر کا موضوع مذہب یا دل بہلائی کی داستان تک ہی محدود تھا۔ لیکن اب مذہب اور قصص کے علاوہ تاریخ سیر سائنس اور انشاء کی طرف بھی توجہ ہوئی۔

نثر پر گو مذہب کا تسلط برقرار رہا لیکن اب اس کی نوعیت بدلنے لگی۔ اور مذہب کا مطالعہ فلسفیانہ بنیادوں پر کرنے کے رجحان کا آغاز ہوا ساتھ ہی قرآن کی علمی تعلیم پر بھی توجہ مرکوز ہوئی۔

اردو نثر کے اطراف سے تصوف کا حصار ڈھایا جانے لگا۔ اور اس کی بجائے مذہب کے علمی پہلو فقہ حدیث تفسیر وغیرہ کو اہمیت حاصل ہونے لگی یہ صحیح ہے کہ اس دور میں بھی مذہبی تصانیف کافی تعداد میں ملتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے۔ ان کی نوعیت مختلف ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں مذہب کو سائنس اور فلسفہ کی روشنی میں جانچنے کی مساعی جن بزرگوں نے کی ان میں سرسید اور ان کے رفقا محسن الملک اعظم یار جنگ شبلی نذیر احمد وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان بزرگوں کی کوشش دراصل جدید عہد کے تقاضوں کا نتیجہ تھیں۔ لیکن ان سے پیشتر شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر وغیرہ کے کارنامے بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے جو مذہب کو اس کے اصلی روپ میں عوام سے روشناس کرانے اور خود ان کی قوت فیصلہ کو اکسا کر انہیں اپنا صحیح راستہ تلاش کر سکنے کے قابل بنانے کے مقصد سے لکھے گئے تھے۔

شاہ رفیع الدین شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے فرزند تھے۔ شاہ ولی اللہ اپنی بے مثل فارسی تصنیف حجۃ البالغہ کی وجہ سے عالم اسلام میں ممتاز درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی عظمت اور تبحر کے اکثر بزرگ معترف ہیں۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی جو خود بھی اسلامیات کے ایک بہت بڑے عالم ہیں شاہ ولی اللہ کی مذہبی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"آخیر زمانہ میں جب کہ اسلام کا نفس باز پسین تھا۔ شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی۔ رازی۔ ابن رشد کے کارنامے سے بھی ماند پڑ گئے"

شاہ رفیع الدین شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند تھے۔ ولی اللہ کے دوسرے دو صاحبزادے شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز بھی بڑے بلند پایہ

عالم ہوئے ہیں۔

شاہ رفیع الدین اور ان کے بھائی شاہ عبدالقادر نے علی الترتیب ۱۲۰۰ھ اور ۱۲۰۵ھ میں قرآن کا اردو ترجمہ مکمل کیا۔ عربی اور خاص طور پر قرآن مجید جیسی بلند پایہ کتاب کی ادبی عربی کا ترجمہ کوئی آسان کام نہ تھا لیکن شاہ رفیع الدین نے اس نوخیز زبان کو قرآنی مطلب کا جس طرح حامل بنایا ہے وہ اس دور کا قابل قدر کارنامہ ہے۔

شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کے پانچ ہی سال بعد ۱۲۰۵ھ میں ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا اور اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی اس کام کو نہایت اہتمام سے مکمل کر سکے۔ تاہم دونوں بھائیوں کے ترجمے میں تھوڑا فرق ہے۔ شاہ رفیع الدین تحت اللفظ ترجمہ کرتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر معنی و مطلب پر زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ یہاں دونوں کے ترجموں کے اقتباس دیے جاتے ہیں جس سے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق بخوبی ہو سکے گی۔ دونوں ترجموں کا اقتباس سورۂ انعام سے پیش کیا جا رہا ہے جس سے دونوں کے انداز بیان پر روشنی پڑ سکیگی۔

شاہ رفیع الدین کا ترجمہ حسب ذیل ہے

"اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے بیان کرتے تھے اوپر تمہارے نشانیاں میری اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن تمہارے کی سے۔ کہا انھوں نے گواہی دی ہم نے اوپر جانوں اپنی کے۔ اور فریب دیا ان کو زندگانی دنیا کی نے۔ اور گواہی دی انھوں نے اوپر جانوں اپنی کے یہ کہ وہ تھے کافر"

شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کا اقتباس یہ ہے

"اے جماعت جنوں اور انسانوں کی کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول
تمہارے اندر کے سناتے تم کو میرے حکم اور ڈراتے اس دن
کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے اپنے گناہ اور ان کو بہکایا دنیا
کی زندگانی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر"

ان ترجموں پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے نہ صرف قرآن کے مطالب و معانی کا زیادہ خیال رکھا بلکہ اردو زبان کے مخصوص نہج اور خصوصیات کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا۔ اس لیے ان کا ترجمہ زیادہ سلیس ہے۔"

فقہ قرآن کے مذکورہ بالا ترجموں کے بعد حدیث اور تفسیر کے کئی کارنامے بھی ملتے ہیں۔ فقہ میں احمد بن محمد مغربی کی تصنیف "سراج الایمان" محمد ناصر خاں کی "تقسیم المیراث" شرف الدولہ کی "فقہ کیدانی" اور دو مزید کتابوں "مجموعہ المسائل" "احوال میت" کے مخطوطے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہوتے ہیں

سراج الایمان اسلامی عقاید اور فقہ کے مسائل پر ایک رسالہ ہے یہ ۱۲۰۱ھ کی تصنیف ہے اس کے مخطوطے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ دونوں میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی مرتبہ فہرست میں اس مخطوطے کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ نسخہ مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔[1] کتب خانہ آصفیہ کا مخطوطہ ۱۲۴۱ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس رسالہ کا مصنف احمد بن محمد مغربی ہے۔ مصنف کے کچھ حالات معلوم نہ ہوسکے۔ کتاب کے دیباچے میں مصنف نے سبب تالیف پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

بغیر سمجھے احکام عقایدکے ایمان آدمی کا درست نہیں ہوتا[2]

---

[1] فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ (۴۰)

[2] مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ فن مذاہب صفحہ (۲۲۹)

یہ رسالہ سادہ زبان میں لکھا گیا ہے اور تصنع یا تکلف اثر اس کی زبان پر نہیں ملتا۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

بعد مدت کے حکم ہوگا کہ حساب آدمیوں کی نیکی اور بدی کا دیکھیں
مسلمانوں کو خدائے تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آسان کریگا۔ اور
کافروں کو مشکل۔ اور گرفتاری ہوئیگی۔

تقسیم المیراث اس کتاب میں میراث کی تقسیم کے اصول اور فارسی کی مستند کتابوں جیسے "مشکوٰۃ المصابیح" وغیرہ سے اخذ کرکے اردو میں پیش کیے گئے ہیں۔ رسالے کا مصنف محمد ناصر خاں ہے۔ لیکن اس کے حالات کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس رسالے کی زبان پر عربی جملوں کی ساخت کا اثر غالب ہے تاہم یہ رسالہ بھی صاف زبان میں لکھا گیا ہے۔ ذیل میں ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔ جس سے رسالے کی تالیف کے سبب اور اسلوب کا اندازہ ہو سکے گا۔

"پس جان تو اکثر مسائل مذکور شرح مولانا زادہ کے سے اور بعضے
مشکوٰۃ المصابیح سے زبان ہندی میں لکھنے میں آئے ہیں۔ اس
سبب سے کہ مردمانِ اہلِ ہند پر آسان ہویا کرنا ان کا واسطے
آسانی عبارت کے اور تفہیم زبان کے اور واسطے صورت ہر
ایک سہم کے کھینچے گئے ہیں پس تعداد جملہ اشکال کے (۱۸۰) ہے[۱]

اُحوال میت اس رسالہ کے مصنف محمد شمس الدین شمس ہیں جو بیدر کے قاضیوں میں سے تھے۔ یہ فارسی اردو کے اچھے شاعر تھے۔ رسالہ "احوال میت" اردو نثر میں لکھا گیا ہے اس میں تجہیز و تکفین نماز جنازہ اور زیارتِ قبور وغیرہ سے متعلق جملہ مسائل کو آیات و احادیث کی روشنی میں مدلل بیان کیا

---

[۱] مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ فنِ تصوف صفحہ ۳۵۰

Hanif Razvi

گیا ہے اور بدعتوں کی مخالفت کی گئی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ١٢٠٠ھ ہے۔
مصنف خدا کی حمد اس طرح کرتا ہے۔

"شروع کرتا ہوں میں نام سے حق سبحانہ جل شانہ کے پیدا کرنے
والا اور مارنے والا اور جلانے والا مختار اپنے ملک کا ہے
خواہ کسی کا بیٹا چھین لے خواہ کسی کی بیٹی۔ کسی کو حکم میں اس کے
دم مارنے کی طاقت نہیں۔"

تاریخ تصنیف کا پتہ اس سے چلتا ہے۔

"شکر حق سبحانہ جل شانہ کا کہ یہ رسالہ احوال میت کا گیارہویں
تاریخ ماہ مبارک رمضان شریف میں وقت قبل جمعہ کے ١٢٠٠ ہجری
میں تیار ہوا وکرمہ"

اس رسالہ کا ایک مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے[1]

ترجمہ کیدانی فقہ ہی کے بیان میں نوایط خاندان کے مشہور عالم اور آگاہ کے رشتہ دار شرف الدولہ کا بھی نام آتا ہے۔ جنھوں نے "کیدانی" کا ترجمہ اردو نثر میں کیا تھا۔

شرف الدولہ کے حالات زندگی ان کا نام محمد غوث تھا اور آگاہ کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ ١١٦٦ھ میں ارکاٹ میں تولد ہوئے عربی و فارسی کی تعلیم اپنے دادا نظام الدین احمد سے حاصل کی اس کے بعد امین الدین احمد خاں اور عبد العلی فرنگی محل سے فیض حاصل کیا ختم تعلیم کے بعد امیر الامراء والاجاہ کے دربار سے متوسل رہے۔ پھر سدہوٹ ہوتے ہوئے حیدرآباد آئے ١٢١٥ھ میں عظیم الدولہ نے دوبارہ مدراس طلب کیا اور ایک

---

[1] تذکرہ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن جلد اول صفحہ

اہم خدمت مدار المہامی پر مامور کیا۔ نیز۔ شرف الدولہ غالب جنگ اشرف الملک کے خطاب سے سرفراز کیا ۱۲۳۸ھ میں ان کا انتقال ہوا مسجد والا جاہی مدراس میں مدفون ہوئے۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں

"انھوں نے ۳۱ کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں سے تیس عربی و فارسی ہیں ایک اردو"

اردو تصنیف "کیدانی" کا ترجمہ ہے جو حنفی فقہ کے بارے میں ہے۔ اس کا کچھ اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

جہاں تو بیشک بندہ جانچا گیا ہے۔ درمیان اس کے کہ فرماں برداری کرے وہ اللہ برتر کے تئیں بھی ثواب پاوے اور درمیان اس کے کہ نافرمانی اوس کی بھی عذاب کیا وے اور جانچ اللہ کی موقوف ہے ساتھ عمل شرع کے اور ساتھ عمل غیر شرع کے[۱]

اس کا مخطوطہ اور کہیں نہیں ملا۔ مندرجہ بالا اقتباس یورپ میں دکھنی مخطوطات سے منقول ہے۔

حدیث

حدیث کے موضوع پر اس زمانے میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں علی جونپوری کی "انوار محمدی" اور شیخ آدم "ترجمہ زواجر" قابل ذکر کارنامے ہیں۔

انوار محمدی

"انوار محمدی" فن حدیث کی مستند عربی کتاب "شمائل ترمذی" کا اردو نثر میں ترجمہ ہے جو علی جونپوری المشہور بہ کرامت علی نے ۱۲۱۲ھ میں کیا[۲] ترجمہ سے پہلے مصنف نے ایک مختصر سا دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں اس کتاب کے لکھنے کے جو محرکات تھے ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا

۱۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۴۶۸

۲۔ فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ ۳۱

Hanif Razvi

ہے کہ ہندی میں اس قسم کی کتابیں کم تھیں اس لیے اسے شمائل ترمذی کا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ترجمہ اصلی عربی عبارت کے ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ صفحہ کا تین چوتھائی حصہ اصلی عربی عبارت کے لیے وقف ہے۔ اور باقی حصہ میں اس کا اردو ترجمہ لکھا گیا ہے۔ ترجمہ تحت اللفظ ہے۔ ساتھ ساتھ مشکل مقامات پر تشریحی نوٹ بھی لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں بھی مرتب فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ پروفیسر سروری نے یہ لکھا ہے کہ یہ مصنف ہی کے ہاتھ کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ اس کا سنہ ۱۲۱۲ھ ہے جو ذیل کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

"الحمد اللہ کی سنہ بارہ سو باون ہجری نبوی علی صاحب الصلوٰۃ والسلام مہینے شوال تاریخ سولھویں میں اس کتاب کے ترجمہ سے فراغت ہوئی"

"ترجمہ کی نوعیت کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکے گا"

سب تعریف اللہ ہی کو واسطے لائق ہے جس نے ہم سب کو اپنے تمام مخلوقات سے افضل کرنے کے لیے آدمی بنایا۔ اور سب امتوں سے عزت دینے کے لیئے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا کیا اور اس مذہب میں نجات دینے کے لیے مذہب سنت وجماعت کا عطا کیا"

ترجمہ زواجر "ترجمہ زواجر" شہاب الدین احمد متوفی ۹۷۳ھ کی تصنیف "زواجر فی البیان الکبائر" کا ترجمہ ہے جو شیخ آدم نے کیا ہے۔ تمہید میں وہ لکھتے ہیں۔

"شیخ آدم بہ زبان اردو دکھنی ترجمہ نمودہ نام آں ترجمہ آدم فی الحدیث مقرر کرد"

اصل میں شیخ آدم جو اپنے زمانے کے اچھے عالم تھے نواب امیر الملک محمد علی حسین خاں کو "زواجر" کا درس دیا کرتے تھے - ان ہی کی فرمائش پر مصنف نے یہ ترجمہ مکمل کیا - یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے - ذیل میں اس ترجمہ کا اقتباس دیا جاتا ہے :-

"جمیع حمد و ثنا کے تئیں سزاوار ہے جو گناہ زہر کے تئیں توبہ کا زہر مہرہ بخشا ہے اور عصیاں کی کوہ کیتیں عاصی کی عار و حیا کی ٹانکی سیا اور کیا ہے جل جلالہ و عظیم شانہ سب نعمت و درود رسول کے تئیں لائق ہے جو گنہ گار بدکار انسان کے تئیں کمال رحمت و شفقت سیں اپنی شفاعت کے دامن میں چھپا لیا ہے"۔

امیر الملک ارکاٹ کے سربرآوردہ امیروں سے تھے - اس زمانے میں مدراس اور ارکاٹ میں مذہبی علوم کی تصنیف و تالیف پر کافی توجہ کی گئی ہے - چنانچہ گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں صدی کے آغاز میں مدراس متبحر عالموں کا مرکز بن گیا تھا - یہ بات بھی اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مدراس میں فورٹ ولیم کالج سے پہلے تصنیف و تالیف کے لیے قدیم دکھنی زبان استعمال کی جاتی تھی - حالانکہ اس زمانے میں دکن اور خاص طور پر حیدرآباد میں شمالی ہند کی زبان کا کافی اثر پھیل چکا تھا - چنانچہ اس زمانے میں قدیم زبان کی جو تصانیف ہم کو ملتی ہیں وہ زیادہ تر مدراس ہی کے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں - لیکن مدراس کے علما اپنی زبان کو اردو دکھنی اور ہندی تینوں ناموں سے یاد کرتے ہیں - چنانچہ اوپر کے فارسی اقتباس سے یہ ظاہر ہو گا کہ مصنف نے ترجمہ کی زبان کے لیے اردو اور دکھنی دونوں کا استعمال ایک ساتھ کیا ہے -

مجموعۃ المسائل

یہ عبدالمجید ویلوری کی تصنیف ہے جو شیخ محمود کے مرید تھے یہ شیخ محمود غالباً وہی بزرگ ہیں جو شیر دہن کے نام سے

موسوم تھے اور برہان الدین جانم کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ان کا ذکر پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے اس لحاظ سے "مجموعہ المسائل" کی تصنیف کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری کا آخری زمانہ ہوسکتا ہے۔ سنہ تصنیف کہیں درج نہیں ہے۔ کتاب ۲۲ ابواب پر مشتمل ہے جن میں مذہب کے احکام اور مسائل جیسے روزہ نماز وضو غسل تیمم وغیرہ سے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ اس رسالہ کی زبان پر دکھنی کا اثر ہے لیکن جملوں کی ساخت میں عربی کا اثر اسی طرح موجود ہے جو شمالی ہند کے اس زمانے کے کارناموں کی خصوصیت تھی جن کے اقتباسات اوپر لکھے جا چکے ہیں ذیل کے اقتباس سے اس کی زبان اور اسلوب بیان کا اندازہ ہوسکے گا مصنف سبب تصنیف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

جمع کرنا اس کتاب کا سبب فائدہ عوام الناس کا ہے اور یہ کتاب ساتھ عبارت فارسی مختصر تھی مگر مفہوم ہونے جمہور انام کے لیئے مدد سے اللہ تعالیٰ کی موافق سمجھ اپنی بیچ دکھنی کے لایا"۔

اس کتاب کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے[1]

فقہ و حدیث کے علاوہ اس زمانے میں سلوک و معرفت کے مسائل پر بھی کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن۔ اب ان کے اسلوب میں بہت تغیر ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے لگ بھگ سلوک پر جو بھی تصنیف یا تالیف ہوئی اس میں مسائل بیان کرنے کا انداز واضح تر اور زبان نسبتاً صاف ہے۔ اس خصوص میں شاہ میر کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔ شاہ میر کے بعد دوسری قابل ذکر ہستی حسین شاہ ولی ثانی کی ہے جن کی کتاب "مجمع العطایا" خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا نام دو مختلف مقامات پر دو طرح لکھا ہے۔ "مجمع العطایا" اور "مجمع العطار" کا ایک مخطوطہ مرتب

---

[1] مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ فن تعمیر نمبر ۸۳۹

مقالہ کو کتب خانہ روضتین میں دستیاب ہوا ہے مصنف "سیر گلبرگہ" کے بیان کے بموجب حسین شاہ ولی ثانی خواجہ بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے۔ جن سے والی کلیانی نے اپنی دختر بیاہ دی تھی۔ ان سے بہت سے خوارق عادات منسوب ہیں شاہ ولی کا انتقال سنہ ۱۲۶۷ھ میں ہوا اور گولکنڈہ کے قریب دفن کئے گئے۔"

"مجمع العطایا" کے محولہ بالا نسخے کے اختتام پر سنہ ۱۲۱۳ھ درج ہے۔ جو غالباً سنہ کتابت ہے۔ کتاب اس سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اس میں انسان و کائنات کی تخلیق خلقت کی تقسیم وغیرہ پر بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک سائنسی اور فلسفیانہ موضوع ہے لیکن اس رسالہ میں روایت کی نگہداشت نے اس کو بھی افسانے کا رنگ دے دیا ہے اس کتاب میں "شمس العلوم" کا بھی حوالہ دیا گیا ہے

دنیا کی تخلیق کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں،

"روایت ہے کہ پیدائش خلقت کے تئیں اول خدائے تعالیٰ بیچ زمین اور آسمان کے ایک دیو پیدا کیا آتش اور نام اس کا مارجہ تھا۔ جیسا کہ بیچ قرآن مجید کے خدا نے فرمایا ہے۔ یعنی پیدا سے مارجہ سے دیونی ماجینی پیدا کیا اور جب دونوں مل کر جفت ہوئی اس دیونی سے ایک پسر اور ایک دختر پیدا ہوئے نام اس پسر کا جنین اور جنتی دونوں ملکر جفت ہوئے۔ ان سے تین اولاد ہوئی۔ دو پسر ایک دختر نام یک پسر کا عزرائیل اور دوسرے پسر کا اسیر مہادیو اور نام دختر کا گورجا پری بعد ازاں اسیر مہادیو اور گورجا پری ہر دو جفت ہوئے اور شکم گورجا پری سے بارہ پسر اور بارہ دختر پیدا ہوئے نام ان پسروں کا سنو۔ گوسائین۔ نارائین۔ بشن۔ کشن۔ برہمن۔ پرمیسر۔ گوبند۔ لات۔ عزیٰ۔ جگنات۔ بجودہر۔ دورت

اس کے بعد طویل تمہید ہے کہ کس طرح فرشتوں نے چار قسم کی مٹی لائی۔

Hanif Razvi

ابلیس نے مٹی سے کیا کیا پھر کس طرح مٹی سے خدا نے آدم کو پیدا کیا اس کا حال ذیل کے اقتباس میں ملے گا۔

بیان تم سنو اس خاک کا جس طور بیچ کتاب "معارج کے لکھا ہے برس انچالیس تک اس خاک پہ بارانِ غم برستا رہا۔ بعد از حکم پروردگار یوں ہوا کہ برس ایک تلک بارانِ عیش اس خاک پہ برسا اس واسطے ذات انسان پر خوشی کم ہے اور غم بہوت ہے"

اسی طرح اس کتاب میں فلسفیانہ مسائل جیسے انسان و کائنات کی تخلیق وغیرہ کو قصوں اور کہانیوں کا روپ دے دیا گیا ہے۔

کتابوں کی جنگ

اٹھارویں صدی عیسوی میں فرانس اور انگلستان کے ادب میں ادبی کارناموں کو جانچنے کے لیئے دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک گروہ قدیم مصنفین کو پسند کرتا تھا تو دوسرا جدید کی تائید کرتا اس سلسلے میں خوب خوب لفظی جنگیں چلیں مشہور طنز نگار سوئفٹ (   ) نے اپنی تصنیف کتابوں کی جنگ "The Battle of Books" میں اس کا مذاق اڑایا ہے۔

اردو میں اس دور میں مذہب کے موضوع پر ایسی ہی معرکہ آرائیاں رہیں اس کا کچھ اندازہ جامعہ عثمانیہ کے مخزونہ ایک رسالہ "بدرالدجیٰ" سے ہو سکتا ہے۔

اس رسالے کے مصنف کا نام میر پانچو بتایا گیا ہے جو نصیر آباد کے رہنے والے تھے میر صاحب نے مراد آباد کے کسی "میاں جی" معلم کتابی کی تصنیف "نور الہدیٰ" کا تخلیہ کیا ہے۔ میاں جی کی کتاب فقہ کے مسائل پر مشتمل تھی میر صاحب کو میاں جی سے اکثر امور میں اختلاف تھا اور وہ میاں جی کی خبر لیتے ہیں کہ یہ فقہ میں بھی دخل دینے لگا ہے رسالہ بدرالدجیٰ میں میاں جی کی عبارت نقل کی گئی ہے۔ ہر وقت میاں جی کی عبارت قول کے تحت لکھی گئی ہے اور پھر اس کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ ایک جگہ میر صاحب لکھتے ہیں۔

Hanif Razvi

"معلم کتابی میاں جی نقشہ میں بھی دخل دینے لگا سبحان اللہ
مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ جب چیونٹی کے پر نکلے موت کا پیغام
ہوا بھلا منکر قدرتِ رحمان شانِ خالق کون و مکاں کیا جانے"

تجھے کیا کام شرع مصطفےٰ سے + تو اپنے شیخ سدو کو منالے

مصنف کے بقول میاں جی کی تاریکی ضلالت و جہالت کو دور کرنے کے لئے یہ رسالہ لکھا گیا۔ میاں جی کے ایک قول کا میر صاحب اس طرح مضحکہ اڑاتے ہیں

"میاں جی جھوٹا کسی کے نسخے کو کسی کا لکھا ہوا کہتا ہے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ کئی رسالوں تک پھیل گیا اس معرکہ میں میاں جی اور میر صاحب کے اور کئی دوست احباب بھی اتر آئے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں فرید الزماں عبدالوھاب وغیرہ ان معرکوں کا نتیجہ چند رسالے ہیں جن میں سے کچھ بدر الدجیٰ کے ساتھ شامل ہیں۔ جیسے "جزاء جمیل" جو فتح الجلیل" کے جواب میں لکھا گیا۔ تبر عربی جو تیغ ہندی کا جواب ہے۔ اس سلسلے کا آخری رسالہ ہدایت الکلام معلوم ہوتا ہے۔ میاں جی غالباً وہابی عقیدے کے تھے اس لیئے میر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو ان سے پرخاش ہوگئی تھی۔ اس طرح کے معرکے اٹھارہویں صدی کی خصوصیت معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کا ایک اور مناظرہ فورٹ ولیم کے قیام کے بعد "برہان قاطع" کے مطلے پر غالب اور ان کے رفقاء میں بھی ملتا ہے۔

صرف ونحو

اس دور کا سب سے اہم کارنامہ زبان کی صرف ونحو کے مطالعہ کا آغاز اور اس میدان میں تحقیق کی ابتدا ہے۔ اسی زمانے میں یورپی قومیں تجارت اور دوسرے مفادات کے لیے ہندوستان میں آنے کے بعد انھیں یہاں کی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو یا ہندوستانی کو سیکھنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور اسی لیئے ان

نو واردوں نے ہندوستانی زبان سیکھنے کے لیئے صرف و نحو کی کتابوں پر توجہ شروع کی۔ ہندوستانیوں کو قواعد زبان سیکھنے کی ایسی ضرورت نہیں تھی بنابریں ہندوستانیوں اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی تھی۔ ان یورپی مصنفین کے مطالعے کی ضرورت کے باعث اردو زبان میں زبان پر قابل قدر تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز ہوا۔

یوں تو یورپین اقوام کا ہندوستان سے زمانہ قدیم سے تعلق رہا ہے یعنی اسوقت سے جب کہ ۳۲۷ء قبل مسیح سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا نتیجتاً کچھ عرصہ تک ہندوستان کے شمال مغربی حصے پر یونانی اثر بھی رہا اسلام کے عروج کے بعد اہل یورپ کو ہندوستان کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی یورپ سے ہند کا از سر نو رابطہ پندرھویں صدی عیسوی اور دسویں صدی ہجری میں قائم ہوا

پندرھویں صدی عیسوی اور دسویں صدی ہجری میں قایم ہوا ۱۴۹۸ء مطابق ۹۰۳ھ میں پرتگال کے بیڑہ کا سپہ سالار واسکوڈی گاما ہندوستان کے مغربی ساحل کالی کٹ پہونچا۔ اس وقت سے پرتگالیوں نے ہندوستان میں اپنے پیر جمانے شروع کیے ۱۵۰۰ء میں واسکوڈی گاما کو کالی کٹ فتح کرنے والے بیڑہ کا سردار بنا کر بھیجا گیا۔ اس لئے پہلے کیبرال ہندوستان کو فتح کرنے کے ارادے سے چلا تھا۔ لیکن وہ بھٹک کر ویرا کروڑ پہونچ گیا۔ ۱۵۰۱ء میں الفان سودی ال بوکرک نے ایشیا میں پرتگیز شہنشاہیت کی بنیاد ڈالنی چاہی اور ۱۵۱۰ء میں گوا اور ملابار پر قبضہ کر لیا اس کی یوسف عادل شاہ والی بیجاپور سے بھی لڑائیاں ہوئیں ۱۵۰۵ء میں ڈم فرانکو ہندوستان کا پہلا پرتگالی ویسرا بن کر آیا۔ اور کوچین اس کا دار الخلافہ قرار دیا۔ ہندوستان کی اس فتح کے متعلق ایک پرتگیز شاعر کماوس نے بڑی بے مثال مثنوی

"لُوس ڈِس" لکھی۔ جس کے متعلق ایک نقاد کا خیال ہے کہ صرف یہ ایک نظم پورے پرتگالی ادب کے برابر ہے۔ یہ کافی طویل نظم ہے جس میں ہندوستان کی بڑی موثر تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس نظم کا پس منظر اجودھیا نگر ہے اور اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب رام سیتا کے بن باس پر متاسف تھے۔ شام کے وقت فقیروں کے بھجن وغیرہ سے بڑی دلکش اور پُراسرار فضا پیدا کی گئی ہے۔ مختصراً پرتگالی ایک نئی تہذیب پرتگیشن تہذیب کو جنم دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہاں کی عورتوں سے بیاہ کیے اور اپنے مذہب کی اشاعت کی بھی کوشش کی ہندوستان کی زبانوں سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں نیز گجرات کے بادشاہوں سے پرتگالیوں کے بڑے روابط تھے اور یہ ریاستیں اردو کے ابتدائی نشوونما کے لیے مشہور ہیں۔ چنانچہ پرتگالیوں کے اثر و نفوذ کی اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ اردو میں کئی الفاظ پرتگیزی زبان کے داخل ہو گئے ہیں چنانچہ ذیل کے الفاظ جو اردو میں جذب ہو گئے ہیں پرتگالی نژاد ہیں۔ الماری۔ بالٹی۔ صابن۔ تولیہ۔ کارتوس۔ پستول وغیرہ۔

لیکن راقم الحروف کو اردو میں کسی پرتگالی مصنف کے کسی نثری کارنامے کا پتہ نہ چل سکا۔ گو پرتگالیوں میں اردو کے کچھ اچھے شاعر گذرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پرتگالیوں نے کوئی نثر کی کتاب بھی لکھی ہو یہ قیاس اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ

۱؎ اس زمانے میں گجرات پر بہادر شاہ کے خاندان کی حکومت تھی۔ ملاحظہ ہو ہسٹری آف گجرات۔ اس کے علاوہ شیخ زین الدین کی "تحفۃ المجاہدین" میں بھی پرتگیزیوں کے حالات درج ہیں جس کا ترجمہ حکیم شمس اللہ قادری نے پرتگیزان مالابار کے نام سے کیا۔

Hanif Razvi

اس زمانے میں جتنی یورپی قومیں ہندوستان آئیں انھوں نے اُردو زبان سیکھنے کی خاطر اس موضوع پر کتابیں لکھیں سب سے پہلی کتاب جس یورپی مصنف کی دستیاب ہوئی ہے وہ پرتگالیوں کی حریف ولندیزی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا نام جان جوشوا کٹیلر ہے۔

جان جوشوا کٹیلر

کٹیلر نے ہندوستانی صرف و نحو پر اردو زبان میں ایک کتاب لکھی تھی کٹیلر پروشیا کے ایک شہر میں پیدا ہوا اور لوتھر کے عقاید کا پیرو تھا۔ ولندیزی حکومت کی جانب سے شاہ عالم (سنہ ۱۷۰۸ء تا سنہ ۱۷۱۲ء) سنہ ۱۱۰۸ھ تا سنہ ۱۱۱۲ھ اور جہاں دار شاہ کے دربار میں بھیجا گیا تھا (سنہ ۱۷۱۱ء) سنہ ۱۱۱۱ھ میں سورت میں ڈچ کمپنی کا ناظم تجارت رہا۔ پھر دہلی سے لاہور گیا کچھ دن آگرہ میں بھی قیام رہا آگرہ میں کمپنی کا ایک کارخانہ تھا جس کا تعلق سورت سے تھا ولندیزیوں کا وفد سنہ ۱۷۱۱ء میں آگرہ پہنچا کٹیلر سورت میں سنہ ۱۷۱۶ء تک رہا اس کے بعد وہ ایران میں سفیر ہو کر گیا جس وقت اصفہان سے واپس آ رہا تھا ایرانی گورنر نے اس سے عرب حملہ آوروں کے مقابلے میں لڑنے کی خواہش کی اس نے انکار کر دیا اس پر ایرانی حاکم نے اسے قید کر لیا قید ہی میں اس کا انتقال ہو گیا[۱]

اس نے ہندوستانی زبان کی صرف و نحو اور ایک لغت بھی لکھی تھی جو ڈیوڈمل نے سنہ ۱۷۴۳ء میں شائع کی کٹیلر کی صرف و نحو میں ہندوستانی زبان کی تصریف و گردان ہی نہیں بلکہ اس میں احکام انجیل اور عیسائیوں کے عقاید اور حضرت عیسیٰ کی دعا کا ترجمہ بھی شامل تھا۔

کیلر کی گرامر سے حضرت عیسیٰ کی دعا کے ترجمہ کا وہ اقتباس جو گریرسن نے

۱۔ لنگوئسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم صفحہ ۸ دیباچہ قواعد اردو مصنف عبدالحق

Hanif Razvi

دیا یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔

ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے پاک ہووے تیرے ناوں آوے
ہم کون ملوک تیرا ہووے راج تیرا جون آسمان تو جمیں میں روٹی
ہماری نہ تھی ہم کو اس دیئے اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کون جوں
معاف کرتے پرے قرض داروں کون نہ ڈال ہمکو اس وسوسے میں
بلکہ ہم کون گھر کر اس برائی سے تیری ہی سبھی سواری عالمگیری حمایت
میں آمیں"

جیمبرلین کٹید کے بعد گریرسن جان جیمبرلیں کا بھی ذکر کرتا ہے جس نے حضرت عیسیٰ کی دعاؤں کا ترجمہ اردو میں کیا تھا یہ ترجمہ گریرسن کے بیان کے مطابق ۱۷۱۵ء میں ایمسٹرڈم میں شائع ہوا تھا اس کا مقدمہ ڈیوڈ ولکسن نے لکھا تھا ڈیوڈ ولکس نے خود بھی چند حصوں کا ترجمہ کیا تھا۔ جیمبرلین کی کتاب کا پورا نام جو لاطینی میں ہے گریرسن نے نقل کیا ہے۔ افسوس ہے کہ گریرسن نے اس ترجمے کے کچھ اقتباسات اپنی کتاب میں نہیں دیے

ڈیوڈ مل مل دوسرا مستشرق ہے جس کی تصنیف کا ذکر گریرسن نے کیا ہے۔ مل کے مضامین اور تحریروں کے مجموعہ کا نام اطالوی میں بہت لمبا چوڑا ہے۔ گریرسن نے اس کا مختصر نام "ڈمیونیشن سیلکٹائی" لکھا ہے۔ ہمارے موضوع کے لحاظ سے اس کا آخری حصہ "مس سے لینا اور مٹیا لیا" ہے جس نے مل نے کیٹلو کی قواعد ولغت کو شائع کیا ہے اس میں ایک قصہ مشرق کی سیاحت کے بارے میں بھی ہے[1] اس کتاب میں اس نے آگے چل کر ہندوستانی زبان پر بحث کی ہے۔ چند صفحات میں میں لاطینی ہندوستانی اور فارسی الفاظ لکھے ہیں اور ان کا مقابلہ بھی کیا ہے۔

---

[1] لنگوئیٹک سروے آف انڈیا جلد نہم صفحہ ۸ و قواعد اردو صفحہ ۲

Hanif Raza

شلز۔ مشہور مثنوی تھا اس نے اردو کی صرف و نحو پر ایک کتاب بھی لکھی ہے اس کتاب کا بھی لاطینی نام بہت طویل ہے جسے گریرسن نے پورا نقل کیا ہے[1]۔ اس قواعد کا ذکر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی اپنے دیباچہ قواعد اردو میں کیا ہے یہ قواعد لاطینی میں لکھی گئی تھی گریرسن کا بیان ہے کہ شلز نے اپنی کتاب کے دیباچے میں کیٹلر کی قواعد کا بھی ذکر کیا ہے اس میں اردو کے لفظ فارسی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں اور ان کا لاطینی تلفظ بھی دیا ہے۔ ساتھ ہی ناگری حروف بھی دے دیے ہیں۔

شلز کی قواعد کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے لاطینی تلفظ میں اردو کے "گوزی" (   ) اور سہکار (   ) حروف کے بجائے سادہ حروف دیتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو کے حروف کو نظر انداز کر جاتا ہے۔

ڈاکٹر گریرسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ شخصی ضمیروں کی واحد و جمع دونوں صورتوں سے واقف تھا لیکن فعل متعدی کے لیے "نے" کے استعمال سے وہ بے خبر تھا۔ مولوی عبدالحق اپنے دیباچہ قواعد اردو میں لکھتے ہیں۔

> یہ اس پر موقوف نہیں بلکہ اکثر قدیم کتب قواعد میں "نے" نظر انداز کر دیا گیا ہے[2]۔

اس کی توجیہہ مولوی عبدالحق یوں کرتے ہیں کہ

> "پرانی اردو میں نے کا استعمال بالالتزام نہیں ہوتا تھا"

گریرسن نے فرٹنر کے بیان میں شلز کی مترجمہ حضرت عیسٰی کی دعا کے دو اردو جملے بھی نقل کیے ہیں جو درج کیے جاتے ہیں۔

---

[1] لنگوئیسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم صفحہ ۸ و دیباچہ قواعد اردو

[2] قواعد اردو صفحہ ۱۱

Hanif Razvi

"آسمان پور تھا سو ہمارا باپ تھا رناوں پاک کرنا ہونے دیو
تمہاری پادشاہی آنے دیو"۔

جوہان فریڈرش فرٹنر فرٹنر کی کتاب میں جو سنہ ۱۷۴۸ء میں لیزگ (لیزش) میں چھپی سو سے زیادہ مختلف زبانوں کے حروف تہجی درج ہیں اس کتاب کا دیباچہ شلز نے لکھا تھا اس کتاب میں ہندوستانی حروف تہجی بھی لکھے گئے ہیں۔ حامد حسن قادری نے فرٹنر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے اردو کے حروف تہجی کا دیگر ممالک کے حروف سے مقابلہ کیا[1] پتہ نہیں حامد حسن صاحب قادری کا ماخذ کیا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حامد حسن صاحب قادری نے مولوی عبدالحق کے مضمون مطبوعہ رسالہ اردو سے مواد اخذ کیا ہے اور مولوی عبدالحق نے ابتدائی دور کے یورپی مصنفین کے بارے میں اپنا سارا مواد گریرسن سے اخذ کیا۔

جہاں تک گریرسن کا تعلق ہے اس نے اس طرح کی کوئی بات نہیں لکھی جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اور جیسے حامد حسن صاحب قادری نے نقل کیا ہے گریرسن یہ ضرور لکھتا ہے کہ فرٹنر نے اپنی قواعد کے پہلے حصے میں کوئی سو سے زیادہ زبانوں کے حروف تہجی کی جدول دی ہے۔ جن میں سے ہر ایک کے استعمال کا طریقہ بھی درج ہے۔ لیکن وہ اس کا ذکر نہیں کرتے کہ فرٹنر نے اردو کے حروف تہجی کا مقابلہ دنیا کی دیگر زبانوں کے حروف تہجی سے کیا تھا۔ ممکن ہے حامد حسن صاحب قادری کا اشارہ ان ہی جدولوں کی طرف ہو فرٹنر نے شلز کے حضرت عیسیٰ کی دعا کے ترجمہ کو بھی نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ چار لفظوں آسمان۔ باپ۔ روٹی کے لیے مختلف زبانوں میں جو لفظ مستعمل ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے وہ چار لفظ ہندوستانی

---

[1] داستان تاریخ اردو صفحہ ۷۳

میں اس طرح لکھے ہیں۔ آسمان۔ باپ۔ جینا۔ روٹی (روٹی) وغیرہ

کیسیانو بیلی گاٹی کیسیانو بیلی گاٹی ایک اطالوی مشنری تھا اس نے ہندوستانی زبانوں کے متعلق جو اس وقت رائج تھیں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام الفابیٹم برہمانیکم ہے اس کا دیباچہ جوہانیز کرسٹو فورس ایماڈوزی نے لکھا۔ ایماڈوزی نے دیباچہ میں تفصیل سے ہندوستان کی مروجہ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ نیز ایک لغت "لیکسی کون لنگوائی انڈوستانیکا" کی بھی نشان دہی کی ہے جس کا مخطوطہ روم کی پروپیگنڈا لائبریری میں موجود تھا ساتھ ہی ایماڈوزی نے ایک مناظرہ سے مخطوطے کا بھی حل لکھا ہے۔ جو غالباً ہندوستانی میں تھا اور ایک ہندوستانی اور ایک عیسائی کے مابین مذاہب کی صداقتوں کے بارے میں ہوا تھا۔ یہ مناظرہ چمپارن ضلع کے ایک راجہ جس کا نام راجہ آف بٹیا بتایا گیا ہے کے نام معنون کیا گیا تھا۔ یہ مناظرہ جوزف گارگ نان تیئس اور بیلی گاٹی کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔

بیلی گٹی نے دو رسم الخطوں کا بھی ذکر کیا ہے جس میں سے ایک ناگری اور دوسرا اعوامی بتایا گیا ہے اور جن میں بہا کا بولی یا گنوارو زبان بولی جاتی تھی۔

فرگوسن ڈاکٹر عبدالحق نے ۱۷۷۳ء میں لکھی ہوئی ایک ہندوستانی لغت کا بھی ذکر کیا ہے جس کا مصنف فرگوسن تھا۔ افسوس کہ اس کے مزید حالات کہیں نہیں ملے

ایوارس ابیل ابیل کی ایک کتاب ۱۷۸۲ء میں کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں چھپی اس کتاب میں ہندوستان کی گیارہ زبانوں سے ۵۳ لفظ بیکران کے مترادف الفاظ بنائے گئے ہیں ان الفاظ میں سے چند یہ ہیں۔

جسم۔ آسمان۔ سورج۔ مکان۔ پانی۔ سمندر[1]

---

[1] لنگوئیسٹک سروے آف انڈیا صفحہ ۹

ہندوستانی حروفِ تہجی

۱۷۹۱ء میں "ہندوستانی ابجد" کے نام سے روما میں ایک کتاب چھپی تھی۔ مصنف کا نام دو ہیں۔ اس کا دیباچہ پالی نس بارتھو لومیو نے لکھا ہے اس کتاب میں ہندوستانی ملاباری تلنگی اور دیوناگری زبانوں کے حروف تہجی دیے گئے ہیں[۱]۔

لے بے ڈف

ڈف نے بھی ہندوستانی زبان کی صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس شخص کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ جو اس نے خود اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۸۵ء میں مدراس گیا تھا۔ وہاں اس کی خدمت بینڈ نوازی تھی دو سال مدراس میں وہ رہ کر کلکتہ چلا گیا اور کلکتہ میں ایک پنڈت سے بنگالی اور ہندوستانی سیکھیں۔ اس نے انگریزی کے دو ڈراموں کا بنگالی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ایڈلنگ کے قول کے مطابق وہ شہنشاہ دہلی کے تھیٹر کا منتظم بنا دیا گیا تھا۔ تقریباً ۲۰ برس مشرق میں رہ کر وہ انگلستان واپس ہوا اور لندن ہی میں ہندوستانی زبان کی صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی۔ جہاں سے وہ روس کے محکمہ سفارت میں ملازم ہو کر روس چلا گیا۔ ڈاکٹر عبدالحق اس کی قواعد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے ہندوستانی قواعد کے بیان کرنے میں بے شک صریح غلطیاں کی ہیں۔

ہیڈلے

ہیڈلے نے ۱۷۷۲ء میں اردو کی ایک گرامر لکھی۔

جان کرسٹوف ایڈی لنگ

سب سے آخر میں جان کرسٹوف ایڈی لنگ آتا ہے جو اپنے زمانے کا ماہر لسانیات سمجھا جاتا ہے ہندوستانی زبان کے بارے میں اس نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس نے اردو کو منگولی ہندوستانی اور "موری" کے نام دیے ہیں اس کے علاوہ ہندوستان کی

---

[۱] لنگوئسٹک سروے آف انڈیا صفحہ ۹

دوسری بولیوں کی بھی تفصیلات بتائی ہیں۔[1]

ان یورپی مصنفین کے علاوہ خود ہندوستانیوں نے بھی اردو کی صرف ونحو پر تصنیف وتالیف کے چند نمونوں کا حال پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے ان کے علاوہ راقم الحروف کو اس موضوع پر "رسالہ قواعد ہندی" اور "ریختہ ہندی کی صرف ونحو" کے بھی مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں۔

رسالہ قواعد ہندی کا مخطوطہ مدراس یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس کے مصنف کا پتہ نہ چل سکا۔[2]

ریختہ ہندی کی صرف ونحو کتب خانہ جامعات عثمانیہ میں موجود ہے۔ سنہ تصنیف اور مصنف کا نام درج نہیں۔ اردو کا نام مصنف ہر جگہ "ہندی" لکھا ہے۔ سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے۔

یہ رسالہ زبان ریختہ ہندی کی صرف ونحو میں مشتمل ہے دو مقالے پر مقالہ اول مفردات میں"

اس میں اسم فعل صفت وغیرہ کی اقسام اور مصادر کی پہچان وغیرہ کا بیان ہے۔

انشاء لسانیات یا صرف نحو سے ہٹ کر ایک اور موضوع جو گیارہویں صدی کے مصنفین کو مرغوب رہا ہے وہ انشا یعنی خطوط نویسی ہے۔ بارہویں صدی کے اختتام کے قریب انشا کی بھی کافی تصانیف ملتی ہیں۔ اس زمانے میں انشا پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کا مقصد محض خطوط نویسی کے طریقے سکھانا نہیں بلکہ یہ انشا پردازی اور زبان سیکھنے اور سکھانے کا بھی اہم ذریعہ تھا چنانچہ

---

[1] لنگوئیٹک سروے آف انڈیا جلد نہم صفحہ ۱۱

[2] "مینوسکوپٹس ان مدراس یونیورسٹی" مرتبہ چندر شیکھرن جلد ۳

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

بات چیت کو کاغذوں میں محفوظ رکھنے کا دستور بہت پرانا ہے بادشاہوں اور وزیروں کے حکم احکام کے چھوٹے چھوٹے فقرے جو بلاغت کی جان ہوتے تھے توقیعات کہلاتے تھے اور یاد رکھے جاتے تھے انشا یعنی خطوط نویسی کی نگہداشت و کثرت اور وسعت مسلمانوں کے دور میں ہوئی[1]

انشار کی ایجاد کے بارے میں گارسان ڈی تاسی لکھتا ہے

"میں معقول وجوہ کے ساتھ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ تذکرہ مشرق کے مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے اس قسم کی ایک دوسری چیز ہے جس کا نام انشار یہ خطوط کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جو کسی ایک ہی شخص کی تصنیف ہوتے ہیں یہ گویا فصاحت بلاغت سکھانے کی کتاب ہوتی ہے"

انشار کی کتابوں میں فورٹ ولیم سے پہلے کی لکھی ہوئی ذیل کی کتابیں ملتی ہیں۔[2]

(۱) دستور النثر (۲) فن انشا (۳) دستور الہدایت

دستور النثر

ارکاٹ کے ایک باشندے محمد لطیف نے اپنے لڑکے کے واسطے کئی رقعے نو عنوانات کے تحت جمع کر کے ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام "مفید الصبیان" تھا۔ اس کا ترجمہ محمد خاں نے "دستور النثر" کے نام سے دکھنی میں کیا تھا[3] تاکہ اردو انشا کے مبتدی اس سے استفادہ کر سکیں مصنف نے تمہید میں خود اس کا ذکر کیا ہے کتاب نو اقسام پر مشتمل ہے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے

۱؎ دیباچہ "مکاتیب محمدی"

۲؎ خطبات گارسان ڈی تاسی صفحہ ۳۰۵

۳؎ ان کے حالات نقد گیدانی کے ضمن میں گذر چکے ہیں ملاحظہ ہو مقالہ ہذا

Hanif Razvi

اول قسم - خوشی اور مبارکبادی کے خطوط لکھنے میں۔

دوم قسم - غم اور ماتم کے نگہداشت میں۔

تیسری قسم - میوے اور مٹھائی کی تحریر میں۔

چوتھی قسم - سب کاموں کی نوشت میں۔

پانچویں قسم - لفظوں کے غلطی اور صحیح کے جاننے میں۔

چھٹی قسم - شوقی خط کے ترقیم میں۔

ساتویں قسم - بیچ آداب اور القاب اور لفافوں کے۔

آٹھویں قسم - خط اور قبالہ اور تمسک وغیرہ کے بیچ میں۔

نویں قسم - عربی فارسی ہندی انگریزی اردو مہینوں کے نام وغیرہ کے آغاز میں

"دستور النثر" کو مرتب فہرست پروفیسر سروری نے تیرھویں صدی ہجری کے آغاز کی تصنیف قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"کتاب تیرہویں صدی ہجری میں خطوط عرائض وغیرہ لکھنے کے جو طریقے دکن میں رائج تھے ان کا اچھا خاکہ ہے

اس کا سنہ کتابت ۱۲۶۰ھ ہے۔ اس کا کچھ اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد بے حد و ثنائے بے عدد اس کو شایان ہے جس کی قدرت کے وصف میں بڑے بڑے داناؤں کی عقل حیران ہے"

دستور الہدایت کتاب میں مصنف کا نام غلام محمد غوث باشندہ مدراس درج ہے محمد غوث خاں شرف الملک کا نام تھا جو مدراس کے مشہور مصنف اور انشا پرداز گذرے ہیں ممکن ہے کہ یہ شرف الملک غلام محمد غوث خاں ہی کی تصنیف ہو

۱؎ مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ فن انشا نمبر (۱۵۹۰)

۲؎ فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ (۱۸۴)

دستور الہدایت کا جو نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے وہ ۱۲۷۵ھ کا مکتوبہ ہے اس کی تصنیف اس سے پہلے کی ہونی چاہیے غالباً یہ تیرھویں صدی کے اوائل کی تصنیف ہے محمد غوث خاں شرف الملک کا زمانہ بھی یہی ہے یعنی ۱۱۶۶ھ تا ۱۲۳۵ھ)

کتاب کی وجہ تصنیف کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نسبت خان نامی جمعدار کی تعلیم کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کی عبارت معاصر تحریروں کے برخلاف بڑی حد تک مسجع اور مقفی ہے جس کا کچھ اندازہ دیباچہ کی حسب ذیل عبارت سے ہو سکتا ہے

"حمد کثیر اس غنی بے نظیر کو بجا ہے جس کی قدرت کے حکم سے کائنات کے تختے پر ہزارہا نقش بدیع لکھے گئے اور صلوٰۃ بے نہایات اس دبیر خوش تحریر کی زیبا ہے جس کی ہدایت کے رقعے سعادت مندوں کی خاطر صفحے پر چھاپے گئے۔

کتاب اصل میں جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے نسبت خاں جمعدار کی خاطر تصنیف ہوئی لیکن غالباً کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ لیکن اس کا ضمنی مقدمہ یہ بھی تھا کہ مبتدی بھی اس سے استفادہ کر سکیں چنانچہ مصنف لکھتا ہے۔

"اما بعد قاسم نومی نے ابوالفضل کے انشا، وغیرہ اگلی کتابوں کو حال محاورے سے بے محاورہ دیکھ کر اس زمانے کے مبتدیوں کو خطوط نویسی کا طریقہ سکھلانے کے واسطے یہ مختصر تجویز کیا اور اس کا نام دستور الہدایت رکھا چہار فصل پر مرتب اور کئی قاعدوں سے مرکب ہے"۔

کتاب کے چار ابواب ہیں جن کی تفصیل یہ ہے

پہلی فصل خط کے دس فقروں کے بیان میں ہے اس میں القاب سلام دنیا ز استخبار اور سرنامہ پر کی عبارت توضیح وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

استخبار کی تعریف میں مصنف لکھتا ہے

پہلا فقرہ مکتوب منہ کی خیریت کا اور دوسرا فقرہ مکتوب الیہ کی خیریت کی طلب کا۔

دوسری فصل۔ کیفیت کے بیان میں مقدمہ میں درج ہے کہ دنیا کے سب فعل دو قسم پر ہیں "اخبار یا انشا،" اخبار وہ ہے کہ ماضی حال اور استقبال کے احوال کا بیان کریں اور انشا وہ ہے کہ ایک کام کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیویں

تیسری فصل۔ مختلف قاعدوں کے بیان میں ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ رقعات اور تعزیت نامہ وغیرہ میں استخبار کا لکھنا مروج نہیں رقعہ شقہ وہ ہے کہ مرجع اور مختصر ہووے۔

چوتھی فصل۔ سلاست اور رنگینی کے بیان میں ہے

عبارت کے اقسام کے بارے میں مصنف لکھتا ہے۔

انشا پردازی کی عبارت دو قسم پر ہے سلیس اور رنگیں سلیس وہ ہے کہ اس میں صفت تشبیہ استعارہ جملہ معترضہ وغیرہ مطلب سے زاید چیزیں نہ لکھے جاویں اور رنگین وہ ہے کہ اس میں یہ چیز ہوویں صفات، مشبہ بہ۔ مستعار۔ جملہ معترضہ بعفر بکبیر۔ مرکب زایدہ"

مذکورہ بالا اقتباسات سے اس گمان کی تصدیق ہوتی ہے کہ "دستور الہدایت" فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے کیونکہ اس تحریر پر فارسی انشار کا گہرا اثر ہے۔

فن انشا یہ کتاب نظام الدین کی تصنیف ہے جس کا ذکر ڈی۔ تاسی نے بھی کیا ہے۔ مرتب مقالہ کو اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں دستیاب ہوا[۲]

---

[۱] خطبات گارساں ڈی۔ تاسی صفحہ ۱۶۳ [۲] فن انشا نمبر ۹۹

Hanif Razvi

ڈی۔ٹا نے "فن انشاء" کے علاوہ ان کی ایک اور تصنیف "حکایات لقمان" کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ فورٹ ولیم کے بعد کے زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس نے نہ تو فنِ انشار کا کچھ اقتباس دیا اور نہ اس کا سنہ تصنیف بتایا ہے تاہم اس کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مصنف نظام الدین گردش زمانہ سے پونا آگئے تھے۔ کتاب کی تمہید میں نظام الدین نے یہ بتایا ہے کہ وہ "سرداروں" کو انشا سکھایا کرتے تھے غالباً سرداروں سے ان کی مراد انگریز عہدہ داروں سے ہے اس سے یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ "فن انشا" انھوں نے فورٹ ولیم سے پہلے غالباً اوائل تیرہوں صدی ہجری میں لکھی ہوگی۔

مصنف نے دیباچہ میں اپنے کچھ حالات بھی لکھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالباً شمالی ہند کے باشندے تھے اور تلاش معاش میں پونا آئے تھے انشا سے انھیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ اکثر خواہش مندان سے خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ انھیں میں سے ایک ہارڈی صاحب بھی تھے جو بہار کے رہنے والے تھے انھوں نے مصنف کی قدردانی کی اور غالباً اس سے انشار کی تعلیم حاصل کرنے لگے وہ اکثر اوقات مصنف سے خطوط لکھنے کی فرمائش بھی کرتے اور وہ ہر روز دو چار خطوط تحریر کر دیتا تھا ہارڈی صاحب کے علاوہ اور لوگ بھی اس سے خطوط لکھواتے اس سے اس کو خیال پیدا ہوا کہ میں لوگوں کی خاطر ہر روز خطوط لکھا کرتا ہوں اور وہ انھیں پڑھ کر پھینک دیتے یا ضائع کر دیتے ہیں کیوں نہ ان خطوط کو اکٹھا کردوں کہ سیکھنے والوں کے لیے کام آسکے اس خیال سے اس نے فنِ انشا مرتب کی نظام الدین نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے "انشائے ہرکرن" کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا۔ اس بارے میں وہ لکھتا ہے۔

اس کے سوا انشاء ہرکرن کہ فارسی میں ہے۔ اس کا ترجمہ بھی سلیس ہندی میں کیا لفظاً ترجمہ نہیں کیا۔ مگر اس کے خلاصے اور مطلب سے کام رکھا کہ شکل

نہ ہو۔ اور بعض خطعاً اس میں چھوڑ بھی دے ہیں کہ میں نے اسے شکل نہیں کیا۔ صاحب ہندی ترتیب دیا کہ دقت نہ ہوا ور سچ ہے کہ جو آسانی سے کیا جاوے اس واسطے دقت کیوں اٹھاوے۔ غرض اس کتاب کے تیار ہونے کا سبب یہ تھا کہ جارج مالکم صاحب بہادر اہل قلم قدر داں شیریں زبان صاحب خلق و مروت کہ جن کے اوصاف بیان سے باہر ہیں اس بیکس پر نہایت مہربانی فرماتے ہیں ہمیشہ ہندی زبان کی تحصیل میں مشغول رہے۔ ان کی خواہش اور فرمائش سے یہ کتاب تمام ہوئی۔ حاصل کلام اس طور سے اس کتاب کو درست کیا کہ ہر ایک اسے پڑھ کر فائدہ پاوے۔ اس واسطے یہ حقیر ہر ایک قابل اور اہل دانش سے عرض کرتا ہے کہ اگر اس لکھنے میں کہیں سہو نظر آوے تو اصلاح بخشیں۔

"فن انشا" میں مصنف نے مختلف قسم کے خطوط اور عرضیوں وغیرہ کے نمونے اکٹھا کر دئے ہیں۔ ایک عرضی کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے۔

عرضی

غریب نواز سلامت۔ ایک رستہ جو قدیم سے ملا زین الدین کی حویلی کی طرف سے ہو کر نکلتا ہے اس راستہ سے آدمی بیل بکریاں آیا جایا کرتے ہیں اور اس کا مذکورہ بلکہ سرکاری دفتر میں لکھا ہے۔ اب وہ بلا شوارت سے کسی کو اس راستہ پر چلنے نہیں دیتا بلکہ لکڑی ہاتھ میں لیکر مارنے دوڑتا ہے۔ اس واسطے عرض کی اسے بلا کر انصاف کیجئے۔ واجب تھا عرض کی"۔

نمونے کے خطوط میں سے ایک خط بھی ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

بیگم صاحب سلامت۔ تمہارا خط بیجا لعل وکیل کے ہاتھ سے گورنر صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ صاحب بہادر اس کے مطالعہ سے نہایت خوش

ہوئے اور تمہارا احوال وکیسل کی زبانی معلوم ہوا۔ انشاء اللہ دس
پندرہ روز کے بعد جیسا حضور سے حکم ہوگا ویسا اس کا جواب لکھا
جائے گا۔ امید ہے کہ ہمیشہ اسی طور پر اپنی خیریت سے اطلاع
دیتے رہیں گی۔"

تاریخ گارساں ڈی۔ ٹاسی کا خیال ہے کہ
"جو کچھ بھی ہو اہل مشرق کی نظروں میں تاریخ کی وہ وقعت نہیں جو
ہم میں ہے"[1]

اس طرح وہ تاریخ نویسی کی ابتدا کا سہرا یورپی مصنفین کے سر باندھنا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تاریخ اہل مشرق اور خاص طور پر عربوں کا مخصوص فن رہا ہے چنانچہ ابن خلدون کا نام اس سلسلے میں فخر کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ "فورٹ ولیم کالج" میں تاریخ کی طرف بھی خاص طور پر توجہ دی گئی مشہور تواریخ لکھی بھی گئیں اور ترجمے بھی ہوئے۔ لیکن فورٹ ولیم سے بیشتر بھی اردو میں تاریخیں ملتی ہیں۔ اس خصوص میں راقم الحروف کو تین تاریخی تصانیف کا پتہ چلا ہے جن کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱- ترجمہ تاریخ فیروز شاہی۔
۲- تاریخ ہندوستان۔
۳- بہادر نامہ یا تاریخ سری رنگ پٹم

ترجمہ تاریخ فیروز شاہی تاریخ فیروز شاہی کے نام سے فارسی میں دو تاریخیں لکھی گئیں جن کے نام ایک ہی ہیں۔ ان میں سے ایک شمس سراج عفیف کی ہے دوسری ضیاء الدین برنی کی۔ سراج عفیف کی تاریخ میں فیروز شاہ کے خاندان اور

---

[1] خطبات گارساں ڈی ٹاسی صفحہ ۱۶۷
[2] ملاحظہ ہو فن تاریخ نمبر (۱۷)

خانگی حالات پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ لیکن ضیاء الدین کی تاریخ میں اس عہد کے حالات اور دکن کا بھی تذکرہ کافی ملتا ہے۔ وارث علی بن شیخ بہادر ساکن دارالخلافہ شاہ جہاں آباد نے سرہنری کپتان لوئی کے کہنے سے اس کا ترجمہ اردو میں کیا تھا سنہ تصنیف کہیں درج نہیں کتاب کا دیباچہ فارسی میں لکھا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے[۱] مترجم کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سراج عفیف اور ضیاء الدین برنی دونوں کی تاریخوں سے استفادہ کیا ہے لیکن مرتب کا قیاس یہ ہے کہ اس نے شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروزشاہی کو پیش نظر رکھا۔ چنانچہ ذیل کی اقتباس سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

"مصنف اس تواریخ کا مثل شمس سراج عفیف اور ضیاء الدین برنی کے ہم عصر سلطان فیروز تھے۔ اور نظام الدین بخشی گجراتی صاحب طبقات اکبری معروف تاریخ نظامی اور محمد قاسم المعروف بہ فرشتہ کہ غیر عصر فیروز تھے انھوں نے یو لکھا ہے کہ جس وقت سلطان علاؤ الدین خلجی بادشاہ دہلی کا تھا حسب اتفاق زمانہ تغلق اور رجب اور ابوبکر۔ یہ تینوں بھائی ٹھٹھے سے دہلی میں آئے اس صورت میں سلطان علاؤ الدین خلجی نے از راہِ قدر دانی مملکت پنجاب اور لقب غازی الملک کا محمد تغلق کو پیشگاہ خسروانی سے عنایت کیا"۔

اس کتاب کا تذکرہ نثر کی کسی تاریخ میں نہیں ملتا زبان کے انداز سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ ترجمہ فورٹ ولیم کالج سے پہلے کا ہے۔ چنانچہ اس میں ضمیر اشارہ "یہ" کی جگہ "یو" لکھا ہے۔ نیز جملوں کی ساخت پر بھی ابتدائی دور کی فارسی عربی ساخت کا اثر زیادہ ہے۔ ایک مزید ثبوت اس ترجمے کے قدیم ہونے کا یہ ہے کہ اصلی ترجمہ توارد و

---

[۱] ملاحظہ ہو فن تاریخ نمبر (۱۷)

میں ہے لیکن دیباچہ میں فورٹ ولیم کالج کے قبل کی تصانیف کی طرح دیباچہ عنوانات وغیرہ فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے عنوانات کی تفصیل حسب ذیل ہے

فیروز کی تخت نشینی اس کے مصاحب اور غلام ایاز کا حال۔ ایاز کی سرفرازی سلطان کی ایک بزرگ شیخ قطب الدین منور اور دیگر مشائخ اور بزرگوں سے ملاقات۔ خسرو ملک کی سلطان فیروز کو قتل کرنے کی کوشش۔ سلطان کی چنر و آفتاب کی اختراع فیروز آباد کے محل کی تعمیر۔ ہانسی کا سفر۔ شمس الدین کوتوال کا قتل فتوحات ٹھٹھہ کی تسخیر۔ ملتان کا سفر۔ سلطان مصر کا فرمان و خلعت فیروز کے نام۔ رعایا کی دیکھ بھال۔ سیر شکار۔ عادات۔ خصلت۔

سلطان تغلق کے اپنے چھوٹے بھائی رجب کی شادی کے متعلق صلاح و مشورہ کی تفصیل ترجمے میں اس طرح پیش کی گئی ہے۔

سلطان تغلق نے اپنے مشیروں سے فرمایا کہ نسبت چھوٹے بھائی رجب کی بیٹی راجہ دیپال پور سے کرنی چاہی اس وقت اہالیان دولت نے عرض کیا کہ قبلہ عالم بیٹی مہاراجہ رانا مل کی بہت خوبصورت ہے اوسی سے نسبت کیجئے۔ چنانچہ حسب معروضہ مشیروں کے سلطان تغلق نے یہ پیغام راجہ رانا مل کو بھیجا رانا مل نے بسبب خلاف دینی کے انکار کیا سلطان تغلق نے فوراً اس جواب کے حکم فوج کو دیا کہ مستعد جنگ ہوں اور مظفر خاں اعتقاد الملک سعد الملک وغیرہ کو بلوا کر مشورہ کیا آخر یہ صلاح ٹھہری کہ جو عدول حکمی راجہ موصوف نے کی بدیں نظر محصول ایک برس کا بطور جرمانہ کے لیا جائے۔ جب یہ حکم راجہ نے سنا بہت گھبرایا آخر ناچار بموجب ہدایت اپنے مصاحبوں کے چودھری اور نمبردار اور تحصیلدار کو بلوا کر حکم دیا کہ ساکنان وغیرہ سے

زر نقد ایک برس کا پیشگی تحصیل کریں جب یہ حکم ظہور میں آیا ساکنان قصبہ نہایت تنگ ہو کر بھاگنے لگے اور عرصہ تین روز کا گزرا کہ اہلیان راجہ اس ادھر ہر چین میں رہی۔ مگر کوئی کار بن نہ پڑا کہ سلطان نے بہ باعث گذر جانے میعاد مقررہ کے فوج اپنی واسطی لینی زر مستحقہ کے روانہ کی پس بہ سبب تکلیف اور ایذا رسانی طرح طرح کے سواری قبول کرنا پیغام شادی کے اور کوئی تدبیر بن نہ آئی ناچار جبراً و قہراً راجہ رانا مل نے اپنی بیٹی کا نکاح رجب سے کر دیا اور جو پہلے نام اس کا اہلیہ تھا اب لقب اس کا بی بی کدبانو ہوا بعد چند عرصہ کے خدا کی مہربانی سے ساتویں مہینے جب جمعرات کے دن ۷۰۹ھ میں بطن کدبانو سے ملک فیروز پیدا ہوا۔"

تاریخ ہندوستان یہ ایک ضخیم تاریخ ہے جو (۳۶۰) صفحات پر مشتمل ہے جس کا حال ڈاکٹر زور نے اپنے تذکرہ اردو مخطوطات میں لکھا ہے وہ پروفیسر خان شیروانی صدر شعبہ تاریخ کی سند کی بنا پر یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فارسی کتاب "ملخص التواریخ" سے ماخوذ ہے اور فرزند علی حسینی ساکن مونگھیر کی تصنیف ہے جو ۱۱۵۳ھ میں لکھی گئی تھی۔ اس تاریخ میں ۱۱۶۷ھ تک کے واقعات مندرج ہیں اس لیے ڈاکٹر زور نے اس کی تصنیف کا زمانہ ۱۱۹۶ھ سے قبل متعین کیا ہے[۱]

تاریخ کا آغاز امیر تیمور کے زمانے سے ہوتا ہے اور اورنگ زیب کے بعد کے دور انتشار پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ آخری واقعہ جو اردو ترجمہ میں درج ہے وہ ٹیپو سلطان والئی میسور کی انگریزوں سے جنگ ہے جو ۱۱۹۳ھ میں ہوئی تھی اس لحاظ سے مذکورہ سنہ محقق ہو جاتا ہے۔

---

[۱] تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۲۷۰

Hanif Razvi

اس میں دکن اور بنگال کے چھوٹے چھوٹے خود مختار صوبوں کی بھی تاریخ لکھی ہے چنانچہ دکن میں آصف جاہ اور ان کے فرزند ناصر جنگ کے اقتدار پر پہنچنے کا حال بھی اس تاریخ میں موجود ہے۔ آخری حصہ میں مرہٹوں اور حیدرآباد میسور لکھنو بنگالہ دھلی کے وہ حالات درج ہیں جو انگریزوں کے اثر و اقتدار کو ہندوستان میں بڑھانے کا باعث ہوئے تھے۔

انگریزوں اور حیدر علی والی میسور کی لڑائیوں کا حال رمضان ۱۱۹۴ھ تک لکھا ہے۔ چنانچہ ورق ۱۶۸ پر یہ عبارت درج ہے۔

"جرنیل کوٹ تین چار پلٹن لے کر رمضان کے مہینے ۱۱۹۴ھ میں جہاز پر سوار ہو کر مندراج کو روانہ ہوا"

اصلی فارسی تاریخ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے ۱۱۵۳ھ تک کے واقعات پر حاوی ہے لیکن ترجمہ میں جو مزید واقعات دکن بنگال اور میسور کے ملتے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ مترجم نے اس ترجمہ میں اپنی طرف سے اپنے زمانے کے واقعات بھی درج کر دیے ہیں مصنف نے جو واقعات اپنی طرف سے اضافہ کیے ہیں وہ اسی کے زمانے کے واقعات ہیں۔ اس لیے ان حصوں کی حد تک یہ تاریخ نہایت مستند سمجھی جا سکتی ہے۔ مترجم کی زبان سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ شمالی ہند کے کسی شہر کا رہنے والا تھا۔ چنانچہ ترجمہ کی زبان سے اس کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مترجم کے حالات کا کچھ پتہ نہ چل سکا جس کا اعتراف ڈاکٹر زور نے بھی کیا ہے۔ تذکرہ اردو مخطوطات میں اس تاریخ کا جو نام درج ہے وہ اصل نام نہیں نہ مترجم کا دیا ہوا نام ہے بلکہ موضوع کے لحاظ سے مرتب تذکرہ نے یہ نام تجویز کر دیا ہے۔ اس کے مختلف مقامات سے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

لہ تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ

تیمور بادشاہ جس کے خاندان کی سلطنت ہندوستان میں چار سو برس کے قریب رہی جس کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔"

"گورنر بہادر نے ۱۱۹۵ھ میں رجب کے مہینے کلکتہ سے کوچ کیا"

۱۱۹۵ھ میں مرزا نجف علی خاں امیر الامرا کی فوج لاہور کے قریب تک پہنچی اور بہت سی لڑائیاں ہو کر غالب ہوئی۔

حیدر نائک ہی کی فوج غالب ہوئی غرض کہ وہ مندراجہ کے قلعے سے باہر سارے صوبہ اد کاٹ پر غالب ہو گیا۔

اختتام کی عبارت یہ ہے۔

"نادر شاہ کی طرف کے قزلباش صمصام الدولہ اور امیر الامرا پر دوڑ کر لوٹ مار کرنے لگے پانچ چھ گھڑی کے عرصے میں"

افسوس کہ ادارہ ادبیات اردو کا مخطوطہ مکمل نہیں معلوم ہوتا کیونکہ تاریخ یکایک بے موقع ختم ہو جاتی ہے۔

"بہادر نامہ" یا تاریخ سری رنگ پٹم اس دور کی تاریخوں میں بہادر نامہ ایک اہم تاریخ ہے کیونکہ اس طرح کی واضح تاریخیں خاص جنوبی ہند میں لکھی ہوئی بہت کم دستیاب ہوتی ہیں اس تاریخ کا دوسرا نام "تاریخ سری رنگ پٹم" بھی ہے۔ لیکن مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اس کا ذکر بہادر نامہ کے نام سے کیا ہے [۲]

راقم الحروف کو اس کا جو مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں دستیاب ہوا ہے اس اس کا نام "تاریخ سری رنگ پٹم" لکھا ہوا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ دونوں کتابیں ایک ہی ہیں ان کے ایک ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے جو اقتباس

---

[۱] فن تاریخ نمبر (۱۳۲۰)

[۲] ملاحظہ ہو یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۴۔۴

دیا ہے وہ تاریخ سری رنگ پٹم میں موجود ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دونوں ناموں سے موسوم رہی۔

ہاشمی صاحب کے محولہ بالا نسخہ کے علاوہ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ دیوانی ملک وہاں میں بھی محفوظ ہے۔ وہ بھی بہادر نامہ کے نام سے موسوم ہے دفتر دیوانی کا مخطوطہ اور کتب خانہ آصفیہ کا مخطوطے دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی آغاز و اختتام میں کوئی فرق نہیں۔ (اس کتاب کے دوسرے مخطوطوں کے آغاز و اختتام میں کوئی فرق نہیں۔

"بہادر نامہ" میں میسور کی تاریخ لکھی گئی ہے جو کرشنا راجہ سے شروع ہوتی ہے لیکن اس کے اختتام میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ نسخوں میں اختلاف ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنی تصنیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں اس کتاب کے دو نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک برٹش میوزیم اور دوسرا انڈیا آفس کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ "انڈیا آفس" کے کتب خانہ کا نسخہ حیدر علی کے انتقال پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن برٹش میوزم والے نسخہ میں ٹیپو سلطان کے عہد تک کے واقعات شامل ہیں۔ آصفیہ نسخہ بھی ٹیپو سلطان کے انتقال پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کا غالباً سبب یہ ہے کہ انڈیا آفس کے کتب خانہ کا مخطوطہ نامکمل ہے۔ مکمل کتاب ٹیپو سلطان کے عہد پر بھی حاوی ہے اور سلطان کی وفات پر ختم ہوتی ہے جو سنہ ۱۲۱۳ھ کے واقعہ ہے۔

اس لحاظ سے یہ تاریخ ۱۲۱۳ھ میں لکھی گئی تھی۔ مصنف کا نام درج نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "تاریخ سری رنگ پٹم" یا بہادر نامہ کوئی طبع زاد تصنیف نہیں کیونکہ مرتب مقالہ کو اس کا ماخذ فارسی تاریخ کا مخطوطہ بھی دستیاب ہوا ہے۔ جو بعینہ ان تمام حالات پر مشتمل ہے۔ جو اس اردو تاریخ میں ملتے ہیں۔

اس فارسی تاریخ کو سب سے پہلے پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے ایک مضمون

Hanif Razvi

کے ذریعے روشناس کرایا تھا جو "اے مینو سکرپٹ ہسٹری آف میسور" کے عنوان سے میسور یونیورسٹی کے سہ ماہی جرنل میں چھپ چکا ہے[1]۔ یہ فارسی تاریخ ۲۴ ابواب پر مشتمل ہے لیکن اردو ترجمہ میں (۲۲) ابواب ہیں۔ فارسی میں ابتدائی دو باب زاید ہیں

فارسی تاریخ کے مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا لیکن فارسی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کا باشندہ تھا بلکہ زیادہ ترین قیاس یہ ہے کہ وہ میسور ہی کا رہنے والا تھا۔ اس کی فارسی عبارت بہت سقیم ہے۔ اردو تاریخ میں تمام تر وہی واقعات ہیں اور اسی ترتیب سے لکھے گئے ہیں جو فارسی تاریخ میں ملتے ہیں۔ اسی سے قیاس ہوتا ہے کہ اردو تاریخ فارسی کا ترجمہ ہے۔ چنانچہ دونوں کے آغاز کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"کتاب ذکر میں ریاست راجہ سری رنگ پٹن کے اور نواب حیدر علیخاں بہادر جنت مکان اور ٹیپو سلطان شہید بادشاہ غازی ملک کرناٹک نور اللہ مرقدہ کے واسطے اظہار کرنے خاص و عام سلیس عبارت میں تصنیف کیے"۔

فارسی کی اصل تاریخ کے آغاز میں بھی جس کا ترجمہ پروفیسر عبدالقادر سروری نے مذکورہ بالا مضمون میں لکھا ہے یہی عبارت درج ہے[2]۔ اس کا مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے[3]۔

اس کے ابواب کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) بیان کشن راج کا۔

---

[1] ملاحظہ ہو سہ ماہی جرنل میسور یونیورسٹی جلد ۵ حصہ سوم ۱۹۴۴ء

[2] یہ تاریخ محمد ابا سیٹھ کی ملک تھی اور سیٹھ صاحب نے اسے ادارہ ادبیات اردو کو دیا تھا۔

[3] ملاحظہ ہو تذکرہ مخطوطات فارسی جلد سوم صفحہ ۵۵

Hanif Raza

۲۔ نواب حیدرعلی خاں واسطے معیشت روزگار کے عرب سے ہند کے ملک میں آئے سو یہ ہے۔

۳۔ جنگ پانیکار نارائن گوڑ سو کر کے ریاست دیوان ہی کو تسخیر کیا۔

۴۔ بیان لشکر نواب چندا صاحب اور محاصرہ قلعہ ترچناپلی کا۔ محاصرہ سری رنگ پٹم کے راجہ کا ترچناپلی کے قلعے سے

۵۔ بیان حیدرعلی خاں بہادر کے طالع یاوری کیے سو۔ اس میں ان کی سری رنگ پٹن کے تخت کے حصول کا حال لکھا ہے کہ کس طرح راجہ نے انہیں اپنا وزیر بنایا راجہ کے وفات کے بعد کوئی اور دعویدار نہ رہا۔ تو یہ بادشاہ ہوگئے، کیونکہ وریرنا گوشہ نشین ہوگیا اور کراجوری نندراج نے بھی ان کی حکومت تسلیم کرلی۔

۶۔ بیان شرارت میں گنڈی راؤ کے اور فساد برپا ہونے درمیان نواب اور نندراج کے

۷۔ بیان گنڈی راؤ نمک حرامی نواب سے لڑکر اور باغی ہو کر پٹن کی ریاست لینے دغا سے تدبیر کیا سو۔

۸۔ بیان نواب جنگ کرنے نمک حرام سے تیار ہوا سو۔

۹۔ جنگ پالیگر سے چھوٹے بالاپور کے اور ارادہ تسخیر کرنے مکان مذکور میں

۱۰۔ بیان تسخیر کیے سو جب نواب بالاپور۔

(اس کے بعد بدنور کے راجہ کے ایک کمسن رشتہ دار راجہ غیبو کا حال ہے جس نے بدنور کی حالت گوش گزار کی۔ جہاں راجہ کی وفات کے بعد اس کی رانی تخت نشین تھی اور جس کے اپنے غلام سے ناجائز تعلقات تھے اور احکام سلطنت سے بے پرواہ تھی آخر انہوں نے حملہ کیا اسے فتح کیا رانی کو قید کیا اور حیدر نگر نام رکھا۔

۱۱۔ بہ بیان کوی کوٹ (کالی کٹ) وغیرہ تسخیر کیے سو۔

۱۲۔ بہ بیان جنگم پہ انگریز بہادر سے جنگ ہوا سو۔

۱۳- بیان جنگ چرکوئی (یہ بیان چرکوئی کے جنگ کا ہے۔

۱۴- یہ بیان بہار کے تین تسخیر کرکے اور لبالت جنگ کپتان تنبیہ کرکے وار زاد دے گئی لیا سو۔

۱۵- بیان تسخیر چیتل درگ برما سے جنگ کرکے فتح کیا اور نواب حلیم خاں گڑپے والے سے فتح کرکے خان مذکور کو اسیر کیا اور ابراہیم خاں دھونے پر فتح کیا سو

۱۶- کیفیت حضرت سلطان اور مندولت باپ کے پٹنا اور لینا نگر اور کوڑیال انگریز بہادر سے اور لینی ہونا آیا ز حضرت ٹیپو سلطان سے اور صلح ہونا اس وقت اور پھر لینا ملک کٹرک کا اور وہاں سالیانہ مقرر کرنا اور بازگشت ہونا۔

۱۷- کیفیت قلعہ ادھونی کا حضرت ٹیپو سلطان اور وہاں جنگ کرنا مرہٹے سے اور نظام علی خاں سے۔

۱۸- کیفیت حضرت سلطان دربیان ملک کالی کٹ کے تشریف فرمانا اور قصد کرنا جنگ کا طرف ملک کوچی کے اور شکست کھا کر واپس ہونا اور دوسری دفعہ قصد کرنے اس مکان کے اور انگریز بہادر اس طرف آنے کا۔

۱۹- کیفیت حضرت سلطان جنگ کرنا ستی منگل پر انگریز بہادر سے اور شہید ہونا برہان الدین اور قلعہ لینا بنگلور کا انگریز بہادر سے۔

۲۰- کیفیت لشکر انگریز کا سری رنگ پٹن کے تئیں آنے اور روبرو واپس ہو کر جانا۔

۲۱- کیفیت لشکر انگریز قلعہ لینا نندی درگ کا اور کمک کرنے فرزند نظام علیخاں انگریز کے تئیں بعد کے ایک دو روز کے

۲۲- کیفیت حضرت سلطان فرانس کپتان اور ناموافق ہونے درمیان انگریز کے اور سلطان کے اور سری رنگ پٹن قلعہ لینا اور درنسبت ملک لینا جنرل ہارس صاحب۔

اس کے بعد مصنف لکھتا ہے۔

Hanif Razvi

راجہ کشن راج سری رنگ پٹن کا بادشاہ تھا کراچوزی نندراج اور دیوراج دو بھائی اس کے مشیر خاص تھے۔ فوج ریاست بہت تھی واسطے طلب و تنخواہ کے آمدنی ملک کی کفایت نہ کرتی تھی۔ اس لیے اس نے ان مشیروں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے ماکڑی کے زمین دار پر حملہ کرنے اور باج لینے کا مشورہ دیا۔"

حیدر علی خاں کی آمد اور ان کے اوصاف کا بیان یوں لکھتا ہے۔

جب بزرگان نواب حیدر علی خان کے ملک عرب سے بیجاپور کو آئے اور کتنے ایک دن پیچھے بادشاہ بیجاپور کی سرکار میں نوکر ہوئے لیکن اس وقت یہ عمدہ اور معتبر سردار تھے اور ان کی تابعداری میں بہت لوگ تھے۔ اس باعث اطراف کے ملکوں پر نام آوری اور بزرگی سے مشہور تھے۔ یہ آپس میں تین بھائی تھے یعنی محمد فتح اللہ غلام حیدر اور غلام علی۔ بڑے جوانمرد عقلمند تھے اپنی دانائی و باہوشی کے سبب سے بادشاہ کے دربار میں بہت مرتبہ اور بزرگی پیدا کیے اور کئی برس تک اس طرح اپنے اپنے کام پر مشغول و سرگرم تھے۔"

اس تاریخ کے مترجم کا بھی نام پردہ خفا میں ہے۔ لیکن سنہ تصنیف کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۲۱۴ھ سے قبل کی ہے۔

سیر: تواریخ کے علاوہ اس عہد میں سیر پر بھی کتابیں لکھی گئیں اور اس صنف ادب میں سب سے زیادہ نمایاں محمد باقر آگاہ کے کارنامے ہیں۔ باقر آگاہ کئی اعتبار سے اپنے زمانے کی ممتاز شخصیت ہیں۔ اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی تحریریں ادبی اعتبار سے گیارہویں صدی کے نثری شاہکاروں میں شمار کی جاسکتی ہیں باقر آگاہ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نظم و نثر دونوں میں اپنے کارنامے چھوڑے۔ اس لیے ان کی عظمت کے اکثر مصنفین اردو معترف ہیں چنانچہ

ڈاکٹر زور ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

> آگاہ اردو کے بڑے محسنوں میں سے ہیں انھیں نظم و نثر دونوں پر قابو تھا۔ غزل قصیدہ مثنوی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی واقعہ یہ ہے کہ دکھنی علم و فضل اور شعر و سخن ان پر ختم ہوگیا۔ ان کے بعد جنوبی ہند میں اتنا بڑا ادیب و شاعر پیدا نہ ہوسکا[1]۔

پروفیسر سروری نے فہرست مخطوطات کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں ان کے متعلق جو نوٹ لکھا ہے اس میں ان کی عربی فارسی اردو تینوں تصنیفات کا ذکر کیا ہے اور ان کی تصانیف کی تعداد (۳۰۳) بتائی ہے[2] جس سے ہاشمی صاحب نے اتفاق کیا ہے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے بڑی تحقیق سے آگاہ کے حالات سے اردو دنیا کو روشناس کروایا جو خود بھی آگاہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہ بڑی حد تک مستند ہیں۔ ہاشمی صاحب آگاہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> آگاہ اردو زبان کی تنقید اور تاریخ ادب کے موجد قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے پہلے پہل تاریخ زبان اردو اور تنقید زبان اردو کے متعلق اپنی کتابوں میں اظہار خیال کیا[3]

حالات زندگی

باقر آگاہ کے حالات بہت کچھ روشنی میں آچکے ہیں ان کے اجداد بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ والد محمد مرتضیٰ عادل شاہی حکومت کے زوال کے بعد مدراس گئے آگاہ ویلور میں سنہ ۱۱۵۸ھ میں تولد ہوے۔ ان کے سنہ ولادت کے بارے میں اختلافات ہیں ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری نے ان کا سنہ ولادت سنہ ۱۱۸۱ھ تحریر کیا ہے۔ لیکن مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی سنہ ولادت

---

[1]. تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۷۰

[2]. فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ ۱۸

[3]. وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ زیر طبع

Hanif Raza

۱۱۵۸ھ لکھتے ہیں۔ یہی قرین قیاس نظر آتا ہے کیونکہ سنہ ۱۱۸۴ھ میں آگاہ نے اپنی تصنیف "ہشت بہشت" ختم کی تھی۔ چنانچہ زور صاحب نے اس سنہ کو ثبت نیت سنہ تصنیف مانا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے پھر اسی سنہ کو سنہ ولادت قرار دیا ہے۔

آگاہ نے ابتدائی تعلیم چچا سے پائی پھر شاہ ابوالحسن قربی سے فیض باطنی حاصل کیا۔ تعلیم کی تکمیل مولوی ولی اللہ کے پاس کی ولی اللہ مدراس کے عالموں میں شمار کئے جاتے تھے۔ آگاہ نے پندرہ سال کی عمر ہی سے فکر سخن کرنا شروع کیا چنانچہ اپنی تصنیف "ریاض الجنان" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

> بوجہ لے بھائی یہ عاصی پندرھویں سال سے شعر کے سات الفت و ارتباط رکھتا ہے۔ اگرچہ شعر کم کہا تھا اس واسطے تخلص اپنا مدت تک مقرر نہیں کیا تھا۔

سترہ سال کی عمر میں اپنے استاد حضرت قربی کی مدح میں قصیدہ لکھکر پیش کیا اس کے چند ہی روز بعد ان کے علم و فضل کی شہرت چہار طرف پھیل گئی۔ کرناٹک کے نواب والاجاہ نے ان کو اپنے بیٹوں امیر الامرا اور عمدۃ الامرا کا اتالیق مقرر کیا اور اوراپیور کی جاگیر عنایت کی اس کے بعد اپنا معتمد خاص بنایا۔ نواب والاجاہ ان کی بڑی عزت و قدر کرتے تھے سنہ ۱۲۲۰ھ میں آگاہ کا انتقال ہوا۔ محمد غوث شرف الملک نے جو بڑے فقیہہ اور محدث تھے "قدمات فرد العصر" سے "تاریخ وفات نکالی۔

تصانیف ان کی تصانیف (۴۳) بیان کی جاتی ہیں ان میں سے سولہ یا سترہ اردو میں ہیں۔ پروفیسر سروری نے ان کی تصانیف کی تعداد (۱۴) بتائی ہے[1]۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ ۱۸

(۱) ہشت بہشت (۲) تحفۃ الاحباب (۳) تحفۃ النساء (۴) فواید درفواید
(۵) ریاض الجنان (۶) محبوب القلوب (۷) روضۃ السلام (۸) گلزار عشق
(۹) قصہ رضوان شاہ (۱۰) روح افزا (۱۱) خمسہ متحیرہ (۱۲) مثنوی
روپ سنگھار (۱۳) دیوان اردو (۱۴) عقاید نامہ یا عقاید باقر آگاہ۔

مولوی نصیرالدین ہاشمی نے باقر آگاہ کی (۱۷) اردو تصانیف بتائی ہیں۔

ہاشمی صاحب اور زور صاحب نے آگاہ کی تصانیف میں قصہ رضوان شاہ اور روح افزا کا کہیں نام نہیں لکھا۔ البتہ "مثنوی گلزار عشق" میں ہیرو اور ہیروئن کے نام رضوان شاہ اور روح افزا بتائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ان کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ عقاید نامہ (۲) تحفۃ النساء (۳) ہشت بہشت (۴) ریاض الجنان
(۵) محبوب القلوب (۶) حاشیہ من درپن (۷) تحفہ احباب (۸) معراج نامہ
(۹) ہدایت نامہ (۱۰) گلزار عشق (۱۱) روپ سنگھار (۱۲) دیوان آگاہ
(۱۳) روضۃ الاسلام (۱۴) فواید در عقاید[1] (۱۵) ریاض السیر (۱۶) خمسہ متحیرہ
(۱۷) فرقہ ہائے اسلام

ہاشمی صاحب نے بھی مندرجہ بالا کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ لیکن انھوں نے صرف سولہ کا ذکر کیا ہے۔ حاشیہ من درپن کا تذکرہ ہاشمی صاحب نے نہیں کیا۔ چونکہ ہشت بہشت کے ساتویں حصہ کا نام من درپن ہے اس لیے ممکن ہے انھوں نے ہشت بہشت کا جز سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا ہو۔ حالانکہ "من درپن" اضافہ کے بعد ایک دوسری تصنیف سمجھی جا سکتی ہے اس میں بقول مصنف "قرآن کا اعجاز" یعنی قرآن کی خصوصیات اور صفات بیان کی گئی ہیں۔

---

[1] اس کا نام پروفیسر سروری اور مولوی نصیرالدین ہاشمی نے فواید در فواید تحریر کیا ہے

Hanif Razvi

ابتدائی چار ابیات سے جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں کتاب کی وجہ تالیف معلوم ہوتی ہے جو یہ ہیں

پس از حمد خدا و نعت مختار + سن اس مضمون کو گوش دل سے اے یار
کہ من درپن میں بولا میں با ایجاز + باآئین ہمیں قرآن کا اعجاز
جب اس کو مختصر تو کر دیا ہوں + کئی جا میں اشارت کر گیا ہوں
یہ نظم صاف کے تئیں اب کیا میں + بطور حاشیہ اب یہ لکھا میں

ڈاکٹر زور مندرجہ ابیات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ من درپن ہشت بہشت کا ساتواں اور ضخیم ترین رسالہ ہونے کے باوجود مصنف کی نظر میں مختصر تھا اس لیے اس نے حاشیہ لکھنے کی زحمت گوارا کی۔

اس حاشیۂ من درپن کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ آگاہ کی مندرجہ بالا سترہ تصانیف میں صرف ایک کتاب "ریاض السیر" جو آں حضرت کی سیرت کے متعلق ہے۔ نثر میں ہے بقیہ سب تصانیف منظوم ہیں۔ لیکن ان منظوم تصانیف میں اکثر کے دیباچے نثر میں لکھے گئے ہیں جن کے دیباچے نثر میں ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ریاض الجنان۔ (۲) دیوان شعر۔ (۳) ہشت بہشت۔
(۴) محبوب القلوب۔ (۵) تحفۂ احباب۔ (۶) فواید در قواعد۔
(۷) گلزار عشق۔

(۱) "ریاض الجنان" یہ ایک مثنوی ہے جو مناقب اہل بیت نبی میں لکھی گئی ہے اس کے دیباچہ میں مصنف نے اس کے ماخذوں کی تفصیل دی ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ ایسی کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ مصنف کے خیال میں اہل بیت کرام کے فضائل و مصائب کے بیان میں ولی ویلوری روضۃ الشہدا اور نوازش علی شیدا کی روضۃ " تاریخی لحاظ سے ناقص تھیں اس لیے انھوں نے یہ کتاب لکھی۔ اس

Hanif Razvi

دیباچہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ذیل میں اس دیباچہ کا وہ اقتباس دیا جاتا ہے جس میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں۔

"برج لے بھائی یہ عاصی پندرہویں سال سے شعر کے ساتھ الفت و ارتباط رکھتا ہے۔ اگرچہ شعر کم کہا تھا اسی واسطے تخلص اپنا مدت تک مقرر نہیں کیا تھا جب سنہ ۱۱۸۴ھ اور سنہ ۱۱۸۵ھ میں یعنی رسائل ہشت بہشت کے منظوم کیا لفظ باقر کہ جز نام ہی بجائے تخلص رکھا۔ من بعد بیچ سنہ ۱۱۹۴ھ ایک ہزار ایک سو نود اور چہار کی وقت نظم ترقی دیوان عربی کے تخلص اپنا آگاہ مقرر کیا اس تخلص کو اشعار عربی نہ فارسی میں لایا اور اکثر مراثی اور ریختوں میں بھی اس تخلص کو اختیار کیا اور تتمہ رسائل "ہشت بہشت" ہیں کہ بیچ سنہ ۱۱۲۶ کے منظوم ہوئی اور بیچ کتاب محبوب القلوب کے بیچ اوائل سنہ ۱۱۲۷ھ کے منظوم ہوے اور اس رسالے میں کہ ریاض الجنان نام رکھتا ہے تخلص اپنا وہی لفظ باقر رکھا۔ کیا واسطے کہ رسائل اول کی جا بجا مشہور ہوے تھے اگر بعد ہوئی سو رسالوں میں تخلص آگاہ لاتا تو دو تخلص ہوتے اس واسطے وہی تخلص بحال رکھا تا سب مثنویات دکھنی میں ایک تخلص رہے"۔

ہشت بہشت کا موضوع "ریاض سیر" کی طرح "سیرت نبی" ہے۔ ریاض السیر نثر میں ہے ہشت بہشت نظم میں جو آٹھ حصوں میں مشتمل ہے

(۱) من دینک (نور نبوی کے حال میں) (۲) من ہون (ولادت بشارتوں کے بیان میں) (۳) من موہن۔ آنحضرت کے حسن کے معجزات کے بیان میں (۴) جگ موہن۔ حالات زندگی (۵) آرام شمائل و اخلاق (۶) راحت جاں خصائص کے (۷) من درپن جملہ معجزے (۸) من جیون آنحضرت صلعم کے روضہ کی زیارت، آپ پر درود کے فضائل وغیرہ کی تفصیل دی گئی ہے

Hanif Raza

ابتدا میں ۵ صفحات کا دیباچہ ہے پھر ہر فصل کے آغاز پر ایک مختصر دیباچہ شامل ہے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے

چھٹے رسالے اول کے مع رسالہ عقاید و تحفۃ النساء سنہ ایک ہزار ایک سو اسی اور پانچ میں اور سنہ ۱۱۸۶ھ میں بنے ہیں پیچھے اس کے بہت ڈھیل ہوئی گیا واسطے کہ ایک رفیق با توفیق و جلیس انیس کہ ان رسالوں کا طالب اور ایسے خیر کے کاموں پر راغب تھا سو رحلت کیا۔ حق تعالیٰ اس پر رحمت کرے اور اسے اپنی مغفرت سے نوازے اور بہت موانع بھی پیش ہوئے۔ ہر چند اس اثنا میں بعض دوستاں واسطے دوسرے رسالوں کے بولے ہیں اتفاق ان کے بنانے کا نہیں ہوا۔ آخراب سنہ ایک ہزار اور دو سو اور چھ میں رسالہ من و ہن اور من جیوں بنانے کا اتفاق ہوا اور رسالہ آرام دل میں بیان عادات شریعت کا اور رسالہ راحت جان میں بیان اکثر خصائص امت کا اور رسالہ جگ موہن میں حضرت کی نبوت سے تا وفات اون کی تاوفات صلی اللہ علیہ وسلم داخل کیا گیا۔ ان آٹھ رسائل میں تخمیناً (۸۶ ۵۶) بیت ہیں اندر جیوں کے ساتھ نو ہزار بیت ہوویگے ان سب رسالوں میں شاعری تیش کہا ہوں بلکہ صاف و سادہ کہا ہوں اور اردو کی بہا کا میں نہیں کیا کس واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بہا کا سے واقف نہیں ہیں لے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہے کر کر سہل اور سرسری بخان کیا واسطے کہ بڑے معتبر کتب سے تحقیق کر کے لکھا ہوں"۔

اس کے علاوہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ہر حصے کے آغاز پر بھی نثر میں موضوع کے متعلق تشریح کی ہے جیسے پہلے رسالے میں من دینگ کے آغاز میں دیباچہ میں یوں

لکھا ہے۔

رسالہ اول کا نام من دینک ہے - اس رسالہ میں حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مقدس کا ذکر ہے۔ یعنی حق سبحانہ اس نورِ مقدس کوں سب موجودات کے اول پیدا کیا اور اس کے طفیل سے سب علویات وسفلیات کوں ہویدا کیا اور اس نور اشرف کوں ہر پشت پاک سے ہر شکم پاک میں نقل کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ نورِ لطیف حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ میں آیا"

تیسرے رسالہ "من موہن" کے آغاز کی دیباچہ عمومی میں اس طرح وضاحت کی ہے۔

اس رسالہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا بیان ہے یعنی جو معجزات کہ مدت حمل اور ولادت اور دودھ چھڑائی اور خرد سال میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہوئے اس حد تک کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آٹھ برس کی عمر ہوئی ہے"

آگاہ کی اس تصنیف کے مخطوطے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کتب خانہ آصفیہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو اور کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کا مخطوطہ ناقص الاول ہے۔

دیوان دیباچہ میں اصناف شاعری اور زبان اردو پر بحث کی گئی ہے۔ غالباً اسی بنا پر پروفیسر عبدالقادر سروری اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"موضوع کے اعتبار سے دیباچہ نہایت اہم جزو دیوان ہے"

گلزار عشق عرف قصے رضوان شاہ و روح افزاء

آگاہ کی اس مثنوی کا مخطوطہ اکسفورڈ کی باڈلین لائبریری میں محفوظ ہے۔ حیدرآباد کے کسی کتب خانہ میں اس کا مخطوطہ نہیں ملتا اس کتاب کا آغاز ۱۲۱۰ھ میں ہوا تھا اور ۱۲۱۱ھ میں مکمل ہوئی لیکن اس مثنوی کے آغاز میں آگاہ نے جو دیباچہ

نثر میں لکھا ہے وہ خاصہ اہم ہے۔ اس میں انہوں نے دکھنی کی اہمیت اور اس کا ماخذ بتایا ہے۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات سے اس کا کچھ انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ قصہ ہے اور سیر میں شامل نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ باقر آگاہ کی تصانیف کا حال لکھا گیا ہے اور یہ دیباچہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیئے اس کا کچھ اقتباس نیچے دیا جاتا ہے۔

مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان بمعنی وہرزہ درایان لایعنی زبان دکھنی پر اعتراض اور گلشن عشق و علی نامہ کے پڑھنے سے احتراز کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کے قائم تھے زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج اور طعن شماتت سے سالم تھی اکثر شعرا وہاں کے مثل نشاطی و ذوقی۔ وشوقی و خوشنود۔ غواصی۔ فوقی۔ ہاشمی شغلی بحری نصرتی مہتاب وغیرہم کے بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصاید و غزلیات و مثنویات و مقطعات نظم کئے اور داد سخنوری کا دیئے۔ لیکن نصرتی ملک الشعرا اور تنگ نظری سے مبرا ہے جب شاہان ہند اس جنت نظیر کو تسخیر کیے طرز روزمرہ دکھنی بہج محاورہ ہندی سے تبدیل پانے لگے تاآنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی۔ اور ہندوستان میں مدت تک زبان ہندی کے رو سے برج بھاکا بولتے ہیں رواج رکھتی تھی۔ اگرچہ لغت سنسکرت ان کی اصل اصول اور مخرج فنون فروع و اصول ہے۔ پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص کو اوس کے کھونے لگے سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمی ہوئی۔ جیسا ثنائی و ظہوری نظم و نثر فارسی میں باقی طرز جدید کی ہوئی ہیں۔ ولی گجراتی غزل ریختہ

Hanif Razvi

کی ایجادیں سبہوں کا مبتدا اور استاد ہے۔ بعد اوس کی جو سخن سنجان ہند بروئے گیے بے شبہ اس نہج کو اوس سے لیے اور من بعد اوس کو با اسلوب خاص مخصوص کر دیے اور اوسے اردو کے بھاکا سے موسوم کیے اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کی جیسا شاہ جہاں آباد و لکھنؤ و اکبر آباد وغیرہ رواج تمام پایا اور جوں جا ہی بہوں کی من بھایا اور اخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تلک اس فن اکثر مشاہیر شعرا عرصہ میں آئے اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے ہیں۔ مثل درد، مظہر، فغاں، دردمند، یقین، سوزان، ابر، آرزو، سودا، تاباں وغیرہم لیکن ان سبہوں سے کوئی بھی مثنوی معتد بہی نہیں کہا فقط قصاید۔ غزلیات و مقطعات پر اکتفا کیا بارے اس عصر میں حسن دہلوی ایک مثنوی مختصر لکھا دریافت اوس کی معتبر مصنف پر موقوف رکھنا اولی ہے برخلاف شعرائے دکن کے کہ اکثر مثنویات کہی ہیں بالاتفاق غزل بولنا آسان اور مثنوی کا کہنا دشوار و گراں ہے اس لیے ملک الشعرائے دکن بطور تعریض کہتا ہے۔

دس پانچ بیاں کہ کئی شوقی اگر تو کیا ہوا
معلوم ہوتا شعر اگر کہتی تو اس بسار کا

اور بوجھ اے بھائی کہ ان سب شعرا میں بعض فقط شاعر ہیں اور عشق و عرفاں میں بھی ماہر ہیں مثل مولانا شاہ ندیم اللہ ندیم تخلص و قاتی شیخ محمود بحری تخلص صاحب من لگن شعرائے دکن سے اور مرزا مظہر جان جاناں و خواجہ میر درد شعرا ہوئے۔"

باقر آگاہ کے زمانے تک اردو کے ادبی معیار قائم ہونے لگے تھے اور وہ اس نئے معیار کو اختیار کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تاہم دکھنی کے متروک ہونے کے باوجود وہ اثر سے بچ نہیں سکتے۔ یہ فطری بات تھی اس کا اعتراف انھوں نے ذیل میں نہایت

ہی صداقت کے ساتھ کیا ہے۔ ایک بات جو خاص طور پر توجہ کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ باقر آگاہ کو دکھنی کے اردو سے پہلے کے متروک روپ ہونے کا احساس تھا ان کے عہد کے دوسرے مصنف مثلاً قاضی بدرالدولہ جن کا ذکر آگے آئے گا ہندی اور دکھنی کو مترادف معنوں میں استعمال کرتے ہیں آگاہ کے دیباچے کا اقتباس حسب ذیل ہے

تاریخ ہجرت باہ جاہ و جلال کے ۱۲۱۱ھ ایک ہزار دو سو گیارہواں سال ہے۔ قصہ رضوان شاہ اور روح افزا کا پسند کرکے اوسے نظم کیا۔ جب قدیم دکھنی اوس سبب سے کہ اگر مرقوم ہوا اس عصر میں رائج نہیں ہے۔ اوسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف و شستہ کو قریب روزمرہ اردو کے ہے اختیار کیا اور صرف اس بہا کا میں لینے سے دو چیز مانع ہوئی۔ اول یہ کہ تاثیر وطن یعنی دکن اوس میں باقی ہے کیا واسطے کہ اجداد پدری و مادری اس عاصی کے اور سب قوم اوس کی بیجاپوری ہیں دوسرے یہ کہ بعضے اوضاع اوس محاورہ کے میرے دل میں نہیں بھاتے ازاں جملہ یہ کہ تذکیر و تانیث فعل نزدیک اہل دکن کے تابع فاعل ہے۔ اگر یہ مذکر ہے تو وہ بھی مذکر ہے۔ اور اگر مونث ہے تو مونث یہ قاعدہ موافق عربی کے سنہ السنہ ہے"[1]

فرائد در فوائد اس مثنوی میں قرآن مجید کی شان نزول اس کے فضائل سورتوں کی تعداد اقسام وحی۔ کیفیت وحی وغیرہ باتیں بتائی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ بھی نثر میں ہے جس میں کتاب کا نام سبب تالیف اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کتاب کے ماخذ اور مشمولات کی فہرست بھی لکھی ہے۔ ان میں سے ایک تو نورالدین علی کی عربی تصنیف "حجتہ الاسرار" ہے دوسری فارسی "محبوب المعانی"

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۴۵۶

سید محمد صادق قادری اورنگ آبادی کی تصنیف ہے۔ کتاب کا نام اس طرح بتایا ہے۔

بعد حمد و نعت کے کہتا ہے محمد باقر شافعی قادری ابلوری کان اللہ
ختم بالصالحات عملہ کہ اس رسالہ کا نام "فواید در قواید" ہے ہر فایدہ
اس کا وردانہ بے مول اور خراج ملک کا ہم تول ہے۔ ہندی زبان
میں ہے کر کرا و سے سرسری نہ جان"۔

محبوب القلوب یہ طویل مثنوی حضرت محبوب سبحانی کے حالات میں لکھی گئی ہے اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کو "اصل" سے موسوم کیا گیا ہے یہ ہر باب میں عنوانات کی ذیلی تفہیم بھی ہے۔ یعنی ہر اصل میں کئی کئی "جلوے" اور فصلیں ہیں ان سب کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے۔

جیسا لکھا جا چکا ہے اس کا دیباچہ بھی نثر میں ہے اس دیباچہ کا ابتدائی حصّہ یہ ہے۔

"بعد حمد و نعت کے محمد باقر آگاہ شافعی قادری ویلوری توفیق دیوے
روے حق سبحانہ تعالیٰ کہتا ہے کہ مناقب حضرت محبوب سبحانی کے علی جدٗ
بے حساب ہیں اس مناقب شریعت کو علما اور اولیا چار قسم پر کیے ہیں"

"محبوب القلوب" مخطوطے کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو و کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہیں۔ ادارہ کا مخطوطہ ناقص الاول ہے۔ یعنی اس کے آغاز میں دیباچہ نثر غایب ہے۔ دوسرے کتب خانوں کے نسخے مکمل ہیں۔

تحفۃ الاحباب اس مثنوی میں آنحضرت کے اصحاب کی فضیلت کا بیان ہے۔ اس میں کل پندرہ باب ہیں اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ اصحاب میں پہلے چار اصحاب کرام اس کے بعد دوسرے صحابہ جیسے حضرت حمزہ حضرت عباس حضرت سعد حضرت عبدالرحمن وغیرہ کے حالات لکھے گئے ہیں اس دیباچہ کا اقتباس درج ذیل ہے۔

Hanif Raza

بعد حمد و نعت و منقبت کے کہتا ہے محمد باقر آگاہ شافعی قادری بیجاپوری ویلوری توفیق دیوے اسے اللہ تعالیٰ کہ حقوق اصحاب کرام کے رضی اللہ عنہ تمام امت پر حد سے بہار ہیں۔ سب پر فرض ہے کہ آنحضرت کے ساتھ صدق دل سے محبت رکھیں اور ہمیشہ ان کے سپاس گذار رہیں۔ کس واسطے کہ وہ رہنمایان دین حضرت سید المرسلین کے ہیں۔

ان مثنوی کے مخطوطے برٹش میوزیم۔ کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔

ریاض السیر تصانیف سیر کے صرف دیباچے نثر میں تھے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ان کی ایک تصنیف نثر میں ملی ہے جس کا موضوع ہشت بہشت کی طرح آنحضرت کی سیرت ہے۔ ریاض السیر[1] کے اکثر حصے عربی کتابوں سے ماخوذ اور مترجم ہیں اس کا اندازہ ذیل کی عبارت سے ہوسکیگا جس میں جملوں کی ساخت پر عربی کا اثر غالب ہے عام طور پر آگاہ کا یہ انداز نہیں یہ حصہ جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے آنحضرت کی ولادت کے بیان میں ہے لکھتے ہیں۔

جب حمل آمنہ کا دو ماہیہ ہوا بقول مشہور وفات پائی والد ماجد آنحضرت کی کہ عبد اللہ نام رکھتی ہے جب گذری چھ مہینہ حمل شریف حضرت کی سی پہر دیکھا والدہ شریفہ حضرت کی نے خواب میں فرشتہ کو کہ کہتا ہے ای آمنہ بشارۃ پہونچی کہ حاملہ ہوئی ساتھ حامل تو اے دین خیر العالمین کے جب کہ وہ پیدا ہوں تو نام محمد رکھیو روایت ہے ابو نعیم نے ابن عباس سے جب کہ نو مہینے حمل شریف کے

---

[1] مخطوطہ نمبر ۳۵ کتب خانہ آصفیہ فن سیر مخطوطہ ۱۲۰۸ھ

منقطع ہوئے آسیہ اور مریم شب تولد حوروں کو لیکر حاضر ہوئے
بارھویں تاریخ ربیع الاول کے روز دوشنبہ کا تھا وقت فجر کے یا
تیسری یا آٹھویں یا دسویں ربیع الاول کے اس مہر سپہر نبوت ماہ سیمار
سالہ نے مطالع فلک سعادت سی نور شہود دکھایا اور قدوم میمنت
لزوم برج حمل سے بار لاکر نور ظہور اپنی سی زمین و زماں کو شرف کیا
ہے. غلط کیے اگر پیدا وہ مہ پارا ہوا. ماہ شرمندہ ہوا جلوہ کر بارا ہوا
یہاں سامان مولود شریف کو چاہیئے کہ حضرت پر صلواۃ بھیجیں واسطے
تعظیم سرو چمن جلالت کی یارب اس روح معظم پر کرانبار مدام بہ
نہایت صلوات اور تحیات وسلام و مرحبا کہ ایسا ماہ خوش نما
مطلع غیب سے طلوع ہوا اور ایسا آفتاب جہاں تاب افق بے عیب سے
طلوع ہوا اور ایسا آفتاب جہاں تاب افق بے عیب سے شیوع
ہوا ظلمات کو اور عصیاں کے ساتھ شعلہ احسان نور اسلام ایمان کے
لیوے اور کدورت اور جہاں کے ساتھ شعلہ احسان عرفاں کے مشتعل ہوئے۔

ولادت کے یہ حالات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

آپ نے جیسا یہاں قدم رنجہ کیا اپنی چہرے سی طلوع یک مہ کیا
دفع کی ظلمت کدورت یہ کہ وہ سب کا سب جھلائی دفتر تہہ
کیا تخت فلک الافلاک سے نقطہ مرکز خاک تک اور سطح عرش بریں
سے تحت فرش تک نام تاریکی کا باقی نہ رہا کیونکہ وہ ماہ میں کب
بہ نور رہے۔ اور ہے کچھ یہ شان ہے اور ہے کچھ ظہور رہے جتنے جن
اور شیاطین تھے آسمان پر جانے سے باز آئے اور ستارے زمین
سے ان سے نزدیک دکھائی دیتے تھے گویا زمیں پر کوی بالکل ایتی
حرم کے روشن ہوئی اور آگ اہل فارس کی ہزار برس سے جلتے تھے

Hanif Razvi

کرے اور اہل فارس مشک و عنبر اس میں ڈال پوجتے تھے ۔بجھ
گئے ۔ نور فزا شمع عرب کیا ہوئی آتشی فارس وہیں مردہ ہوئے ۔جس
گھڑی حضرت نے اس گلزار گلشن برائے عالم ارواح سے اس چار بازار
اشیاح میں کدورپہلے سجدہ کیا بعد اس کے انگشت شہادت آسمان
کے طرف اٹھائی اور سر مبارک کو اٹھا کر فرمایا لا الٰہ الّا اللّٰہ انی
رسول اللّٰہ عبدالمطلب اور بولہب نے اس مژدہ جان بخش کو
سُن کر بہت شادی کئے ۔ ابولہب نے اس مژدہ مانویہ نام اپنی لونڈی
کو کہ اس نے خبر تولد شریف حضرت کے روسے بیچا ہے ۔ آزاد کیا
اوسی خوشی کا یہ سبب ہے کہ ابی لہب کو ہر دوشنبہ کو تخفیف
عذاب کے ہوتی ہے اور شب ولادت حضرت کی سی تا تین روز کعبہ
معظمہ فرحت اور سرور قدم میمنت لزوم حضرت کی سی ملتا رہا ۔
ان نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگاہ کی تصانیف کا بڑا مقصد کم پڑھے
لکھے لوگوں اور بالخصوص عورتوں کو علوم دین سے آگاہ کرنا ہے ۔ اور اس کے لیے
انھوں نے مذہبی بزرگوں کے حالات زندگی رقم کرنے پر زیادہ زور دیا ۔ چنانچہ اپنے
مقصد کو ہشت بہشت میں اس طرح واضح کیا ہے ۔

"بعض علما متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے
ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ۔ ان سے فایدہ پاویں لیکن
اکثر عورتاں اور امیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں ۔ اس لیے
یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکھنی رسالوں
میں بولا ہے"۔

پھر اسی میں بیان کرتے ہیں ۔

دکھنی میں کہا ہوں اسلیئے میں + تا ہوئے سمجھ عوام کے تیئں

تا سر برامیاں صورعورات + ہوئے ستی اسکے یاویں لذات

اسی نام کی یعنی "ریاض السیر" ایک اور تصنیف کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے جو منظوم ہے اور اس کے مصنف نوایط خاندان ہی کے ایک بزرگ غلام محمود حسرت ہیں۔ اس میں بھی ابوالحسن ثانی کی مدح کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اگاہ کی تصنیف کو حسرت نے منظوم کیا۔ اس کا ایک اور مخطوطہ مجھے درگاہ ہاشم پیر کے سجادے جناب مصطفے حسینی کے کتب خانہ میں بھی دستیاب ہوا۔

بدرالدولہ اس عصر کے سیرت نگاروں میں دوسرا نام جو ہم کو ملتا ہے وہ قاضی بدرالدولہ کا ہے جو باقر آگاہ کے خاندان ہی کے ایک فرد تھے۔ بدرالدولہ شرف الدولہ[۲] (جن کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے) کے بیٹے تھے۔ ان کا نام صبغۃ اللہ تھا۔ "بدرالدولہ" خطاب تھا جو دربار ارکاٹ سے دیا گیا تھا۔ غلام غوث خاں والاجاہ کے زمانے میں وہ قاضی القضاۃ کی خدمت پر فائز تھے۔ ان کے بڑے بھائی عبدالوہاب نوابان ارکاٹ مدارالمہام تھے۔ قاضی بدرالدولہ ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا۔ قاضی صاحب کی تصانیف میں حسب ذیل کتابیں ملتی ہیں۔

۱- سیرت نبی کریم (۲) سیرت صدیق اکبر ۳- نثر الجواہر یا سیرت عبدالقادر جیلانی۔

مذکورہ بالا عنوانوں سے ظاہر ہے کہ قاضی صاحب نے سیرت نگاری کو اپنا خاص موضوع بنالیا تھا

نثر الجواہر قاضی صاحب کی غالباً سب سے زیادہ ضخیم تصنیف ہے جس کا مخطوطہ راقم الحروف کو شاہ ہاشم حسینی العلوی کی درگاہ کے سجادہ نشین جناب

---

[۱] ملاحظہ ہو وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ از نصیر الدین ہاشمی

[۲] ملاحظہ ہو مقالہ ہذا

مصطفےٰ احسینی کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔ اس کتاب کی تمہید میں لکھا ہے کہ یہ کتاب دراصل ان کے والد محمد غوث (شرف الدولہ) کی تصنیف " انہارا " کا ترجمہ ہے وجہ تصنیف مصنف کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"تصنیف زبدۃ العلما مولانا محمد غوث اس ترجمہ کا باعث یہ ہے کہ صاحبزادہ بلند اقبال عمدۃ الامرا بہادر جنگ زبان درخشاں سے اپنے ارشاد فرمائی کہ کتاب مذکور کو ہندی زبان میں ترجمہ کرو پھر میں نے بموجب اس فرمان کے اس کو ترجمہ کیا۔"

حضرت عبدالقادر جیلانی کے "محی الدین" لقب اختیار کرنے کے بارے میں محمود بن عثمان کی روایت کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

محمود بن عثمان معروف کہتے ہیں کہ کسی نے شیخ محی الدین عبدالقادر سے پوچھا کہ اور ہم سب اس وقت حاضر تھے کہ حضرت کا لقب محی الدین ہونے کا سبب کیا ہے۔ حضرت فرمائے میں مسافرت سے جمعہ کے روز ۵۱۱ھ پابرہنہ بغداد کو آیا اور ایک بیمار کو دیکھا کہ رنگ اس کا متغیر اور بدن لاغر وہ مجھے دیکھکر کہا السلام علیک یا عبدالقادر اس سلام کا جواب کہا پس اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا اپنے کو بٹھا پھر میں نے اس کو بٹھایا۔ دیکھتا ہوں کہ اس کا بدن موٹا ہوا اور صورت بہتر ہوئی اور رنگ صاف ہوا میں اس سے ڈر گیا اس نے کہا تو مجھے نہیں جانتا میں کہا نہیں پھر ان نے کہا میں دین ہوں پر مردہ ہوا تھا جیسا کہ میں کہا تو دیکھا اب خدائے تعالیٰ تیرے سبب مجھے زندہ کیا اور تو محی الدین ہے یعنی دین کو زندہ کرنے والا پھر میں نے اسے چھوڑ کر جامع مسجد کو آیا شخص مجھ سے ملاقات کر کے تعلیم میرے روبرو کہا اور کہا یا سید محی الدین جمعہ کا نماز ادا کیا لوگ میرے نزدیک ہجوم کیے اور میرے

ہاتھوں کو بوسہ دیے اور محی الدین کہنے لگے۔ اس کے پیش میرا یہ لقب نہ تھا۔

قصص

قصہ گوئی ابتدائی دور سے اردو کے انشا پردازوں کا بڑا چہیتا موضوع رہا ابتدا میں قصہ کو مذہبی صداقتوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا گیا۔ پھر تصوف کے باریک نکات بھی اسی پیرائے میں پیش کیے گئے اور نظم اور نثر دونوں ہی میں طرح لکھے گئے۔ محمد قلی کے دور سے ٹھیٹ ادبی قصے اور لبیط قصے لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اور سبھی زبانوں سے اس سلسلے میں استفادہ کیا گیا۔

یہ ذوق اردو میں ہر صدی میں ابھرتا رہا چنانچہ بارہویں صدی کے اواخر میں بھی کئی قصے لکھے گئے۔ لیکن اب مافوق الفطرت عناصر کی بجائے سنسکرت کے تریا چرتر کے قصوں کے ترجموں یا ان کے اتباع میں عورتوں کی چالاکی اور آوارگی کے قصوں کا بھی رواج ہوا۔

جیسا کہ ہر ملک کے ادب کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے۔ دورِ انشا میں شاعر اور ادیب ہمیشہ مذہب کی گود میں پناہ لیتے رہے۔ ٹھیٹ ادبی قصوں کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی قصے کے ساتھ جوڑا گیا۔ اور مذہبی تلقین سیدھے سادھے پیرایہ میں کرنے کی بجائے قصہ کہانی کا پیرایہ اختیار کیا جانے لگا۔ اس قسم کے افسانوں میں عاجز کا قصہ ملکہ مصر[1] اور فتح کا قصہ" زلیخائے ثانی[2] قابل ذکر ہیں۔ زلیخائے ثانی" قصہ جیسا کہ پروفیسر سروری نے لکھا ہے کہ۔

> مغفور شاہ کی لڑکی روشن بخت عہد کرتی ہے کہ جو شخص اس کے سوالوں کا جواب تشفی بخش طریقے سے دیگا وہ اس سے شادی کرے گی

---

[1] فہرست مخطوطات کتب خانہ جامعہ عثمانیہ ص ۱۷۶

بہت سے سرفروش اس مہم کو سر کرنے کے لیے آتے ہیں۔ بالآخر شہزادہ چین جس کا نام یوسف ثانی ہے اس کے صحیح جوابات دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ سوال جواب کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہتا ہے۔ سوالات کی نوعیت مذہبی ہے۔ شہزادی عقائد اور اسلامی مسائل کے متعلق سوالات پوچھتی ہے۔ اور شہزادہ ان کے جواب دیتا ہے۔ اس سے قصہ نگار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مذہبی مسائل پڑھنے والوں کے ذہن میں آسانی سے محفوظ رہ سکیں۔

ملکہ روم و فقیہہ

مذکورہ بالا دونوں قصص منظوم تھے۔ لیکن "ملکہ روم اور فقیہہ" کا قصہ نثر میں ہے۔ اس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ[1] ہے جس کا سنہ کتابت ۱۲۲۰ھ ہے اور یہ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل کا مصنفہ ہے۔ اس میں دراصل علم حکمت اور اخلاق کے مسائل کو قصے کے پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔ قصہ "ملکہ مصر" میں عاجز نے ملکہ مصر کے صحیح جوابات دینے کے لیے ہندوستان کے ایک عالم عبد اللہ نامی کو چنا تھا۔ "قصہ ملکہ روم" میں یہ ہیرو عبد العلیم نامی ایک فقیہہ ہے۔

اس قصہ میں روم کے بادشاہ کی بیٹی دکھائی گئی ہے جس کا نام ملکہ ہے اس نے یہ عہد کیا تھا جو شخص اس کے صحیح جواب دے گا اس کے ساتھ شادی کرے گی۔ اس کا جواب دینے بہت سے لوگ آتے ہیں لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے سکتا آخر ایک فقیہہ عبد العلیم نامی آتا ہے اور ملکہ کے تمام سوالوں کے صحیح جواب دیتا ہے بالآخر ملکہ اس سے شادی کر لیتی ہے۔

اس قصے میں کئی مسائل ہیں ملکہ فقیہہ سے وسیع موضوعات پر سوالات کرتی

---

[1] کتب خانہ آصفیہ فن قصص ۱۳

Hanif Razvi

ہے۔ یہ موضوع حکمت تاریخ فنون فلسفہ جغرافیہ کے مسائل ہیں اور فقیہہ سب کا جواب باصواب دیتا جاتا ہے۔ آخر فقیہہ اس کی ذہانت سے متاثر ہو کر پوچھتا ہے کہ ملکہ کو یہ حکمت کس نے سکھائی۔ وہ جواب دیتی ہے کہ اس کے باپ کے مرنے کے بعد ایک سیاہ پوش بزرگ آئے جنہوں نے چالیس دن تک ملکہ کو حکمت سکھائی اور اپنا نام خضر بتایا۔

پھر ملکہ سوال کرتی ہے کہ رویت کی اصل کیا ہے۔ کالی بکری گھوڑی کہاں سے آئے ہیں وہ چیز کیا ہے جو ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی رہتی ہے۔ وہ کون ہیں جو روزِ قیامت تک شب و روز چلتے ہیں اور ایک ساعت قرار نہیں رکھتے۔ فقیہہ ان سب کا جواب دیتا ہے پھر ملکہ کتب سماوی کے متعلق دریافت کرتی ہے۔

اس طرح سوال و جواب کے پیرائے میں جغرافیہ تاریخ علم دین وغیرہ کی باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ اس قصے کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

قصہ دلالہ مختالہ

عورت کی مکاری اور عیاری کے افسانوں میں اس زمانے کا ایک قصہ ایک دلالہ کا ہے جو اپنی شرارتوں کے باوجود قانون کی زد سے بچی رہتی ہے۔ اس کے مصنف کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس عورت کے دو بیٹیوں کو دیکھا بھی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کہانی سنسکرت کے مشہور قصوں کا چربہ ہے۔ جو تریا چرتر یا عورتوں کی مکاری پر لکھے جاتے تھے۔ اس اردو کہانی کا ماخذ ایک فارسی داستان تھی جسے اردو کا جامہ پہنایا گیا فارسی میں یہ قصہ سنسکرت ہی سے لیا گیا ہوگا۔ اس قصہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی قصوں کے موضوع کو "الف لیلےٰ" کی داستان کی طرح ہارون الرشید کے عہد کی افسانوی فضا میں پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ ذیل کے اقتباس سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

"نقل ہے کہ ہارون الرشید بادشاہ کے زمانے میں بغداد میں ایک

Hanif Razvi

سوداگر ابو جعفر نام رہتا تھا۔ ایک عورت خوبصورت کو شادی کیا چھ مہینے کے بعد ابو جعفر چاہا کہ سفر کو جاوے عورت کہی پیٹ ہے ہوں ابو جعفر کہا تم کو مبارک ہوئے القصہ ابو جعفر عورت سے رخصت ہو کر روانہ ہوا۔ چار برس بعد ابو جعفر سفر سے پھر کر آیا دیکھا اپنی عورت کو پیٹ رہ کر چار برس ہوئے ابھی جنی نہیں ......"

یہ صحیح ہے کہ اس طرح کے چند قصے "الف لیلیٰ" میں بھی ملتے ہیں لیکن "الف لیلیٰ" کے اکثر قصوں کے بارے میں بھی یہی قیاس ہے کہ وہ ہندوستان سے لے گئے ہیں اور عربوں میں ان کا رواج ہارون اور مامون کے زمانے میں ہوا جب کہ کئی ہندوستانی علما بغداد کے محکمہ تراجم میں مامور ہو کر ہندوستان سے آئے تھے اس قصہ کا ایک مخطوط مدراس کی میوسکرپٹ لائبریری میں موجود ہے۔ سنہ تصنیف درج نہیں کتابت سنہ ۱۲۲۰ھ کی ہے۔

اس عہد کے یہ چند آخری کارنامے تھے جن پر اس مقالے کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ سنہ ۱۲۱۴ھ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اور سب سے پہلی تصنیف جو میر امن نے "باغ و بہار" کے نام سے لکھی وہ کالج کے قیام کے ایک سال بعد ۱۲۱۵ء میں لکھی گئی۔ اس کتاب کی تصنیف سے اس میں شک نہیں کہ اردو نثر کے ارتقار میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے لیکن ابتدائی سالوں میں سادہ نگاری اور ایک حد تک حقیقت نگاری کی یہ تحریک کالج کی چار دیواری تک محدود رہی لیکن کالج سے باہر کی تصانیف میں عرصہ تک پرانی روایات کا اثر رہا جس کا ایک یادگار نمونہ "فسانہ عجائب" اور خاص طور پر اس کے دیباچہ کے وہ اشارے ہیں جس میں سرور نے میر امن کی زبان اور اسلوب پر تعریض کی ہے

"فسانہ عجائب" اور اس طرح کے دوسرے قصے اور سرور کی ساری تصانیف اس میں شک نہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد کی ہیں لیکن قصوں کی نوعیت

اور اسلوب کے اعتبار سے ان کارناموں کی سرحدیں فورٹ ولیم کالج کی نئی تحریک کے مقابلے میں اس سے پہلے کی نثری روایات سے ملی ہوئی ہیں۔ اور یہ سلسلہ کالج کے قیام کے کم و بیش پچاس برس بعد تک بھی جاری رہا۔ ان قدیم روایات کی تبدیلی میں سیاسی سماجی تعلیمی اور کئی طرح کے انقلابات کو دخل ہے ان ہی میں سے ایک فورٹ ولیم کالج کے تصنیفات کا بھی اثر تھا۔ تاہم مرتب مقالہ نے اپنے مقالے کی سرحدوں کو عبور کر کے ۱۲۱۶ھ م ۱۸۰۱ء کے بعد کے کارناموں کو اس میں شامل کرنا مناسب نہیں جانا۔ بلکہ ان نثری روایات کے تسلسل کی آخری منزلوں کی طرف محض اشارہ کرنے ہی پر اکتفا کیا ہے۔

Hanif Razvi

کتابیات

تاریخ ادب اردو

(۱) - اُردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	مطبوعہ
(۲) - پنجاب میں اردو	محمود شیرانی	"
(۳) - اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام -	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	"
(۴) - اُردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	"
(۵) - اردو کے اسالیب بیان	" " " "	"
(۶) - تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	"
(۷) - مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز حسین	"
(۸) - تاریخ ادب اردو	مرتبہ ادارہ ادبیات اردو	"
(۹) - منثورات (تاریخ نثر اردو)	احسن مارہروی	"
(۱۰) - سیر المصنفین	محمد یحییٰ تنہا	"
(۱۱) - داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری	"
(۱۲) - ارباب نثر اردو	سید محمد	"
(۱۳) - تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خان	"
(۱۴) - دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	"
(۱۵) - مدراس میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	"

Hanif Razvi

تواریخ

(۱۶) - تاریخ فرشتہ	ابوالقاسم فرشتہ	مطبوعہ
(۱۷) - تاریخ فیروز شاہی	سراج عفیف	"
(۱۸) - بساتین السلاطین	ابراہیم زبیری	"
(۱۹) - حدیقۃ السلاطین	ملا نظام الدین احمد	"
(۲۰) - منتخب التواریخ	عبدالقادر بدایونی	"
(۲۱) - تاریخ ہندوستان	الفنسٹن	"
(۲۲) - تاریخ ہند	ہنری ایلیٹ	"
(۲۳) - میڈیول انڈیا	لین پول	"
(۲۴) - تاریخ خورشید جاہی	غلام امام خاں ترین	"
(۲۵) - گلدستہ بیجاپور	میر احمد علی خاں	"
(۲۶) - تاریخ بہمنی	ہارون خاں شیروانی	"
(۲۷) - سلاطین قطب شاہیہ	عبدالمجید صدیقی	"

ملفوظات

(۲۸) - جواہر فریدی	شیخ فریدالدین گنج شکر	قلمی
(۲۹) - مقصود المراد	ہاشم حسینی العلوی	مطبوعہ
(۳۰) - جوامع الکلم	خواجہ بندہ نواز گیسو دراز	"
(۳۱) - محبت نامہ	یداللہ حسینی نبیرہ بندہ نواز	قلمی
(۳۲) - سیر الاولیا	نظام الدین اولیا	مطبوعہ
(۳۳) - لطائف اشرفی	سید اشرف جہانگیر (مطبوعہ اقتباس شرف الاخبار بہار)	"

(۳۴) - خیر المجالس	نصیر الدین چراغ دہلوی (اقتباس تاریخ زبان اردو)	مطبوعہ
(۳۵) - تذکرہ غوثیہ	غوث علی شاہ قلندر پانی پتی	"

تذکرہ صوفیا

(۳۶) - خزینۃ الاولیا	مفتی غلام سرور دہلوی	مطبوعہ
(۳۷) - برکات الاولیا ترجمہ روضۃ الاولیا		"
(۳۸) - روضۃ الاولیا بیجاپور	ابراہیم زبیری	"
(۳۹) - اخبار الاخیار	عبد الحق محدث دہلوی	"
(۴۰) - محبوب الزمن تذکرہ اولیائے دکن	عبد الجبار ملکاپوری	"
(۴۱) - سبحۃ المرجان	غلام علی آزاد بلگرامی	"
(۴۲) - تذکرہ علمائے ہند	مولوی رحمان علی	"
(۴۳) - مراۃ الاسرار	عبد الرحمن چشتی	قلمی
(۴۴) - روضۃ الاقطاب	رونق علی	"

تذکرے

(۴۵) - گلِ رعنا	عبد الحی رعنا	مطبوعہ
(۴۶) - شعر الہند	عبد السلام ندوی	"
(۴۷) - گلشن ہند	مرزا علی لطف	"
(۴۸) - لباب الالباب	نور الدین محمد عرفی	"
(۴۹) - آب حیات	محمد حسین آزاد	"
(۵۰) - خم خانہ جاوید (مکمل)	لالہ سری رام	"

Hanif Razvi

(۵۱)- چمنستان شعرا	لچھمی نارائن شفیق	مطبوعہ
(۵۲)- طبقات الشعرا	کریم الدین و ڈاکٹر فیلن	قلمی
(۵۳)- مجموعہ نغز	قدرت اللہ قاسم	مطبوعہ
(۵۴)- نکات الشعرا	میر تقی میر	"
(۵۵)- تذکرہ شعرائے ریختہ	میر حسن دہلوی	"

تاریخ ادب

(۵۶)- پرشین لنگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ	مولوی عبدالغنی	مطبوعہ
(۵۷)- انڈو ایرین اینڈ ہندی	ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی	"
(۵۸)- ہسٹری آف پرشین لٹریچر	لیوی	"
(۵۹)- شعر العجم	شبلی	"
(۶۰)- ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا اتی ہاس	رام چند شکل	"
(۶۱)- ہندی ساہتیہ کا اتی ہاس	برج رتن داس	"
(۶۲)- ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس	پنڈت ایودھیا سنگھ ہری اودھ	"
(۶۳)- ہندی بھاشا اور ساہتیہ	شیام سندر داس	"
(۶۴)- ہسٹری دی لٹریچر ہندوستانی	گارساں دی تاسی	"
(۶۵)- اردو مثنوی کا ارتقا	عبدالقادر سروری	"
(۶۶)- انڈیا ان یوروپین لٹریچر	ڈاکٹر آمنہ پوپ	"

سفرنامہ

(۶۷) سفرنامہ ابن حوقل	ابن حوقل (طبع لیڈن)	"
(۶۸) عجائب الاسفار	ابن بطوطہ	قلمی و مطبوعہ

سوانح

(۶۸) - نصرتی	ڈاکٹر عبدالحق	مطبوعہ
(۶۹) - سیرت بندہ نواز	مولوی عطا حسین	״
(۷۰) - سیرت بندہ نواز	حامد صدیقی	״
(۷۱) - سیرت بندہ نواز	حامد صدیقی	״
(۷۲) - سیر گلبرگہ	محمد سلطان	״
(۷۳) - سیرت محمدی	محمد علی سامانی	״
(۷۴) - تاریخ حسینی		قلمی
(۷۵) - احسن التقاسیم	طبع لیڈن	مطبوعہ
(۷۶) - سودا	شیخ چاند	״
(۷۷) - پرتھی راج راسو	ناگری پرچارنی سبھا	״
(۷۸) - پرتھی راج چوہان راسو		״
(۷۹) - مجالس رنگین	سعادت یار خاں رنگین } مولفہ مسعود حسن رضوی }	״
(۸۰) - ملکہ حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	״

تنقید

(۸۱) - جہان بیں	جعفر علی خان اثر
(۸۲) - دنیائے افسانہ	عبدالقادر سروری

Hanif Razvi

مضامین

(۸۳) نقوش سلیمانی — سید سلیمان ندوی — مطبوعہ

(۸۴) خطبات گارساں دی تاسی — اردو ترجمہ — ″

لسانیات

(۸۵) ہندوستانی لسانیات — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — مطبوعہ

(۸۶) ایلیمنٹ آف دی سائنس آف لنگویج — تاراپوروالا — ″

نظم

(۸۷)۔ پدماوت — ملک محمد جائسی — مطبوعہ

(۸۸)۔ مثنوی غرۃ الکمال — امیر خسرو — ″

(۸۹)۔ پھول بن — عبدالقادر سروری — ″

فہرست ہائے مخطوطات

(۹۰) فہرست مخطوطات اردو برٹش میوزیم۔ — بلوم ہارٹ — مطبوعہ

(۹۱)۔ فہرست مخطوطات انڈیا آفس — ″ — ″

(۹۲)۔ فہرست مخطوطات ″فارسی″ — ″ — ″

(۹۳) تذکرہ اردو مخطوطات ادارہ ادبیات اردو (جلد اول) — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — ″

(۹۴) تذکرہ اردو مخطوطات اردو ادبیات اردو (جلد دوم) — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — ″

Hanif Razvi

(۹۵) - فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ عبدالقادر سروری مطبوعہ

(۹۶) - فہرست کتبخانہ ٹیپو سلطان اسٹوارٹ ″

(۹۷) - ″ ″ شاہان اودھ اسپرنگر ″

(۹۸) - ڈیسکرپٹیو کیٹلاگ آف بمبئی یونیورسٹی عبدالقادر سرفراز ″

(۹۹) - فہرست مخطوطات مدراس یونیورسٹی چندر شیکھرن ″

قواعد اردو

(۱۰۰) - کیفیہ پنڈت کیفی مطبوعہ

(۱۰۱) - قواعد اردو ڈاکٹر عبدالحق ″

متفرق

(۱۰۲) - روح الذہب مسعودی ″

(۱۰۳) - قطب مثنوی مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق ″

(۱۰۴) - سب رس وجہی ″

(۱۰۵) - باغ و بہار میر امن ″

(۱۰۶) - نوطرز مرصع عطا حسین خاں تحسین ″

(۱۰۷) - اسٹڈیز ان تصوف خواجہ خاں

(۱۰۸) - اردو شاعری میں تصوف اعجاز حسین ″

(۱۰۹) - دریائے لطافت انشاء اللہ خاں انشار ″

(۱۱۰) - دی ہسٹری آف گجرات کمساریٹ ″

(۱۱۱) - اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف بنگالی لنگویج ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی ″

Hanif Razvi

(۱۱۲)	ارشاد نامہ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	مطبوعہ
(۱۱۳)	وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ	نصیر الدین ہاشمی	زیر طبع
(۱۱۴)	وضاحتی فہرست کتبخانہ آصفیہ		مطبوعہ
(۱۱۵)	غرایب اللغات	ڈاکٹر عبداللہ	رر
(۱۱۶)	یورپ میں دکھنی مخطوطات	نصیر الدین ہاشمی	رر

رسائل

(۱۱۷)۔ اردو

(۱۱۸)۔ ساقی

(۱۱۹)۔ ساتھی

(۱۲۰)۔ نوائے ادب

(۱۲۱)۔ اورنٹیل کالج میگزین

(۱۲۲)۔ سیاست

(۱۲۳)۔ سب رس دکانفرنس نمبر)

Hanif Razvi

Hanif Razvi

مطبوعہ

سیاست پریس - نظام شاہی روڈ - حیدرآباد
(اے، پی)